تختِ طاؤس

یعنی

دولتِ مغلیہ کے پانچویں تاجدار شاہجہاں کے شہرہ آفاق تخت "تختِ طاؤس" کے

تاریخی حالات



از

مولوی محمد عبداللطیف خان کشتہ۔ قادری۔ منشی فاضل (آنرز ان پرشین)

پی۔ ایل۔ ای مؤلف "حیات عزیز"

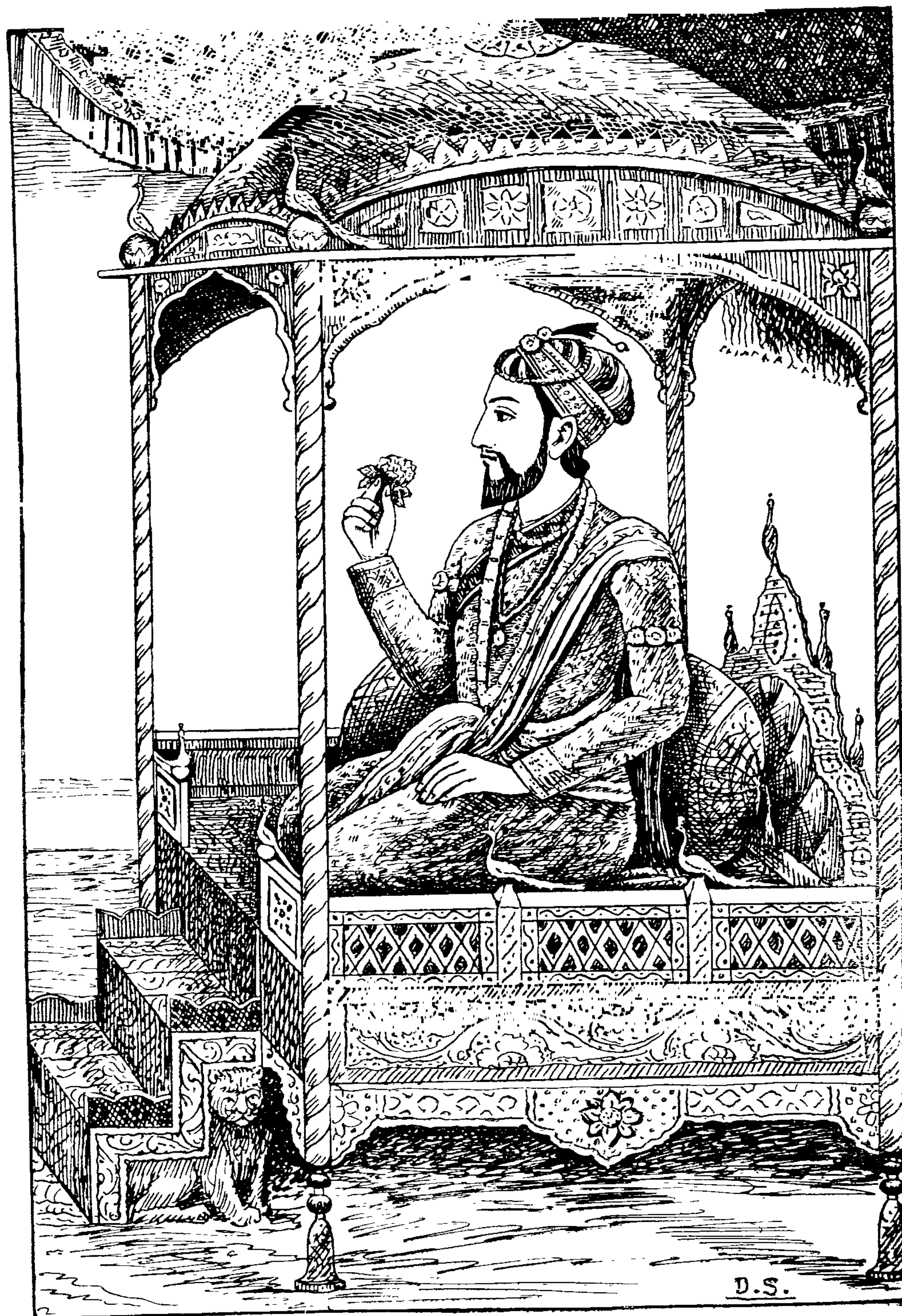
لاہور
رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز
ایجوکیشنل پبلشرز
سنہ ۱۹۳۲ء



تعداد ۱۰۰۰

دفعہ اوّل





شاهجهان بر تخت طاؤس



اِنتساب

بجنابِ اقدس و اعلیٰ :-

مُربّیِ علوم و فنون ، فخرِ مُلک و مِلّت ، آنریبل ، ڈاکٹر ، سر ، شاہ ، محمد سُلیمان

ایم - اے + ایل - ایل - ڈی + بار ایٹ لا + نائٹ

چیف جسٹس "الہ آباد ہائی کورٹ" - صدر "ہندوستانی اکیڈمی - یو - پی"

(سابق) وائس چانسلر "مُسلم یونیورسٹی علیگڑھ"

کیا عجب

کہ دُنیائے تاریخ و تحقیق میں یہ "ناچیز ذرّے" اِس "آفتابِ علم و ادب" کے پرتَو سے چمک اُٹھیں اور اُن کی "تاب و تابش" کو "بقائے دوام" حاصل ہو +

ارادت کیش

محمد عبد اللطیف خاں ، کُشتہ - قادری

۱۔ فہرست مضامین "تخت طاؤس"

۲۔ فہرست حواشی "تخت طاؤس"

الف۔ (مشاہیر رجال)

سلسلہ نمبر	اسماء	نمبر حاشیہ	نمبر صفحہ
۱	آصف خاں	۳	۵۱
۲	آقا محمد خاں قاچار	۱	۱۵۸
۳	ابوطالب کلیم	۶	۵۸
۴	اسفندیار اعتماد الدولہ	۲ ۱	۶۸ ۴ مقدمہ
۵	اودے سنگھ راٹھور	۲	۴۰
۶	اولغ بیگ	۲	۹۳
۷	ایشری پرشاد		
۸	بنارسی داس	۲	۵۴
۹	برنیر	۱	۸۷
۱۰	تیمور	۴	۴۱
۱۱	ٹیورنیر	۲	۹۰
۱۲	خان اعظم	۱-۳	۴۵
۱۳	خسرو	״	״
۱۴	داور بخش	۱	۵۴
۱۵	رستم	۱	۶۸
۱۶	سعد اللہ خاں		
۱۷	سعید احمد	۱	۸۳
۱۸	سرکار	۹	۱۱۰
۱۹	سر سید	۶	۱۰۸
۲۰	شاہ عباس صفوی	۳	۹۳
۲۱	شاہ پہلوی	۶	۱۱۴
۲۲	شبلی	۸	۱۰۹
۲۳	شہریار	۱	۴۸/
۲۴	شیر افگن خاں	۴	۵۱
۲۵	صاحب مآثر الامراء	۴	۷۷
۲۶	صاحب ظفرنامہ	۱	۷۳
۲۷	علامہ افضل خاں	۵	۹۴
۲۸	فرعون	۸	۶۶

د - اشیاء

ہ - ادبی و تاریخی الفاظ

سلسلہ نمبر	اسماء	نمبر تقویم	نمبر صفحہ	سلسلہ نمبر	اسماء	نمبر تقویم	نمبر صفحہ
۲۹	قدسی	۴	۱۲۲	۳۵	مان سنگھ	۳-۱	۴۵
۳۰	لارڈ کرزن	۱	۸۴	۳۶	مہابت خاں	۴	۵۴
۳۱	محمد اعظم عالیجاہ	۴	۷۵	۳۷	منوچی	۱	۱۲۵
۳۲	محمد حسین آزاد	۶	〃	۳۸	ولیم ارون	۱	۱۱۶
۳۳	ملا عبدالحمید لاہوری	۳	۷۵	۳۹	ہندال مرزا	۲	۴۴
۳۴	مرزا شاہرخ	۱	۹۲	۴۰	نادر	۱	۱۵۲

(ب) خواتین مشاہیر

سلسلہ نمبر	اسماء	نمبر تقویم	نمبر صفحہ	سلسلہ نمبر	اسماء	نمبر تقویم	نمبر صفحہ
۱	جہاں آرا بیگم	۴	۱۲۶	۴	مان متی جودھ بائی	۱	۳۹
۲	جہاں زیب بانو بیگم	۵	۱۴۳	۵	ممتاز محل	۲	۳۲
۳	خدیجۃ الزمانی سلطان رقیہ بیگم	۱	۴۳	۶	نورجہاں	۲	۴۹

ج۔ عمارات، باغات اور مقامات

سلسلہ نمبر	اسماء	نمبر تقویم	نمبر صفحہ	سلسلہ نمبر	اسماء	نمبر تقویم	نمبر صفحہ
۱	آگرہ	۱	۵۷		تاج محل	۱	۲۸
۲	ایوانِ چہل ستون	۱۳	۱۳۸		جامع مسجد (دہلی)	۴	۳۵

تبصرہ و تعارف

"مصنوعات" خواہ وہ کسی قسم کے ہوں صناعوں کی ذہنیت کے آئینے ہیں۔ جن میں ان کی پاکیزگی و لطافت طبع، شستگی دماغ و مذاق عالی ہمتی غرض تمام جذبات، تخیلات اور تاثرات کی جھلک نظر آتی ہے۔ گویا جس طرح ایک ماہر علم قیافہ کسی تصویر کو دیکھ کر اس کے خد و خال سے صاحب تصویر کی خارجی، باطنی و ذہنی کیفیات پر حکم لگا سکتا ہے۔ قطعی اسی طرح ایک ماہر فن آثار قدیمہ ہر قسم کی مصنوعات پر غور و فکر کر کے صانعین کے تمدن اور عہد صنعت کی تہذیب کو منکشف کر سکتا ہے۔ بناءً علیہ تذکرۂ مصنوعات، تدوین تاریخ تمدن کا حکم رکھتا ہے۔

ہندوستان میں سلاطین تیموریہ کا عہد مسلم فرماں روایان ہند میں زریں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ دراصل یہ حکومت ایک چوٹی کی حکومت تھی۔ جس نے ہر شعبۂ حیات اور مذاق وقت کے مطابق سامان زیبائش خصوصاً تعمیرات، پچی کاری، پرچیں سازی، مصوری، جواہر تراشی، زرگری و نقاشی پر مکمل داد سعی و توجہ دی اور تاج (آگرہ)، قلعہ آگرہ، اردوے معلی (دہلی)، محلات فتح پور سیکری، سکندرہ، و اعتماد الدولہ (آگرہ)، تخت طاؤس اور کوہ نور وغیرہ کے سلسلہ میں تو گویا مستقل صنعتی یونیورسٹیاں قائم کیں، جن میں سے نیت کی برکت کہئے یا نفاست طبعی و عالی دماغی کا صدقہ کہ عہد شاہجہاں کی نوادر ثلثہ تاج محل، تخت طاؤس اور کوہ نور نے وہ شہرت حاصل کی کہ ان کے تذکرہ سے دنیا کا گوشہ گوشہ گونج رہا ہے۔

و۔ رسوم

سلسلہ نمبر	اسماء	نمبر حاشیہ	نمبر صفحہ	سلسلہ نمبر	اسماء	نمبر حاشیہ	نمبر صفحہ
١	آئین دربار			٣	جشن نوروزی	٣	١٢٥
٢	جشن شمسی			۴	جشن وزن قمری		

ز۔ تصاویر

نمبر شمار	تصویر	تشریح
١	مؤلف تاریخ تخت طاؤس	برسٹ محمد عبداللطیف خان "گشتہ" قادری۔ منشی فاضل (آنرز ان پرشین، پی ایل ای (ایڈوانسڈ اردو) (شروع میں)
٢	تخت طاؤس	شاہجہاں بر تخت طاؤس (بعد تصویر مؤلف)
٣	تخت طاؤسی	(ساختہ فتح علی شاہ قاچار۔ فرمانروائے ایران) کا گلستان محل (طہران) میں ایک منظر (صفحات ١٦٠-١٦١ کے مابین)

موصوف نے ملک و قوم پر ایک زبردست احسان کیا ہے اور انکی یہ کد و کاوش قابل شکر گزاری ہے +

تعارفِ مرتّب

نام ونسب محمد عبد اللطیف خان نام ۔ کشتہ تخلص ۔ قادری لقب ۔ منشی یعقوب علیخان مرحوم و مغفور کے بیٹے ہیں ۔ آپ کے مورث اعلےٰ رحمت خان مرحوم جو یوسف زئی پٹھان تھے ۔ شاہ عالم فرمانروائے دہلی کے عہدِ حکومت میں ہرات سے ہندوستان پہنچے اور اپنی نیزہ بازی کے کمال کے باعث "برچھیت بہادر" کے خطاب سے مخاطب ہو کر فوج خاصہ میں کسی معزز عہدے پر سرفراز ہو گئے ۔ ذات منصب کی جاگیر بہوگاؤں ضلع مین پوری میں پائی ۔ لہذا وہیں طرح اقامت ڈال دی جسمیں آبا و اجداد صاحب باطن اور ارباب علم و فضل سے تھے ۔ جس کے باعث امرا و اعیان دولت مغلیہ و راجگان مین پوری کی استادی و اتالیقی کے منصب پر ممتاز رہے ۔ اور ان کی قدر دانیوں نے انہیں امارت کے رتبے تک پہنچایا +

ولادت مولانا کشتہ ۱۳ ۔ دسمبر ۱۸۹۹ء کو اپنے وطن آبائی میں پیدا ہوئے ۔ اور چونکہ ان کے نانا مولوی عبد الرحمٰن صاحب مرحوم کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی ۔ اس لئے انہوں نے ان کی والدہ سے ان کو گود لے کر ۶ ماہ کی عمر سے اپنے پاس ریاست بھوپال میں رکھا اور وہ اس وقت سے تاحیات اپنے نانا مرحوم کے پاس بھوپال میں اور ۱۹۱۱ء سے ان کے انتقال کے بعد اپنے والد ماجد کے پاس آگرہ میں جسے مرحوم نے اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا مقیم رہے +

تعلیم و تربیت مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا صاحب سے پائی جو ایک اعلیٰ ریاضی دان، فارسی کے ادیب اور فن تاریخ کے ماہرین میں سے تھے

ان میں سے مجسمۂ الفت "تاج" کے متعلق مختلف زبانوں میں چند در چند کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کوہ نور کے بھی جستہ جستہ حالات میسّر آ جاتے ہیں۔ لیکن شان و شکوہ کے اسٹیچو "تخت طاؤس" کا کوئی مستقل تذکرہ علی الخصوص اردو زبان میں کبھی نظر سے نہیں گزرا۔ اور ہے بھی یہ کہ زمانۂ قدیم کے طرز تاریخ نگاری پر نظر ڈالتے ہوئے یہ سہل کام بھی نہیں۔ کیونکہ پراگندگی و انتشار مضمون تواریخ قدیم کا وصف نمایاں ہے۔ مگر اردو نے اپنی خوش قسمتی سے گذشتہ دس پندرہ سال کے اندر اس قدر ترقی کی ہے کہ آئے دن اس کا دامن وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور کوئی علم و فن ایسا نہیں جس پر تھوڑی بہت کتابیں اس میں نہ لکھی گئی ہوں۔ منجملہ اور شعبہ جات علوم و فنون کے تاریخ اور اس کے انواع پر خاص توجہ مبذول کی گئی ہے۔ اور گو تھوڑی سی ہی ہوں۔ لیکن فلسفیانہ طور و طریق پر لکھی ہوئی تاریخوں کی اس زبان میں کمی نہیں اور اس زبان کے دوربین، سلیم المذاق، ضرورت شناس اور ترقی کا درد رکھنے والے اہل قلم برابر اس کو ترقی دینے کی ان تھک کوششوں میں مصروف ہیں +

میں اس وقت مولانا کشتہ قادری کی ہفت سالہ تحقیقی و تفتیشی مساعی کے نتیجہ "تاریخ تخت طاؤس" کو جو اپنے مفید ترین حواشی پائیں صفحہ کی وجہ سے ایک مستقل "قاموس التاریخ" کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے، پیش کرتا ہوں۔ تخت طاؤس عہد مغلیہ کی زرگری، جواہر تراشی، ترصیع و خوش مذاقی کا ایک مرقع تھا۔ اور اس کی صنعت صنعتِ ایران و ہندوستان کا ایک دلاویز سنگم تھی۔ جس کی زیارت کے لئے دور دور کے ملکوں سے لوگ صعوبات سفر ہنسی خوشی برداشت کر کے آتے اور تازگی نظر و تفریحِ قلب و نخیر کا پرشاد لے کر جاتے تھے۔ اور یہ تبرک مدت دراز تک ان کو تر زبان خوش بیان رکھتا تھا۔ کتاب ہٰذا اسی بے مثل تخت کے وقائع تاریخی پر مشتمل ہے۔ حقیقتاً اس تخت کے پردے میں ایشیائی دماغی لطافتوں کے سینکڑوں مرقعے چھپے ہوئے تھے۔ جن کو منظر عام پر لا کر مولانا نے

۴؎ سید محمد نقی نام عذب البیان اور قصائد خاقانی کے شارح۔ جدید فارسی کا بہترین مذاق رکھنے والے، حضرت شاداں بلگرامی کے شاگرد رشید اور مدرسہ عالیہ رامپور کے اعلیٰ مدرس فارسی ہیں۔ ۱۲ +

۵؎ یہ صاحب دربار بھوپال کے خوش نویس حضرات میں نمایاں اور ہندوستان کے مشاہیر خطاطوں سے ہیں ۱۹۲۳ء تک حیات تھے۔ ۱۲ +

۶؎ آپ آگرہ کے ممتاز خوشنویسوں میں سے تھے عرصہ ہوا انتقال کر گئے۔ ۱۲ +

۷؎ اب آپ مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ میں مدرس ہیں آپ نے عرب حجاز و مصر میں رہ کر فن تجوید کی تحصیل کی ہے ۱۲ +

مذاقِ تصوّف مولانا کشتہ کے والد ماجد باوجود ملازم پولیس ہونے کے ایک فقیر منش بزرگ تھے۔ اور چونکہ عموماً مفصلات میں تعینات رہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مولانا اہالیان پولیس کی صحبت سے الگ تھلگ رہیں اسلئے انہوں نے ان کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ مولانا مولوی ضیاالاسلام امام جامع آگرہ کے سپرد کر دیا تھا۔ لہذا انہوں نے سولہ سترہ برس کی عمر تک کا تمام زمانہ امام صاحب موصوف کی صحبت میں بسر کیا۔ امام صاحب موصوف ایک شیخ وقت ہیں لہذا ان کی صحبت نے مولانا پہ ایک خاص اثر ڈالا ادھر انہوں نے شاہ بہاؤالدین رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت کی اور گو وہ صوفی یا عارف نہ ہو سکے تاہم تصوف کے رموز و نکات سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے ہیں۔ غالباً ۱۹۱۵ء میں انہوں نے رسالہ "شعلہ" دہلی میں ایک مضمون بہ عنوان "دل" لکھ کر شائع کیا تھا۔ جو اہل دل کی نظر میں سرمہ بصیرت و دوائے درد دل ثابت ہوا +

مذاقِ موسیقی وہ فن موسیقی سے ایک خاص لگاؤ اور مناسبت تام رکھتے ہیں گانا سننے کا انہیں بہت شوق ہے۔ علمی طور پر اس فن کے نکات پر حاوی ہیں چنانچہ ایک مضمون کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ "مارواڑی گیت" برج، کا لنگڑہ سوہنی اور مانڈ کی راگنیوں کے لئے علی الخصوص بہت موزوں ہوتے ہیں +

(رسالہ "غالب" آگرہ۔ بابت ستمبر ۱۹۲۰ء)

اس کے بعد مدرسہ سلیمانیہ (بھوپال) مدرسہ عالیہ (آگرہ) اور دار العلوم (دیوبند) میں صرف و نحو عربی تمام کی اور حدیث، اصول حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، منطق و ادب عربیہ کی متوسطات تک تحصیل کی۔ آپ نے دیوان گوری شنکر[1] مولوی محمد رمضان صاحب (مفتی جامع آگرہ) مولانا الحاج مولوی ضیا اللہ سلام صاحب (امام جامع آگرہ) مولوی سعادت[2] اللہ صاحب سنبھلی حضرت شاداں[3] بلگرامی شاد ماں لکھنوی جیسے مشہور ادیبوں سے تعلیم پائی۔ خوش نویسی کی مشق منشی لیلا دہر[4] صاحب منشی علی احمد[5] صاحب منشی شفیع اللہ صاحب جیسے حضرات سے کی۔ قرأت و تجوید کو قاری عبد[6] المالک سے سیکھا مگر ابتدائی جو کچھ پڑھا انتہائی بدشوقی کے ساتھ۔ البتہ ۱۹۱۶ء میں اپنے دلی شوق سے اورنٹیل کالج رامپور میں داخل ہو کر فارسی پڑھی۔ اور مارچ ۱۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل (آنرز ان پرشین) کی ڈگری حاصل کر کے ۱۷ء ہی میں وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ کے ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے۔ ۱۸ء سے ۲۲ء تک شعیب محمدیہ ہائی اسکول آگرہ کے ہیڈ مولوی رہے۔ ۲۲ء سے محکمہ تعلیمات یوپی کی ملازمت میں داخل ہو کر آگرہ، باندہ اور جھانسی میں معلم السنہ شرقیہ کے عہدے پر سرفراز رہے۔ یہیں جناب ناصری مرحوم (صاحب صنادید عجم) کے مشورے کے مطابق ۲۹ء میں آپ نے الہ آباد سے ایڈوانسڈ اِن اُردو کا امتحان درجہ اعلیٰ میں پاس کیا انگریزی سے بھی حسب ضرورت واقفیت رکھتے ہیں۔ ۲۶ء سے مین پوری گورنمنٹ ہائی اسکول میں تعینات ہیں +

[1] آپ ریاست بھوپال کے اعلیٰ فارسی دان کا لشتھ حضرات میں سے تھے۔ اور فارسی میں اس قدر ید طولیٰ رکھتے تھے کہ ابوالفضل بیدل اور ظہوری کے رنگ میں قلم برداشتہ نثر لکھدینا آپ کے لئے ایک معمولی بات تھی۔ ۱۲ +

[2] اب آپ پٹنہ یونیورسٹی میں پروفیسر دینیات ہیں۔ ۱۲ +

[3] سید اولاد حسین آپ کا اسم گرامی ہے۔ دور حاضرہ کے مشہور فارسی ادیب و صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ اب اورنٹیل کالج لاہور کے فارسی پروفیسر ہیں۔ ۱۲ +

آداب مجلس سے واقفیت

چونکہ ان کے والد مرحوم نے ہمیشہ انہیں علمی مجلسوں اور علم دوست حضرات کی صحبت میں رکھا۔ ادھر بھوپال میں بڑے بڑے ماہرین علوم مجلس کی صحبت میں رہے۔ اور خاص طور پر مولوی عبدالحمید صاحب سابق ہیڈ مولوی وکٹوریہ ہائی اسکول آگرہ حال پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی ابن مولوی عبدالغنی مرحوم (مصنف حوار لعرب) کے پاس محض آداب مجلس سیکھنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ لہذا علمی مذاق رکھنے والوں کی ہمنشینی ان کی سرشت میں داخل ہوگئی۔ وہ اعلی مزاج دان مشرقی و مغربی مجالس کے آئین و آداب اور چیزوں کے باقاعدہ رکھنے اور سجانے وغیرہ وغیرہ سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی گفتگو بہت پر لطف، دلچسپ ظریفانہ اور معلومات میں اضافہ کرنے والی ہوتی ہے ؎

شاعری

ان کی فطرت شاعرانہ ہے اور وہ سراپا شعر ہیں۔ گداز قلبی نے ان کو مکمل شاعر بنانے میں کمی نہیں کی ہے۔ دیوبند میں جب پڑھتے تھے۔ دیوانخانہ میں وحشی و مسیحا ملا ندہ امیر و داغ کے رقیبانہ مقابلوں نے ان کے دل میں بھی شوق شعرگوئی پیدا کیا غزلیں کہیں اور دو ایک پر جناب فریاد کاکوروی سے اصلاح لی۔ پھر جھانسی میں چند غزلوں پر جناب آفتاب اکبرآبادی سے مشورہ لیا اور چند غزلیں جناب شاکر اکبرآبادی کو دکھائیں مگر اس خود فراموش جذبہ کو انہوں نے اپنا شعار نہیں بنایا۔ وہ مشاعروں سے بہت گھبراتے ہیں۔ شعر و شاعری کے متعلق ان کے عقائد پر ان کے نوشتہ "تعارف و تبصرہ" بر "تلامذۃ الشعراء" سے بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ وہ مشاعروں کو غیر ضروری اور باعث نفاق سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے [illegible] میں زیادہ دلچسپی نہیں لی ورنہ اس طرف متوجہ ہیں (اور اچھا ہی ہوا ان کی طبیعت نے اب جو رخ اختیار کیا ہے وہ خوب ہے) تاہم انہوں نے جو کچھ کہا وہ دو قسموں پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصہ جو قطعی صنعت ہے اور جس کے متعلق خود ان کا بیان ہے۔ کہ "اس کے کچھ خاص مقاصد و اغراض تھے" دوسرا وہ ادارات جو حقیقتاً

شوقِ مطالعہ

چونکہ ان کے نانا مرحوم جنکی تربیت میں ان کا ابتدائی زمانہ گزرا مطالعہ کے ایک بہت بڑے شائق بزرگ تھے۔ اس لئے وہ بھی ہمیشہ سے عادی مطالعہ ہیں۔ ان کا وقت بہت کم ضائع جاتا ہے۔ اور بیماری کی حالت میں بھی مطالعہ سے باز نہیں رہتے۔ مطالعہ کے باعث ان کی نظر بہت وسیع ہے۔ اور وہ مختلف علوم و فنون میں دست گاہ کامل رکھتے ہیں۔ جھانسی گورنمنٹ کالج کے ایک معائنہ کے وقت ان کے لیکچر سے متاثر ہوکر ناصری مرحوم ہیڈ ماسٹر (علیگڈھ) کی نظر دوربین نے اس امر کو خوب تاڑا اور رپورٹ معائنہ میں لکھا تھا:۔

"مدرس ایک بہت ہی قابل آدمی ہے۔ اور بہت ہی تازہ اور وسیع معلومات رکھتا ہے۔ اس کا لیکچر بتلاتا ہے کہ اس نے علوم ادبیہ کو بہت ہی اچھے طور پر مطالعہ کیا ہے" (ماخوذ از رپورٹ معائنہ ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ بورڈ گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی بابتہ سال ۲۸-۱۹۲۷ء مرتبہ مسٹر آر ایس ویر ایم اے آئی۔ ای۔ ایس اور سید مہدی حسین ناصری ایم۔ اے پی۔ ای۔ ایس)

فنِ تاریخ سے دلچسپی

چونکہ ان کے نانا صاحب فارسی کے اعلیٰ ادیب تھے اس لئے مسٹر ولیم اروِن (صاحب لیٹر مغل) جنکی ماتحتی میں وہ محکمہ بندوبست میں تعینات تھے۔ ان سے بسا اوقات علمی و تاریخی امداد لیتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ فن تاریخ کے بڑے ماہر ہوگئے تھے۔ اور ان کی تربیت نے مولانا کشتہ پر بھی تاریخ بینی کا جذبہ طاری کردیا تھا۔ ادھر بچپن میں مولانا شرر کے تاریخی ناول ان کے بہت زیادہ زیر مطالعہ رہے۔ جنہوں نے اس جذبہ کو اور ابھارا۔ اب وہ ہمیشہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تاریخیں پڑھا کرتے ہیں۔ ان کی تاریخی معلومات کسی فاضل تاریخ سے کم نہیں۔ ان میں ایک خاص کیفیت ہے کہ وہ جب کوئی نئی معلومات بہم پہنچاتے ہیں تو اس کے ما فیہ و ما علیہ کی تحقیق میں بہت وقت صرف کردیتے ہیں کتاب پیش نظر انکے اس مذاق کا آئینہ ہے۔

اور تنقید کا دریا ان کے دل و دماغ میں لہرانے لگا۔ انہوں نے بعض خاص تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ جو بید مقبول ہوئے۔ ان میں سے ایک مضمون ہے "اصلاحات داغ" جو میری فرمائش پر رسالہ "مشاعرہ" فرخ آباد کے لئے لکھا تھا۔ اس مضمون میں منشی دیبی پرشاد "مائل" مین پوری کے کلام پر جو نواب فصیح الملک داغ دہلوی مرحوم نے اصلاحات دی ہیں ان کو معہ کلام "مائل" اور اپنی آراء کے شائع کیا ہے۔ درحقیقت ایک مشکل کام ہے مصلح کی اصلاحات کی وجوہ کی تہ تک پہنچنا۔ مگر مولانا نے اس طرح انجام دیا گویا اصلاحات کے وقت حضرت داغ مرحوم کے پاس بیٹھے ہوئے وجوہات دریافت کرتے جاتے تھے۔ اس مضمون کی ہمیشہ علمی طبقوں میں میں نے بہت تعریف ہوتے ہوئے سنی۔ "ہمدم" لکھنو نے رسالہ مذکور پر تبصرہ کرتے ہوئے اس مضمون کی بہت تعریف توصیف کی تھی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) شعر مائل:۔ طبیبو! مان لو کہنا میں اچھا ہو نہیں سکتا
مریض (ہجر) ہوں میرا مداوا ہو نہیں سکتا

اصلاحات داغ:۔ طبیبو! مان لو کہنا میں اچھا ہو نہیں سکتا
مریض عشق ہوں میرا مداوا ہو نہیں سکتا

مولانا کشتہ کا ریمارک:۔ ہجر سے عالم عشق کی صرف ایک کیفیت نمایاں ہوتی تھی اور شعر میں خصوصیت پیدا ہو گئی تھی۔ اصلاح نے مکمل دنیائے عشق و محبت کو بھر دیا اور شعر بلند و وسیع ہو گیا +

(۲) شعر مائل:۔ جنازے پر ہمارے (روتے چلاتے) وہ جب آیا
کہا اہل عزا نے "یا الٰہی! کیا غضب آیا"

اصلاحات داغ:۔ جنازے پر ہمارے (روتا چلاتا) وہ جب آیا
کہا اہل عزا نے "یا الٰہی! کیا غضب آیا

مولانا کشتہ کا ریمارک:۔ وحدت، جمعیت، تذکیر و تانیث میں از روئے قواعد

شعریت پر مشتمل ہے۔ ان کا کلام جہاں جہاں مجھے ہاتھ آیا اس کو میں نے تلاش کر کے "جذباتِ لطیف" کے عنوان سے بطور ضمیمہ شامل تعارف ہذا کر دیا ہے۔ تاکہ وہ ان جیسے بے نیاز شاعری کے پاس رہ کر ضیاع وتباہی سے محفوظ ہو جائے اور ان کی زندگی کا یہ پہلو تاریک نہ رہے

۱؎ مولوی مصطفٰے حسین صاحب نام فریاد تخلص۔ لکھنو یونیورسٹی کے عربی پروفیسر ہیں ۱۲+

۲؎ سید ولایت حسین نام "فانوس" جھانسی کے ایڈیٹر۔ ایک بہت ہی پاکیزہ مذاق کے شاعر ہیں ۱۲ +

۳؎ بابو پربھو دیال نام رئیس آگرہ "پروین" نامی رسالہ آگرہ سے آپ ہی کی زیر سرپرستی نکلا تھا۔ عہد حاضرہ کے مشاہیر شعراء میں سے ہیں +

۴؎ مشاعرہ میں پوری بابتہ ۳۰-۱۹۲۹ء کی غزلیات بمشورہ مولانا کشتہ مع حالات شعراء اس نام سے شائع کی گئیں تھیں۔ اس کتاب کو برادر معظم حضرت نصیر علوی منصف مین پوری (حال متعینہ باندہ) نے مرتب کیا تھا۔ مولانا کشتہ کی یہ جدت ادبی حلقہ میں بہت ہی پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی +

سخن فہمی وہ ایک اعلیٰ سخن فہم ہیں۔ ایک زود فہم ہستی واقع ہوئے ہیں۔ ایک پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ کی گتھی کو بہت آسانی کے ساتھ سلجھا دیتے ہیں۔ شعر کے مافیہ ماعلیہ پر بہت جلد پہنچ جاتے ہیں۔ اور اس مولویانہ طرز سے کہ ہر شئے میں تصوف نظر آتا ہے بہت گھبراتے ہیں +

مہارتِ تنقید ۱۹۲۷ء میں پرنسپل کالج نے جھانسی گورنمنٹ کالج کے انٹرمیڈیٹ کلاس میں اردو ہندی کے افتتاح کی سفارش کرتے ہوئے باوجودیکہ ان درجات کو اردو پڑھانے کے لئے ایم اے ان اردو کی قید ہے۔ محض مولانا کی قابلیت کے اعتماد پر خاص طور پر ان کی سفارش کی اور محکمہ نے بورڈ کی منظوری سے اجازت بھی دیدی۔ اور انہوں نے اس محنت سے اردو پڑھانا شروع کی۔ کہ ان کا کام لائق ستائش ٹھہرا۔ اسی زمانہ میں ان کا ایک خاص ادبی جذبہ سوتے سے چونکا۔ اور وہ جذبۂ تنقید تھا۔ چونکہ اس درجہ میں تنقید ضروری شئے تھی۔ مولانا نے اُدھر توجہ کی گویا ایک سونا تھا جو کھل گیا

یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ محض برکت مطالعہ ہے۔ اور اس شخص کو علم کیمیا سے قطعی مس نہیں۔ یا اگر ارتقائے نباتات" ملاحظہ کیجیے آپ کو گمان ہی نہیں ہو سکتا کہ مولانا علم النباتات کے ماہر کامل نہیں +

[2] یہ دونوں مضامین رسالہ ایجوکیشنل گزٹ لکھنؤ کے جنوری فروری نمبر ۱۹۲۵ء اور جنوری نمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئے = ۱۲ +

قومی خدمات انہوں نے بہت سی قومی خدمات انجام دیں۔ جن میں انجمن معین الطلبہ آگرہ کی سکرٹری شپ بہت نمایاں ہے +

اردو کی خدمتگذاری انہوں نے علاوہ مضمون نگاری، تصنیف و تالیف کے بہت سے علمی مجالس و لائبریریاں اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ میں قائم کیں۔ بڑے ہو کر اور صاحب اثر بن کر بعض رسائل نکلوائے اور ان کی مدد کی۔ جھانسی کا رسالہ "فانوس" ان ہی کی دماغ سوزی کا نتیجہ تھا۔ جس کی ایڈیٹر شپ بھی انہیں پیش کی گئی تھی۔ لیکن محکمہ کی عدم منظوری کے باعث وہ اس کو انجام نہ دے سکے +

ایک خاص خدمت زبان انہوں نے اردو زبان کی ایک خدمت خاص انجام دی۔ یعنی برادران وطن میں سے بہت سوں کو اردو میں اظہار خیال کرنے اخبارات و رسائل میں مضمون لکھنے کا چسکا لگا دیا۔ اور ان کا دل بڑھانے کے لئے اس سلسلہ میں اپنا بہت سا قیمتی وقت ان مضامین کی حک و اصلاح میں صرف کیا۔ جن حضرات پر انہوں نے اس معاملہ میں توجہ خاص مبذول کی ان میں آنجہانی منشی خوشی لال "مسرور" ورما فرخ آبادی[1] اور منشی لالہ سہائے بی۔ اے بہت نمایاں ہیں[2]

[1] منشی خوشی لال نام مسرور تخلص، ورما کائستھ، قدیم باشندہ فرخ آباد۔ جھانسی کی عدالت کلکٹری میں ملازم تھے۔ کئی زبانیں، فارسی، ہندی، سنسکرت، بنگالی اور انگریزی بہت اچھی جانتے تھے۔ ہندو "نعت گو" حضرات میں بہت ہی نمایاں تھے۔ پنشن لینے کے بعد اردو ادب کی خدمات میں وقت گزارا۔ اکثر رسائل و اخبارات آپ کے فیض قلم سے مستفیض

و محاورہ حال و ذوالحال میں باستثنائے چند صورتوں کے مطابقت لازم ہے۔ مائل صاحب کے شعر میں "وہ روتے چلاتے آیا" قواعد و محاورے کی ایک فحش غلطی تھی۔ اصلاح نے عیوب قواعد و محاورہ سے شعر کو پاک و پاکیزہ کر دیا" +

(۳) شعر مائل :- نہیں معلوم ہم کو کیا مرض ہے جو کہ اے مائل
معالج کوئی دنیا میں ہمارا ہو نہیں سکتا

اصلاحات داغ :- دوا کیسی ؟ شفا کیسی یہ دردِ عشق ہے مائل
معالج کوئی دنیا میں ہمارا ہو نہیں سکتا

مولانا کشتہ کا ریمارک :- "کیا مرض ہے" سے شعر میں ابہام پیدا ہو گیا تھا۔ اور "جو کہ اے مائل" ایک بھدا ٹکڑا تھا۔ حضرت فصیح الملک مرحوم نے مرض کی تشریح "یہ دردِ عشق ہے" کر کے "دوا کیسی" اور "شفا کیسی" دو ٹکڑے اپنی جانب سے پیوند کرتے ہوئے شعر کو نہ صرف وسیع، پر زور اور واضح ہی کر دیا۔ بلکہ مصرعہ ثانی کو چار چاند لگا دئے +

بہر حال وہ ایک زبردست ناقد ہیں۔ ان کی نظر ہر پہلو پر پڑتی ہے۔ اس سلسلہ میں ایمان و دیانت کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ جس طرح دوسروں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اسیطرح اپنے عیوب بھی بے تکلف بیان کر ڈالتے ہیں +

ہمہ گیری ان کی طبیعت ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ اور مطالعہ کے زور نے ہمہ گیری میں ایک شورِ خاص پیدا کر دیا ہے۔ جس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جب وہ مضمون لکھنے پر آتے ہیں تو کوئی پہلو چھوڑتے نہیں۔ ان کے بعض مضامین ان کی اس خصوصیت مخصوص کا آئینہ ہیں۔ مثلاً الماس کے ذیل میں انہوں نے ہیرے کی کیمیاوی ماہیت پر ایک مخصوص تبصرہ کیا ہے۔ کوئی آدمی ان کا مضمون دیکھکر

بیشمار ادبی، تاریخی و تنقیدی مضامین لکھے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل اپنی خوبی میں بے مثل اور خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں

(۱) الماس :۔ (رسالہ "ایجوکیشنل گزٹ" لکھنؤ بابت جنوری فروری ۱۹۲۵ء) اس مضمون میں ہیرے کی ماہیت، مشہور ہیروں خصوصاً "کوہ نور" کی تاریخی حالات ہیں +

(۲) ہما :۔ (رسالہ "فانوس" جھانسی بابت فروری مارچ ۱۹۲۷ء) ہما کے تاریخی و ادبی حالات پر ایک محققانہ مضمون۔ یہ مضمون اُن کے اس خیال کی ایک کڑی ہے کہ "قاموس التلمیحات" یعنی فیلس انسائیکلوپیڈیا لکھی جاوے +

(۳) تاریخ التحریر (ایجوکیشنل گزٹ لکھنؤ بابت جولائی ۱۹۲۵ء) فن تحریر کی تاریخ اور اس کے مدارج ارتقائی پر ایک بے مثل تبصرہ ہے +

(۴) ارتقائے نباتات :۔ (رسالہ ایجوکیشنل گزٹ۔ لکھنؤ بابت جنوری ۱۹۲۹ء) علم النباتات کے سلسلہ میں نباتات کی پیدائش اور اس کے ارتقاء پر بیحد مفید اور اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا مضمون +

(۵) ادب فارس و خدمات ہنود :۔ اس مفید و دلچسپ مضمون میں انہوں نے ہنود کی خدمات نظم و نثر فارسی اور اُن کی اعلیٰ فارسی اور ادبی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو مئی تا اگست ۱۹۳۱ء ایجوکیشنل گزٹ جالندھر میں شائع ہوا +

(۶) کاغذی سکّہ :۔ زر کاغذی (نوٹ) کی تاریخ اور اس کے اقتصادی فوائد پر ایک دلچسپ و پُر معلومات مضمون جو رسالہ چاند (اردو) الہ آباد کے فروری نمبر ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا +

(۷) برہما اور اس کی عورتیں :۔ (اخبار التعلیم لاہور ۲۶ مئی و ۲ جون ۱۹۳۰ء) ایک تاریخی جغرافیائی و معاشرتی مضمون +

(۸) میکدہ (دیوان حضرت میکش اکبر آبادی) پر "تعارف" اور مآثر الشعراء (مجموعہ غزلیات مشاعرہ میں پوری

ہوتے رہے۔ ہر قسم کی نثر پر قادر تھے۔ رسالہ "فانوس" جھانسی کے معین ترتیب تھے۔ سنہ ۳۲ء میں اس جہان فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا = ۱۲ +

لہ آپ بی۔اے۔ایل۔ٹی ہیں اور فی الحال گونڈا گورنمنٹ ہائی اسکول کی ہیڈ ماسٹری پر سرفراز ہیں۔ فسانہ اور تاریخی مضامین اچھے لکھتے ہیں = ۱۲

مضمون نگاری اور تصنیف تالیف

مولانا چونکہ اپنے نانا صاحب کو ہمیشہ لکھتے پڑھتے دیکھتے رہتے تھے۔ اس لئے تصنیف تالیف کا شوق انہیں بچپن ہی سے پیدا ہوگیا تھا۔ اور جونہی انہوں نے ہوش سنبھالا اور معلومات بہم پہنچائی وہ عملاً اس طرف متوجہ ہو گئے۔ ۱۵ء میں مدرسہ عالیہ آگرہ اور میاں "میکش" اکبر آبادی کے مکان پر جو مولانا کے ہم سبق تھے ایک مجلس ادبیہ قائم ہوئی جس میں مضامین نظم و نثر لکھے اور سنائے جاتے تھے۔ مولانا چونکہ اس مجلس کے ایک سرگرم ممبر تھے۔ لہذا انہوں نے بھی مضامین لکھنا شروع کئے۔ اسی زمانہ کے مضامین میں سے "دل" تھا۔ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ عرصہ تک اس طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ رامپور کے دوران قیام حضرت "شاداں" بلگرامی و شادمان لکھنوی کی صحبت میں جدید فارسی کا چسکا پڑ گیا۔ اور انہوں نے انگریزی ڈکشنریوں کے طرز پر ایک مبسوط لغت اپنے مربی امام صاحب جامع آگرہ کے نام نامی سے منسوب کر کے "ضیاء اللغات" کے نام سے تیار کر ڈالا۔ پھر تاریخ تخت طاؤس لکھنی شروع کر دی ۲۵ء سے جبکہ وہ گورنمنٹ کالج جھانسی میں تعینات ہوئے۔ ایک مستقل علمی سوسائٹی ہاتھ آئی۔ جس کے ارکان مولوی منظور علی ایم اے۔ پی۔ ای۔ ایس (فی الحال ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول اناؤ) مرزا علی احمد صاحب۔ فارسی پروفیسر (حال متعینہ جبلی کالج لکھنؤ) مولوی ابوالبقا بی۔ اے ایل۔ ٹی جیسے حضرات تھے۔ اس صحبت نے ان کو بالاستقلال قلمی دنیا میں داخل کر دیا۔ اور انہوں نے باقاعدہ تاریخی مضمون نگاری شروع کر دی۔ بابو گوپی لال ماتھر بی۔اے۔سی۔ٹی پنشنر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول اور مدیر "ایجوکیشنل گزٹ" لکھنؤ کی ہمت افزائیوں کو ان کی ادبی ترقیات میں خاص دخل ہے جس کی بنا پر انہوں نے ملک کے مختلف رسائل و اخبارات میں

کامل یقین ہے۔ کہ اگر اسی طرح "حیات نگاری" سے کام لیا جاتا رہا تو بہت جلد تعلیم یافتہ گروہ میں ایک تازہ روح بیداری پیدا ہو جائیگی" + (رسالہ "مشاعرہ" فرخ آباد۔ بابت جون جولائی ۱۹۳۱ء)

خصائل وہ ایک ظریف الطبع مرنجان و مرنج، خوش باش، منکسر المزاج، با اخلاق، بے تعصب وضعدار اور سادگی و صفائی پسند آدمی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مغلوب الغضب اور صاف گو ہیں۔ مگر ان کی صاف گوئی تلخی آمیز ہوتی ہے۔ بیشتر ان کا طرز گفتگو یہ بتلاتا ہے کہ وہ سخت غضب آلود ہیں۔ حالانکہ انہیں مطلق غصہ نہیں ہوتا۔ بہت ہی شکی مزاج آدمی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ جس کام کو انجام دیتے ہیں اس کا کوئی پہلو غیر محقق نہیں رہنے پاتا اور تحقیقات نہایت قابل اطمینان ہوتی ہے۔ بناوٹ اور تکلف سے پاک ہیں اور دوسروں سے بھی اسی کے خواہشمند رہتے ہیں۔ معاملات میں صاف اور سخت ہیں۔ روپیہ کی ان کی نظر میں قدر نہیں اور اس معاملہ میں ایک نہایت غیر منتظم آدمی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر دست نگر نہیں ہوتے تو فارغ البال بھی نہیں رہ پاتے +

تبصرۂ کتاب

(۱)

نفس مضمون ہمارے یہاں کی بہت کم تاریخیں ایسی ہیں جن میں وسعت مطالعہ غور خوض۔ تحقیق۔ تفتیش۔ تنقید۔ علمی و منطقی استدلال اور ازادہ خیالی سے کام لیا گیا ہو۔ یا ان کے مؤلفین و مصنفین نے روایت و درایت کی علمی جانچ پرتال کی ہو۔ اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچے ہوں۔ پیچیدہ مسائل کو تقسیم و تحلیل کرتے ہوئے کوئی انکشاف کیا ہو۔ اور الجھے ہوئے مسائل کو سلجھا کر اس طرح ترتیب دیا ہو۔ کہ ان کی

مرتبہ حضرت نصیر علوی ایم۔اے) پر "تبصرہ نعارف" گویا مستقل ادبی رسائل ہیں جو اہل علم میں بجد مقبول ہوئے۔

حیات عزیز کی تالیف

وسط ۱۹۲۹ء میں آپ نے ملک معظم ہز مجسٹی شہنشاہ جارج پنجم خلد اللہ ملکہ کے "غسل صحت" کی یادگار میں نواب سر، قاضی، عزیز الدین احمد کے ٹی۔او بی ای۔سی آئی ای۔آئی ایس او۔وزیر اعظم ریاست دتیا کے سوانح حیات "حیات عزیز" کے نام سے لکھکر شائع کئے۔

گو یہ کتاب "تاریخ تخت طاؤس" کے بہت بعد میں تالیف کی گئی ہے۔لیکن آپ کی تصنیفات و تالیفات میں اولیت اشاعت کا رتبہ اسی کتاب کو حاصل ہوا۔

یہ کتاب ترقی یافتہ جدید طرز سیرت نگاری کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔رسائل، اخبارات اور مشاہیر اہل قلم حضرات نے اس کے متعلق بہت ہی اچھی آراء کا اظہار کیا۔میں صرف ملک کے مشہور ادیب و شاعر حضرت جگر مرادآبادی کی رائے کا اقتباس درج ذیل کرتا ہوں:۔

"حیات عزیز کو اگر مولانائے موصوف کی طبع لطیف کا شاہکار کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ زبان کی روانی وسلاست کا یہ عالم ہے گویا ایک دریا ہے مترنم ایک نغمہ ہے متبسم سیرت نگار کے سامنے سب سے زیادہ اہم اور نازک مرحلہ صاحب سیر کی زندگی کے تمام جزئیات پر نقد و تبصرہ ان میں ربط و تسلسل تاثرات و نتائج کی شرح و تفصیل کی صورت میں پیش آتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار پر مولانائے موصوف نے فن سیرت نگاری کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔جامعیت و اختصار، واقعیت و نگینئ بیان اس تالیف کی خصوصیات ہیں اور یہ وہ خصوصیات ہیں جن کا توازن صحیح روح انشا کہا جا سکتا ہے۔ملک و قوم میں جو نکبت و انحطاط راسخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔اس کی بنیاد میں صرف پست ہمتی اور عدم خود اعتمادی ہے مولانائے موصوف کی فکر نکتہ سنج نے اس حقیقت کو سمجھ کر ایک ایسی شخصیت کی زندگی کے کارناموں کو پیش کر دیا ہے۔جو از ابتدا تا انتہا نمونہ ہے۔بلند ہمتی و خود اعتمادی کا مجھے

کہ ہر آدمی کرسیوں پر سامان رکھنے کا مذاق اڑائے گا اور خصوصاً تہذیب حاضرہ کا متبع لہٰذا اس کی عبرت کے لئے لکھتے ہیں " اسلاف کے مراسم کو ہمیں نگاہ ادب آمیز سے دیکھنا چاہیئے۔ جس طرح ہر ملکے و ہر رسمے مشہور ہے۔ اسی طرح ہر عہدے و ہر رسمے مسلم زمانہ وتہذیب زمانہ ہر روز تغیر میں ہے کیا عجیب ہے کہ مستقبل میں ہمارے طور طریق قابل مضحکہ قرار دیئے جائیں۔ اور جگہوں کا تو مجھے حال معلوم نہیں۔ البتہ آگرہ میں مینے عشرہ اولے محرم الحرام میں دیکھا ہے کہ ورزشی اور کرتبی اکھاڑوں کے مرکزوں میں خنجر، بچھوا، سیف اور کرتب و ورزش کے دوسرے سامان و آلات کرسیوں اور چوکیوں پر چنے جاتے ہیں۔ جو گویا سلاطین مغلیہ کے آئین دیرینہ کی یادگار ہے" محولہ بالا سطور اور ایسے ہی گوناگوں واقعات بتلاتے ہیں کہ مولانا کشتہ میں غور و خوض اور تحقیق و تجسس کا ایک خاص مادہ ہے۔ اور یہ تاریخ عام طرز تاریخ نگاری سے بالکل جداگانہ ہے +

تحقیق و تفتیش تحقیق و تفتیش تاریخ کا جزو لاینفک بلکہ اصل اصول ہے اور تاریخ نویسی کا انحصار درحقیقت اسی پر ہے۔ آپ کو مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ تاریخ "تخت طاؤس" سراپا مجسمہ تحقیق و تفتیش ہے۔ اور مولانا کشتہ نے اس کے سلسلہ میں تحقیق و تفتیش کو اس کی حد انتہا پر پہنچا دیا ہے +

تنقید تنقید نہ صرف اس کتاب کی روح روان ہے اور تحقیق و تفتیش پر ایک خاص روشنی ڈالتی ہے۔ بلکہ قدم قدم پر تنقید تاریخ کا عملی سبق دیتی ہے +

انکشاف اسی کمال "تنقید" کی بدولت آپ دیکھیں گے کہ اس تاریخ کی بنیاد محض روایات پر نہیں۔ بلکہ اس میں حوادث کا مشاہدہ درست کرکے تجربات سے ثابت شدہ قضایا کو تسلیم کیا گیا ہے اور معلوم سے غیر معلوم امور روشنی میں لائے گئے ہیں۔ مثلاً علی العموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تخت طاؤس ایک ہی تھا۔ شاہجہان نے بنوایا تھا۔ وہ ایران میں موجود ہے۔ لیکن صاحب کتاب نے ایک مستقل عنوان "تخت طاؤس کے رقیب شہرت"

اصلی حالت نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ مگر پیش نظر کتاب تاریخ "تخت طاؤس" ان تمام اوصاف سے متصف ہے۔

مطالعہ

کسی تاریخی تصنیف و تالیف کے لئے ذوق مطالعہ ایک شئے لازم ہے۔ ہمیں مولانا کشتہ کی زندگی سے تعارف کرا دینے کے بعد اس امر کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ اس سلسلہ میں ذرا سی بھی روشنی ڈالیں۔ کتاب اور اس کے حوالہ جات خود "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مصداق اور وسعت مطالعہ کے ضامن ہیں +

غور و خوض

ہر انسان مختلف چیزیں دیکھتا ہے۔ لیکن ان مختلف میں ایک منحد جھلک کا دیکھ لینا۔ شعرائے باکمال ارباب نظر اور مذاق تجسس اور غور و خوض رکھنے والوں کا ہی کام ہے۔ اس مذاق کا حامل ہونے کی یوں تو ہر علم فن میں ضرورت ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ فن تاریخ میں عادت مطالعہ کے ساتھ اس جوہر کی بہت ہی سخت احتیاج ہے۔ یہی چیز ہے جو ماضی و حال میں پیوند لگاتی ، وضع جدید کی قطع و برید کو روشنی میں لاتی اور میدان تاریخ نگاری میں خضر راہ ثابت ہوتی ہے۔ تاریخ ہذا میں آپ کو ایسے بیشمار واقعات نظر پڑیں گے +

چنانچہ صفحات ۶۱ - ۶۵ کے حاشیہ نمبر ۵ میں آپ نے مغلوں کے دربار اور دربار کے طریق نشست و برخاست پر روشنی ڈالی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ مغلوں کے دو میں کرسیاں ہوتی تھیں۔ اور قیاس کہتا ہے" ان پر لوگ بیٹھتے ہوں گے" مگر مولف تاریخ ہذا نے لکھا ہے "خاص ہی خاص موقعوں پر مغلوں کے دربار میں چند معززین کو یہ موقعہ ملا ہے۔ کہ وہ دربار شاہی میں مسند یا کرسی پر بیٹھ سکے ہوں عموماً شاہزادے اپنے ذاتی دربار تک مسند ہی پر کیا کرتے تھے۔ مگر کرسیوں کے محل استعمال کا مسئلہ باقی تھا اس لئے فرماتے ہیں:۔

" اصل یہ ہے کہ ان چوکیوں، صندلیوں اور کرسیوں پر ظروف خاصہ (اسلحۂ شاہی)، نوادر و نفائس عالم، بیش قیمت نقرئی و طلائی ظروف اور اگردان وغیرہ چنے رہتے تھے" یہ صحیح ہے

شروع ہوا اور اس کی نور افشانیوں نے عہد شاہجہانی میں یہاں تک امتیاز پایا اور ترقی کی کہ ایک ایک قریہ منور ہو گیا " (مقدمہ ۳-۴)

یہاں" نور افشانیوں" اور " امتیاز" سے جو "نور جہاں" اور "ممتاز محل" اور انکی وابستگی جہانگیر اور شاہجہاں کی طرف ایک پاکیزہ اور بے تکلف اشارہ ہو گیا اور جس نے ایک خاص نکتہ تاریخ کو حل کر دیا وہ بالاے داد ہے ۔

اجتہاد اس کتاب میں جابجا آپ کو بے مثل اور قابل تسلیم تاریخی اجتہاد ملیں گے جو موئف کے تبحر علمی، وسیع مطالعہ اور اس کے ماہر فن تنقید و تحقیق ہونے کے شاہد صادق ہیں۔ مثلاً بعض مورخین و سیاحین کے مابین یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ تخت طاؤس ٹھوس طلائی تھا یا اس پر سونے کا پتّر منڈھا ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں بہت سے مصنفین کے اقوال نقل کر کے اپنی رائے پیش کی ہے اور لکھتے ہیں:-

مسٹر لین پول نے سوانح اورنگ زیب کے حواشی میں ٹیورنیر کا یہ قول نقل کیا ہے "تخت پر سونے کا پتّر جڑا تھا" اور لارڈ کرزن آنجہانی نے اپنی کتاب پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن میں اسی سیّاح کا یہ بیان لکھا ہے "اوپر بنا ہوا مور جو تمام پکھراج کا بنا ہوا ہے دم پھیلائے ہوئے ہے۔ اس کا جسم سونے کا ہے" برنیر اپنے وقائع سیاحت میں رقم طراز ہے"۔ یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے۔ جس کو کہتے ہیں کہ بالکل ٹھوس ہیں" ۔

لیکن مورخین قدیم اور درباری تاریخ نگاروں کی تحریریں اس امر پر تبصرہ کرنے سے قطعی مجبور ہیں۔ مگر جب ہم اس تخت کے طول، عرض، بلندی اور سونے کی مقدار پر نظر ڈالتے ہیں تو چونکہ سونے کی تھوڑی ہی سی مقدار وزنی و سنگین ہوتی ہے۔ اور اس تخت میں صرف ½ ۳۱ من سونا استعمال ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تو ہمیں اہل مغرب کی تحقیق صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اور اوپر بیان کئے

قائم کرکے کئی ایسے سر کا تذکرہ کیا ہے جو اس نام سے موسوم ہوئے اور ان کو مختلف عہود میں مختلف سلاطین نے بنوایا ہے اور یہ کہ ایران میں اس نام کے دو تخت ہیں اور شاہجہانی تخت کے کچھ ٹکڑے ہی ہیں جو نئی شکل میں مرتب کئے گئے ہیں۔ کچھ ٹکڑے ترکوں کے پاس بھی تھے۔ جو انقلاب دولت عثمانیہ کے بعد بیچنے کے لئے فرانس بھیجے گئے تھے (ملاحظہ ہو ۱۵۷ سے ۱۶۴ انک)"یا" یہ امر مسلمہ ہے کہ مغل عہد کی تعمیرات و مصنوعات میں زیادہ تر ہندی اور ایرانی طرز تعمیر و صنعت کا میل ہے۔ مگر ہندوستانی فن تعمیر و صنعت پر ایرانی تاثر کے مدارج اور ان کے ارتقا پر بھی یہ کتاب بے مثل تبصرہ کرتی ہے۔ جس کی دلیل سطور ذیل ہیں:۔

"اگر ہم غور کریں تو اکبر کے عہد میں ایرانیوں کی آمد شروع ہوتی ہے۔ اور جہانگیر و شاہجہاں کے زمانہ میں وہ اس کثرت سے ہندوستان پہنچ جاتے ہیں کہ یہاں کے بڑے بڑے شہروں کا محلہ محلہ خطہ ایران بن جاتا ہے۔ اور فن تعمیر بھی اسی رفتار کے دوش بدوش متاثر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان اثرات کا ثبوت پکار پکار کر ہمیں وہ عمارات دے رہی ہیں جو اکبر اور شاہجہان کے عہد کی یادگاریں ہیں۔ شاہجہانی عمارتوں 'تاج محل'، 'موتی مسجد' (آگرہ)، 'قلعہ معلیٰ'، 'جامع مسجد'، 'دیوان خاص و عام'، 'ثمن برج' (دہلی)، میں جس نفاستِ مذاق اور سلامت طبع کا دَور دَورہ ہے وہ اکبری عہد میں تو بالکل عنقا ہے۔ جس کی مثال 'فتح پور سیکری' اور قلعہ آگرہ کے وہ محلات ہیں جو اکبر کے دَورِ حکومت میں تیار ہوئے۔ اور جہانگیری عہد میں اس کی آمد آمد کا پتہ چلتا ہے۔ جس کی تمثیل سکندرہ، ایوان جہانگیری اور مقبرہ اعتماد الدولہ آگرہ ہے۔ اس راز کو ایک تاریخ دان بآسانی یوں منکشف کر سکتا ہے۔ کہ جہانگیری عہد سے خاندان اعتماد الدولہ کا رشتۂ اتحاد سلاطین مغلیہ کیساتھ

بعد از آنکہ صبیۂ نور جہاں بیگم کہ از صاب شیر افگن بود در حبالۂ از دواج سلطان شہریار برادر زادۂ جہانگیر پسر شاہ دانیال در آمد" +

حالانکہ یہ صحیح نہیں..... شہریار جہانگیر کا بیٹا تھا۔ اولاد کی تحقیق ماں باپ سے بڑھ کر اور کسے ہو سکتی ہے۔ خود جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے۔

"بعد از آنکہ بعضے فرزندان تولد یافتہ در آوائل صبٰی برحمت حق پیوستند۔ در عرصۂ یک ماہ دو پسران از خواصاں تولد یافتند یکے را جہاندار و دیگرے را شہریار نام نہادم" +

طریق استدلال

کوئی تنقیدی و تحقیقی کتاب دراصل طریق استدلال ہی سے وقیع ہو سکتی ہے۔ اس کتاب میں جہاں تحقیق اور تنقید کی کثرت ہے وہاں منطقی طرز استدلال کی بہتات اور وہ بھی قطعی علمی طریق پر یہی وجہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے دوران میں دل و دماغ خود بخود متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ گو ضمناً امثلہ بالا میں علمی طریق استدلال کی جھلک جابجا پائی جاتی ہے۔ مگر بر سبیل تذکرہ دو ایک مثالیں اور سہی مقدمہ میں جہاں ذکر کیا ہے کہ مغلوں کی عہد کی عمارات خالص ہندی و ایشیائی طرز تعمیر وغیرہ کا نمونہ ہیں۔ اور ان میں مغربی میل جول نہیں وہاں ایک شک اپنی طرف سے پیدا کر کے کہ یورپ والے بھی تو مغلوں کے دربار میں موجود تھے۔ کیوں نہ ان کے اثرات سے فن تعمیر متاثر ہوا ہو گا۔ ایک علمی، اصولی، طبعی اور سائنٹیفک جواب دیا ہے جو مؤلف کی عام معلوماتی وسعت کا آئینہ ہے۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"جب ہم طبقات ارض پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں صخور کی دو قسمیں نظر آتی ہیں صخور آبی۔ صخور آتشی۔ آبی صخور اکثر اوقات بالائی سطوح کے داب کی وجہ سے مصفٰی و مجلٰی ہو کر آتشی صخور کی شکل میں منقلب ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح ایک تیسری قسم اور ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جو جواہرات کے معزز نام سے مخاطب کیجاتی ہے +

ہوئے مختلف اقوال کو مسلسل کرنے سے مندرجہ ذیل ترتیب ہمارے ذہن نشین ہوجاتی ہے۔

مور مجوف اور پائے ٹھوس تھے۔ اور بقیہ سارے تخت پر دبیز پترّ چڑھا ہُوا تھا۔" (صفحہ ۱۱۰ - ۱۱۶)

مؤلف کا ریمارک جو مخلط ہے ہمارے بیان کردہ اوصاف کی دلیل ہے۔

اغلاط تاریخی کی تصحیح

میدان تاریخ گویا پل صراط ہے، ذرا قدم ڈگمگایا اور غلطی کے ایک تاریک گڑھے میں جا پڑے۔ تاریخ تخت طاؤس میں جس تحقیق اور تفتیش سے کام لیا گیا ہے اس میں اس قسم کا احتمال قریب قریب ناممکن ہے۔ بلکہ بجائے اس کے خود اس میں صدہا غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ اور اس کتاب نے ایک "تاریخی صحت نامہ" کی شکل اختیار کرلی ہے۔ چنانچہ صفحہ ۱۲۲ حاشیہ نمبر ۴ پر قدسی کے حالات میں لکھا ہے۔

"اورنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری میں لکھا ہے کہ شاہجہان نے اس کو خطاب "ملک الشعراء" بھی دیا تھا۔ اور اس کے بعد یہ خطاب ابوطالب کلیم ہمدانی کو عطا ہُوا۔ لیکن بادشاہنامہ، خزانۂ عامرہ اور مآثر الامراء وغیرہ سے ایسا ثابت نہیں ہوتا کہ قدسی کو بھی یہ خطاب ملا ہو اور ان کتابوں کے مقابلہ میں لغات مذکور کا اعتبار ظاہر"

یا

صفحہ ۲۴۸ حاشیہ نمبر ۱ حالات شہریار کے ذیل میں تحریر ہے "جہانگیر ابن اکبر اعظم کا بیٹا تھا۔ نورجہان نے جہانگیر کے عقد میں آکر اپنی بیٹی (لاڈلی بیگم) جو شیر افگن خان کے صلب سے تھی اس سے منسوب کردی تھی۔ صاحب سیر المتاخرین اس کو برادرزادہ جہانگیر اور پسر دانیال (المتوفی ۱۰۱۳ھ) بن۔ اکبر اعظم لکھتے ہیں چنانچہ سیر المتاخرین مطبوعہ نولکشور پریس صفحہ ۲۴۸ میں لکھا ہے۔

ٹھونس ٹھانس اور اپنے موافق معاملہ سازی سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ لکھا ہے:۔

"اُن طاوسین ہی کی وجہ سے یہ تختِ تخت طاؤس کے نام سے موسوم ہؤا تھا۔ میرے خیال میں اس تخت اور اس کے نام کا خیال اہل ہنود کی قدیم روایات سے اخذ کیا گیا ہے جو بتلاتی ہیں کہ اس نام کا ایک تخت ہندوستان کے عہد ماضی بعید میں بھی تھا۔ چنانچہ جین مت کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے۔ کہ ایک راجہ مع اپنی رانی کے اس سبب سے کہ اس کے دیوان نے اس سے غدر و بیوفائی کی تھی۔ وہ کیکیئی ینتر (केकइपत्र) نامی تخت پر بیٹھ کر بھاگا۔ فضا میں پہونچ کر کسی خرابی کے باعث وہ تخت بگڑ گیا۔ اور وہ دونوں ایک مرگھٹ پر گر کر مر گئے +

لفظ کیکیئی ینتر (केकइपत्र) سر یر طاؤس نما یا تخت طاؤس کے ہم معنی ہے" ہمارے خیال میں تخت طاؤس کیکیئی ینتر نامی قصص الاصنامی خیالی یا واقعی تخت کے تخیل کی ویسی ہی حقیقی تصویر تھا۔ جیسی بقول واحد یار خان بی۔ اے تاج مقبرۂ ہمایوں کے ابتدائی خیال کی حد و انتہا ہے (صفحہ ۱۰۵)

یا

(۲) مصارف تخت طاؤس کے سلسلہ میں مسٹر ای مارسڈن بی۔ اے۔ آئی۔ ای ایس کا جو ہندوستانی تاریخی درسی سلسلہ کے ایک مشہور مصنف ہیں۔ ایک قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"چونکہ صاحب موصوف کی درسی کتابوں میں اکثر امور کی بنا ضعیف روایات پر ہے اس لئے میں ان کی تحریر پر توجہ نہیں کرنا چاہتا" (صفحہ ۱۱۳)

(۲)

ادبیت امور بالا تو تھے مضمون تاریخ "تخت طاؤس" کے متعلق۔ لیکن ابھی اس کے ادبی پہلو پر بحث کرنی باقی ہے +

یورپ کی سطح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریب قریب تمام تر ازمنہ رباعیہ کی یادگار ہے اور سوائے اسکے کہ ہسپانیہ کی زمین تو آبی و آتشی صخور سے مل کر بنی ہے ورنہ تمام یورپ کی بالائی سطوح پر آبی صخور پائے جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہاں کوئلہ بکثرت ملتا ہے اور جواہرات قریب قریب سب ہی صخور آتشی کے لخت جگر ہیں۔ اس لئے یہ امر بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔ کہ جب اہل مغرب کے یہاں کان جواہر ہی نہیں تو انہیں اس زمانۂ ماضی بعید میں کان کنی' جواہر تراشی اور جواہرات کے تعبیہ و پیوند کی سلیم المذاقی میں دستگاہ کس طرح حاصل ہوتی (مقدمہ ۶ - ۷)"

درحقیقت بقول مولانا کشتہ کے "یہ اتنا عظیم الشان مسئلہ ہے جس کے ہوتے ہوئے مصنفین یورپ اور ان کے عقیدت مندوں کی وہ تمام توجیہات پا در ہوا نظر آتی ہیں۔ جو انہوں نے خالص ایشیائی مصنوعات ہند کی ساخت میں اہل یورپ کی شرکت ثابت کرنے کے لئے وضع کر رکھی ہیں *

آزاد خیالی و وسعت نظری اس کتاب میں یوروپین مورخین کی پیروی نہیں کی گئی ہے۔ جو اپنی ناواقفیت، تعصب اور تنگ خیالی کی بنا پر واقعات کو خواہ مخواہ رنگ دیتے ہیں بلکہ جس زمانہ کا حال لکھا ہے اسی زمانہ کے مورخین کی تاریخوں سے واقعات اخذ کئے گئے ہیں اور اس طرح ان تمام غلط خیالات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو بوجہ لاعلمی یا کسی مقصد ذاتی کی بنا پر جھوٹے حالات' سچے واقعات کی صورت میں مشتبہ کئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں مغربی مورخین کی غلطیوں کو غائت درجہ جسارت و دلیری سے مدلل طور پر فاش کیا گیا ہے اور پوست کندہ حالات لکھے گئے ہیں اور ان کی غلط فہمی، تعصب، تنگ خیالی اور ناواقفیت کو علی الاعلان ظاہر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۰۲ تا ۱۰۶۔ عنوان "ڈاکٹر برنیر کے ایک قول کی تنقید"۔

تاریخ تخت طاؤس کے مؤلف کی دقیقہ رسی عالمانہ فہمی اور بے تعصبی اس سے بھی ظاہر ہوسکتی ہے۔ کہ انہوں نے تخت طاؤس کے موردوں کے سلسلہ میں خواہ مخواہ کی

اور "عالم برق" وغیرہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو اختراعات لفظی وترکیبی پاکر تاریخ زیر بحث کو جدت نگاری وجدت طرازی کی ایک تمثیل قرار دیں یا "بھارت ورش" کو بے تکلف استعمال ہوتے ہوئے دیکھ کر منہ بنا دیں۔ لیکن درحقیقت یہی وہ خد و خال ہیں جو اس کتاب کو تازہ تصانیف میں بہت ہی ممیز و ممتاز کرتے ہیں۔ گویا اس کی زبان زبانِ جدید و قدیم کا ایک عجیب و خوشگوار مرکب ہے اور ہمارے سامنے زبان کے وسیع کرنے کے ذوق و ذرائع پیش کر رہی اور طریق کار کا عملی سبق دے رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو اس ادیب کی قلم کا نتیجہ ہے۔ جس کی تعریف کرتے ہوئے حضرت بیگم مراد آبادی جیسے غیور ادیب نے تحریر فرمایا:-

"زبان کی روانی وسلاست کا یہ عالم ہے۔ گویا ایک دریا ہے مترنم ایک نغمہ ہے متبسم" (مشاعرہ فرخ آباد بابت جون جولائی ۱۹۳۲ء)

مؤلف کا عقیدہ دربارہ محاورہ لکھنؤ و دہلی

"تاریخ تخت طاؤس" کے مطالعہ کرنے والے کو یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ

یہ کتاب اس شخص کی لکھی ہوئی ہے جو محاورہ لکھنؤ اور محاورہ دہلی دونوں کو اچھا سمجھتا اور یہ لازم جانتا ہے کہ ایک ہی مضمون میں اگر موقع آجائے تو دونوں کے اتباع کا ثبوت دے دے۔ چنانچہ

(۱) عالمگیر نے بھی ...... ترمیم تنسیخ کرنی شروع کی (۱۴۲) موافق محاورہ لکھنو

(۲) یادداشتیں رامپور ہی میں قلمبند کرنا شروع کر دی تھیں مقدمہ صفحہ ۱۰ مطابق محاورہ دہلی

لیکن علی العموم اس کی زبان پر دہلویت غالب ہے جس کا باعث غالباً رہائش و تربیت آگرہ ہے۔ چنانچہ اہل لکھنؤ کے خلاف آپ اس کتاب میں ایسی اور ایسا کے موقع پر ہمیشہ جیسی اور ویسا ہی پائیں گے۔ مثلاً

تاریخ میں تلاش ادبیت کی ضرورت اور معیار ادبیہ

جس طرح بقول مولانا کشتہ "ایک لعل شب تاب ایک والئی ملک کے جواہر طرف کلہ کے ساتھ اوج قسمت لعل و گہر کا معیار قرار پا سکتا ہے۔ مگر گدڑی کا لعل ہو کر بے قدر رہجاتا ہے" اسی طرح اعلےٰ تخیلات، پاکیزہ جذبات اور نادر و نایاب معلومات کے انمول موتی جب موزوں، برجستہ و برمحل الفاظ اور موثر و دلاویز پیرا ئے میں ادا کر دئے جاتے ہیں تو ان کی خوبیوں میں چار چاند لگ جاتے ہیں لیکن جب وہی جواہر پارے بھدے الفاظ اور معمولی طرزِ ادا کی تھیلیوں میں بھر دئے جاتے ہیں تو حرف ریزوں سے زیادہ کم وقعت اور ہیچ د پوچ ہو جاتے ہیں اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی تو نہیں دیکھتا اس لئے ایک مورخ کا فرض اولیں ہے کہ وہ اظہار خیال کے لئے دلچسپ اسلوب بیان اور مناسب محل و موقع الفاظ استعمال کرے +

عام مورخین اُردو کا طرز تحریر

ہماری زبان کے عام مورخین نے جن کا پایۂ ادبیہ بھی مسلمہ جمہور ہے یا تو تشبیہات و استعارات کے زور اور الفاظ کے شور سے پڑھنے والوں کے دماغ کو مسحور کیا اور تاریخ کو ہم پلہ داستان بنایا ہے۔ یا اس قدر خشکی اور یبوست سے کام لیا اور دلائل و براہین کے گورکھ دہندے میں مضامین کو الجھایا ہے۔ کہ مطالعہ کرنے والے کو تاریخ ایک بار گراں معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس تاریخ تخت طاؤس کی زبان بیحد سلیس و سادہ شستہ و پاکیزہ ہے۔ اس میں وہ لوچ اور برجستگی ہے کہ ناظرین خود بخود متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں +

الفاظ جدید کا استعمال و اختراع

ممکن ہے کہ بعض حضرات "عکس گیر" (فوٹو کا کیمرہ) مثلاً نسکار (سرچہ "محقق") "مجلہ" (رسالہ) "ماحول" (ایٹ موسفیئر) "قصص الاصنام" یا "دیومالا" (مائی تھالوجی) اور آبی رو کا احتکاک" جیسے مرکبات جدید دیکھکر یا "صلد" بمعنی (سالڈ ٹھوس) "حطب متحجر" (کوئلہ) اور

(۲) ایرانی وہندوستانی صناعوں کے میل جول نے جس طرح فن تعمیرات وخطاطی میں انقلاب عظیم پیدا کردیا۔ اسی طرح فن جواہر تراشی ونگینہ سازی میں ان کی ہنرشناسیوں اور ترکیبوں کے رنگا رنگ جوہر نمایاں ہوئے

(۳) اکبر کے دور اور سلطنت مغلیہ کے عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

"انسانی رشتوں کے ساتھ ساتھ رنگا رنگ پیوندوں اور درختوں سے ہندوستان چمنستان بن گیا۔ سنگھاسن بتیسی کی پریوں اور مہابھارت کے سورماؤں کی طرح صدہا ہزارہا ہندوستانی تخیلات کے شاہکاروں نے ایرانی لباس پہن لیا۔" (مقدمہ ص۳) +

طرز ادا میں مغربیت کی جھلک

طرز ادا میں جا بجا مغربیت بھی آپ کو جھلکتی ہوئی دکھائی دے گی۔ جو مؤلف کی روشن خیالی وسیع المعلوماتی اور حمایت ترقی زبان کی دلیل ساطع ہے۔ مثلاً محمد شاہ رنگیلے کا سرسری تذکرہ اور سلطنت مغلیہ کی حالت زار بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں +

"بادشاہ تھا مگر شاہ شطرنج کہ کٹ پتلی کی طرح ذی اغنیا منصبداروں کے ہاتھ میں کھیلتا تھا +

خط کشیدہ یوروپین طرز ادا ہے +

محاکات

ایک ادیب ایک مضمون نگار اور خاص طور پر ایک مورخ کا بہت ہی بڑا کمال یہ ہے کہ وہ واقعات وکیفیات کو ایک صفاف (فلم) کی شکل میں مرتب کرے۔ یعنی اس طرح لکھے کہ تصو۔ کی برقیت سے ہم کنار ہونے ہی واقعات نظر کے سامنے گردش کرتے چلے جائیں۔ اس کو فن ادب میں محاکات کہتے ہیں۔ اور محاکات سے چونکہ ایک شعریت پیدا ہو جاتی ہے اس لئے تاثر مضمون بڑھ جاتا ہے۔ مؤلف تاریخ تخت طاؤس نے اس امر خاص میں نہایت کامیاب قلمرانی کی ہے۔ وہ تخت طاؤس کے

صاحب ماثر الامرا جیسی شخصیتوں کی کشید ہ شعبہ قلمی سے ماخوذ ہے" (۸۶) +

تشبیہات و استعارات اس کتاب میں تشبیہات و استعارات ہیں۔ لیکن صرف اسی قدر جس قدر کھانے میں نمک یا جیسے انگوٹھی پر نگ پھر اس لطافت کے ساتھ کہ کیف آمد سے مملو، تصنع اور آورد کا نام نہیں +

اسلوب بیان اس کتاب کا اسلوب بیان بہت ہی صاف سلجھا ہوا دلچسپ اور موثر ہے۔ جس میں خیالات کا تسلسل اور زبان کی پختگی، الفاظ کا تناسب و توازن آپ کو اپنے دماغ پر جادو کرتا ہوا نظر آئیگا۔ مثلاً "دولت اور اس کا مصرف" کے عنوان سے تخت طاؤس کی ساخت کے جواز کی تمہید ہے۔ لکھا ہے:۔

جواہرات کی مکلف تھیلیاں توشہ خانہ کے کسی گوشہ میں صندوقچیوں میں پوشیدہ رہیں۔ اور موقع بموقع نظارگیان عالم کو محو دید کر کے سلطانی ہیبت و جبروت کا ایک ناپائیدار اثر پیدا کریں تو ان کا یہ مصرف ہرگز اس قدر صحیح نہیں ہو سکتا ہے۔ جس قدر کہ یہ طریقہ استعمال کہ اس کو حسن و خوبی سے مرتب کر کے ہیبت و دبدبہ سلطانی، شان و شکوہ دارائی، عظمت و جلالت جہانداری کی جیتی جاگتی تصویر قرار دیکر ان سے روزانہ ایک مستقل و پائیدار اثر ہیبت و دبدبہ کا پیدا کیا جائے[1]"

[1] صفحہ ۷۰ = ۱۲ +

جدت ادا اور مشرقیت جدت ادا کی بہت سی رنگین، پر لطف مشرقی اور بیشمار تمثیلات آپ کو اس کتاب میں ہاتھ آئیں گی۔ مشتے نمونہ از خروارے +

(۱) = یہ قوم (مراد یمنی) اپنے وطن مالوف سے اٹھ کر ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایران والوں سے اپنی ترقی میں ہم آغوش ہوئی + (مقدمہ صفحہ ۵) +

جھینک کر سسک سسک کر وقت کی آخری گھڑیاں ختم ہوتی ہیں اور یہ مجبوریوں کا شکار، نیرنگی عالم کا مجسمہ، تارک اورنگ و دیہیم، ثانی ابراہیم اس گوشہ گمنامی میں ۲۶۔رجب المرجب ۱۰۷۶ھ مطابق ۱۶۶۶ء کو اپنے رفیقۂ حیات ممتاز محل کے مقبرے پر آنکھیں جمائے ہوئے ایک آخری سانس لیتا ہے۔ اور رخصت ہو جاتا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون (صفحہ ۱۴۸۔۱۴۹)

اُف! کس بلا کا درد ہے ؎

کمال محاکات

ایک مصور کا کمال تو یہ ہے کہ وہ جس شئے کی تصویر کھینچے وہ مکمل ہو۔ اور ذرا بھی نوک پلک میں کمی نہ آنے پائے۔ لیکن ایک ماہر محاکات بعض پہلوؤں کو لیتا اور بعض سے سرسری طور پر گزرتا۔ بعض کو نظر انداز کرتا چلا جاتا ہے۔ تاہم اس کی قلمی تصویر مصور کے موئے قلم کی تصویر سے کہیں بالا و برتر ہوتی ہے ؎

"تاریخ تخت طاؤس" میں آپ کو یہ کمال قدم قدم پر ملیگا۔ اس کے مؤلف کا قلم خفیف اشارات سے وہ کام لے جاتا ہے جس کے لئے صفحے کے صفحے درکار ہوں اور شائد وہ بھی اس نطافت و جامعیت کے ساتھ روشنی نہ ڈال سکیں مثلاً

۱۔ "بابر نے سلطنت ہند کی داغ بیل ڈالی۔ ہمایون نے بنیاد کھودی اور ساز و سامان جمع کیا۔ اکبر نے اس بنیاد پر عظیم الشان قصر حکومت تیار کیا۔ جہانگیر نے اس کی زیب و زینت میں عمر گزاری۔ شاہجہان نے آرام سے بیٹھ کر چین کے لطف اٹھائے۔ شہرت عام و بقائے دوام کے پھریرے اڑائے۔ اور اورنگ زیب عالمگیر نے ہر کمی کو پورا کر دیا۔" اور تو سب عبارت مولانا آزاد دہلوی کی تقلید ہے۔ لیکن شاہجہان سے آخر تک مولانا کشتہ کے جملہ اوّل کو لیجئے اور شاہجہان کی پوری تاریخ مطالعہ کر لیجئے۔ اور آخری جملے کو لیجئے۔ اور اورنگ زیب کی ساری ہسٹری

دروں کی تصویر کھینچتے ہیں +

صناع نے ان ہر دو طاؤسان طلائی کو ایسی خوبصورتی سے دم پھیلائے ہوئے بنایا تھا۔ کہ آمادہ رقص معلوم ہوتے تھے۔ اور ان کی دمول میں اس خوش اسلوبی و حسن ترتیب سے نیلم، زمرد، فیروزے اور دوسرے جواہرات تعبیہ کئے تھے۔ کہ دم طاؤس کا اصلی نداق نمایاں تھا۔ ہر ایک کی چونچ میں سڈول اور یکساں موتیوں کی تسبیح پڑی ہوئی سینہ پر ایک ایک بیش قیمت لعل جڑا ہوا جس کے گرداگرد دو دو سو گرین کے وزنی موتی جمے ہوئے گلے ہیں ۶۳ - ۶۳ رتی موتیوں کا ہار ایک ایک نورانی ہیرے سمیت جس کا وزن ۱۱۰ رتی تھا) آب و تاب کے ساتھ آویزاں تھا + (صفحہ نمبر ۱۰۱ - ۱۰۲) +

۱۱

رعات شاہجہانی کا مرقع تیار کرتے ہیں

وُہ شاہجہان جس نے جامع مسجد (دہلی) بنوائی - وہ شاہجہان جس نے تاج محل (آگرہ) کی تعمیر کی - وہ شاہجہان جس نے دلی کو نئے سرے سے ترتیب دیا - وہ شاہجہان جس نے تخت طاؤس پر جلوس کیا اور جلوس بھی وہ جلوس کہ جس کے باعث رعب وسطوت شاہی کا دریا حاضرین دربار کے قلوب میں لہریں لینے لگا - وہ شاہجہاں جو اس عالم میں بھی خدا کو نہ بھولا۔ مگر وہ شاہجہان جس نے حصول سلطنت کی خاطر اپنے خاندان کے کتنے ہی چشم و چراغ بجھائے - دنیا سے جاتا ہے - تو کس طرح؟ دارالمکافات کی ایک تصویر مجسم ہنگر عمر کا آخری حصہ ہے - ایک مسجد کا حجرہ ہے - چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے - اور ہو کا عالم ہے - آٹھ سال تک قید اور نگ زیب میں جھینک

کانون پرگراں ہے۔

۳۔ بعض حواشی کی طوالت خالی از مفاد نہیں مگر بیجا ضرور ہے۔ مثلاً صفحہ ۹۴-۹۸ کے حاشیہ نمبر ۵ کے ذیل میں علامہ افضل خاں کو "غلام" لکھ دینے پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے ایک غلطی کا ازالہ ہوتا ہے اور تہذیب قدیم و آئین دربار مغلیہ پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن یہ مسئلہ چند سطور میں طے ہو سکتا تھا۔

صفحہ ۸۰ پر بے بدل خان کے حالات میں اس کے نام کی تصحیح ضرور ہو جاتی ہے مگر جس قدر تشریح کی گئی اس کا ایک معقول حصہ زائد از ضرورت بھی ہے۔

۴۔ بعض معاصرین کے حالات حواشی میں جامع و مانع طور پر قلمبند نہ ہو سکے مثلاً سعید احمد مارہروی، جادو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر ایشوری پرشاد وغیرہ وغیرہ کے حالات کہ ان میں سے پیدائش وغیرہ کا ذکر نہیں۔ حالانکہ اس معلومات کا بہم پہنچانا سہل تھا۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو چونکہ یہ کتاب ایک ہسٹوریکل انسائیکلوپیڈیا (قاموس التاریخ) کا حکم بھی یقینی طور پر رکھتی ہے اس کی قدر و قیمت میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا اور وہ مفید سے مفید تر ہو جاتی۔

۵۔ صفحہ ۳۵ پر "جنیر" کے متعلق قوسین میں لکھدیا ہے "جو سرحد نظام کی انتہا پر ہے" حالانکہ اس تشریح کی ضرورت اور تھی کہ "اب علاقہ اورنگ آباد میں واقع ہے" (علیگڈھ میگزین "علیگڈھ")

۶۔ صفحہ ۱۲۹ کے حاشیہ ۱۹ میں نقار خانہ دہلی کے حالات لکھے ہیں۔ مگر مناسبت موقع نقار خانہ آگرہ کے حالات کی مقتضی تھی۔

۷۔ دو ایک جگہ مجھے لائق مؤلف کی رائے سے اختلاف ہے۔ مثلاً وہ صفحہ ۱۰۵ مابین حاشیہ ۸ علامہ شبلی کی مختصر سوانح عمری میں رقمطراز ہیں:-

عہد حاضرہ کے ترقی یافتہ طرز "سیرت نگاری" کے بانی تھے"

دیکھ جائے۔ پھر لطف یہ کہ "ہر کمی کو پورا کر دیا" ایک ایسا فصیح بلیغ فقرہ ہے۔ کہ جس میں عالمگیر کے متعلق ہر خیال وعقیدے کے انسان کے تخیل وعقیدت کی کیفیت موجود ہے +

ب۔ نادر نے بعد مراجعت فتح ہندوستان ہرات میں ایک بہت بڑا جشن فتح وفیروزی ہند منایا۔ اور اس میں اموال واسباب مردنہ ہند کی ایک زبردست نمائش ترتیب دی اس کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :-

یہ نمائش کیا تھی ہندوستان کے خزانوں کی نمود تھی ورنہ حسن ترتیب کی آرائش وزیبائش معلوم (صفحہ ۱۵۴)

مخلوط فقرہ، فقرہ نہیں نادر کی بربریت، وحشت اور بدمذاقی کا ایک مکمل مرقع ہے۔ جس کا لطف کچھ صاحبان مذاق ہی خوب اٹھا سکتے ہیں +

عیوب ونقائص

اگر میں نے سطور ہذا کا عنوان صرف "تعارف" ہی مقرر کیا ہوتا۔ تب تو غالباً میں یہاں تک پہنچنے کے بعد ختم کر دیتا اور کوئی مجھ پر ذرا بھی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن "تعارف" کے ساتھ "تبصرہ" کی قید ترکیب گویا کھلایا ہی چاہتی ہے "خوب قصیدۂ مدحیہ لکھا ہے" مگر یاد رہے۔ نہ تو میں "تاریخ تختِ طاؤس" کی دلاویزی سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ دامن کتاب کے داغ دھبے میری نظر سے اوجھل ہو جائیں اور نہ مولانا کشتہ کی محققانہ شخصیت سے اس قدر مرعوب ہو سکا ہوں جو ان کی کوتاہیاں نمایاں کرنے سے ہچکچاؤں وہ واقعات تھے اور یہ حقائق کہ۔

ا۔ مولانا نے اور تو خیر کہیں نہیں مگر "مقدمہ" میں بعض جملے بہت طولانی کر دیئے۔ جو نزاکتِ طبع پر بار ہیں۔ مثلاً صفحہ ۵ کے پیرے نمبر ۲ کا آخری حصہ یا صفحہ ۹ کا پہلا پیرا

۲۔ صفحہ ۱۴-۱۵ پیرا نمبر ۲ ع۱ میں بسلسلہ "تشکرات" "کا" "کا کی کثرت سلیم المذاقی کے

بھی وہ شان نمایاں ہے۔ گویا انداز بیان صاف بتلا رہا ہے کہ ان طلائی طاؤسوں کا بولنا مولانا کو اور ان مولانا کو جو تاریخ اسلام کے کیڑے ہیں حیرت انگیز معلوم ہو رہا ہے۔ مجھے یہ تحقیق نہیں کہ دراصل "تخت طاؤس" کے مور بولتے تھے یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور عرض کرونگا کہ اس زمانہ کے لئے یہ بھی کوئی قابل حیرت امر نہیں۔ غالباً مولانا کو معین الآثار (تاریخ تاج محل) مؤلفہ مولوی معین الدین احمد اکبرآبادی کے مستند ہونے میں۔ کلام نہ ہوگا اس میں لکھا ہے :-

"خلیفہ المقتدر باللہ عباسی (۲۸۲-۹۶ھ) نے ایک حیرت انگیز عمارت تعمیر کرائی تھی جو دار الشجرہ کے نام سے موسوم تھی۔ صحن کے وسط حوض میں طلائے احمر کا ایک درخت تھا جس میں سونے چاندی کی اٹھارہ ڈالیاں تھیں۔ ہر ڈالی میں بے شمار شاخیں تھیں۔ ہر شاخ میں بیش بہا مختلف رنگوں کے جواہرات اس خوبی سے مرصع کئے گئے تھے کہ قدرتی و مصنوعی پھلوں و میووں میں کچھ فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔ نازک ڈالیوں پر رنگ برنگ کے طلائی پرندے تھے۔ یہ پرند اس معجز نما ترکیب سے بنائے گئے تھے کہ جب ہوا چلتی تو سب خوش الحانی سے نغمہ سرائی کرتے تھے" +

المقتدر اور شاہجہان کے دور میں سات ساڑھے سات سو برس کا فرق ہے۔ بہر حال المقتدر متقدم تھا۔ اور شاہجہان موخر اسی دور کے کاریگر اور صناع تھے جو بقول مولانا "دربار ہند میں آکر جمع ہوگئے تھے"۔ پھر تعجب کی بات کیا ہے؟ کیا جو دماغ بغداد میں معجز نمائی کر سکتے تھے۔ وہ ہندوستان میں سات سو برس بعد دم مسیحائی نہیں بھر سکتے تھے؟ میرے خیال میں تحقیق سے کام لیا جاتا تو شاید کوئی مفید مطلب بات نکل آتی۔ مگر ہاں! ذرائع تحقیق و تفتیش کہاں؟ کہ

ورق بر ورق ہر سوئے برد باد (فردوسی)

لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ عیوب و نقائص نہیں۔ بلکہ آثار بشریت ہیں، جن

حالانکہ ایسا نہیں "حیات نگاری" کے طرز جدید کے بانی علامہ حالی مرحوم و مغفور ہیں۔ (ملاحظہ ہو۔ سیر المصنفین حصہ دوم صفحہ ۳۷۱ و صفحہ ۳۷۶)

ب۔ صفحہ ۲۸ اور اس صفحہ کے حاشیہ ۵ میں فاضل تاریخ نگار نے نہ صرف یہی دھوکا کھایا ہے۔ کہ "اردو" شاہجہاں کے دور میں وجود پذیر ہوئی۔ بلکہ ان سے یہ لغزش بھی ہوئی ہے کہ انہوں نے صاحب شعرالہند کی اس تحقیق پر کہ اردو کو اورنگزیب کی فتوحات دکن کے عہد سے بحیثیت زبان ماننا چاہیئے اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ ایک زمانہ میں وہ خود مجھ سے "دکن میں اردو" (مولفہ نصیرالدین ہاشمی) "پنجاب میں اردو" (مؤلفہ محمود شیرانی) اور "اردوے قدیم" (مؤلفہ سید شمس اللہ قادری) کی تحقیق و تفتیش کی بہت کچھ تعریف و توصیف کر چکے اور ان کے مطالعہ کی ترغیب دلا چکے ہیں جو صاحب شعرالہند کی رائے کے برعکس مغلوں کے دور سے صدیوں پہلے زبان اُردو کے وجود اور اس کے بشکل زبان متشکل ہونے پر روشنی ڈالتی ہیں +

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کشتہ نے ان کتابوں کو اس حصۂ تاریخ کی تالیف کے بعد مطالعہ کیا اور معلومات جدید کے قلم سے ان سطور کو قلمزد کرنا بھول گئے +

ج۔ صفحہ ۱۱۱ میں "ایک نقل" کے عنوان سے لکھا ہے :۔

"کہتے ہیں کہ جس وقت بادشاہ تخت طاؤس پر جلوس کرتا تھا تو یہ مور دُم پھیلا کر ناچنے لگتے۔ تسبیح ان کی منقاروں میں گردش کرنے لگتی اور اللہ اللہ کی صدائیں چونچوں سے برآمد ہوتیں اور ہر صدا پر ایک دانہ ہٹتا جاتا تھا"

لیکن یہ نقل ہی نقل ہے۔ اصل کو اس میں ذرہ بھر دخل نہیں کہ ع

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کیلئے" ہم اس سے پہلے کہیں لکھ آئے ہیں کہ مولانا کی عبارت بہت ہی پرمعنی اور ان کا چھلتا ہوا قلم کہیں کہیں بہت گہرائیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے یہاں

کے ۔ ساتویں میں تصاویر کے عنوانات ۔ یہ ہر ایک قسم حروف تہجی کے ترتیب سے مرتب کی گئی ہے ۔ جو ایک دلچسپ اور مفید ترین جدت ہے اور اسی نے اس کتاب کو قاموس التاریخ بنایا ہے +

لکھائی چھپائی کے متعلق صرف یہ کہدینا کافی ہوگا ۔ کہ پنجاب کے مایۂ ناز مطبع "مفید عام" لاہور میں رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز کی علمی سرپرستیوں کے زیر سایہ طبع ہوئی ہے ۔ یہ پریس اردو کی خدمات اور علوم مشرقیہ کی تربیت کے سلسلہ میں ہندوستان میں وہی پایہ رکھتا ہے جو "نولکشور پریس" لکھنؤ اور صحت کتابت حسن طباعت اور نفاست کاغذ وغیرہ میں اس سے زیادہ نمایاں ہے +

مولانا کشتہ (مؤلف کتاب ہذا) کی ملازمتی مجبوریوں، عدیم الفرصتی اور علالت کے لاتنا ہی سلسلہ سے مجھے ذاتی طور پر واقفیت ہے اس لئے یہ موقر کتاب صحیفۂ عبرت اور وقت کی قدر نہ جاننے والوں کے لئے پیغام عمل ہے +

گو محاسن ذاتی و صفاتی کے علاوہ "تخت طاؤس" کی طرح "تاریخ تخت طاؤس" کا سانٹ سال میں تیار ہونا ہی ایک شگون نیک اور اس کی شہرت و مقبولیت کا پیش خیمہ ہے ۔ تاہم میں یہ عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اہل ملک کو جو ملک کے بہت سے ناموافق مزاج امور میں یوروپ کی کورانہ تقلید کرنا اپنے لئے باعث فخر و مباہات سمجھتے ہیں اس کتاب کی دوا اور جائز قدردانی کرنے میں مغربی ارباب نظر کی پیروی کرنا اور اپنی سلیم المذاقی کا ثبوت دینا چاہئے کیونکہ بے لوث، بے غرض اور بغیر کسی مجلس علمیہ اور بلا ارباب دول کی سرپرستی کے علمی مشاغل میں مصروف رہنے والوں کی حوصلہ افزائی کی اس سے بہتر تدبیر ہو ہی نہیں سکتی کہ ان کے نتائج مساعی کی قرار واقعی قدر کی جائے +

اب میں آپکے قیمتی وقت کو زیادہ ضائع کرنا نہیں چاہتا اور اس سمع خراشی کی معافی چاہتے ہوئے آپ سے مرخص ہوتا اور آپ کو اصل کتاب کے مطالعہ کیجانب متوجہ کرتا ہوں +

سید ظہیر الدین احمد علوی ایم ۔ اے ایل ایل بی (علیگ) وکیل
مدیر رسالہ "مشاعرہ" (فرخ آباد)
مین پوری (یو ۔ پی)
مورخہ ۱۶ ۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء

سے غالباً کوئی تصنیف و تالیف خالی نہیں انہیں دیکھکر نفس کتاب اور اس کی خوبیوں کے متعلق کوئی غلط خیال قائم کرنا۔ ایک ظلم صریح اور مؤلف کو ماورائے انسانیت سمجھنا ہوگا +

حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی نوعیت میں اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔جس کے ذریعہ سے قدرداناں فن تاریخ کے لئے تنقید و انکشاف مسائل تاریخی کا ایک بیش بہا سرمایہ فراہم کیا گیا ہے +

فاضل مؤلف نے جس ذوق سلیم اور بصیرت تاریخی اور ادبی سے کام لیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔میں زور کے ساتھ کہ سکتا ہوں کہ ان کی یہ کوشش ادبی و تاریخی حلقوں اور علمی مجلسوں میں بہ نظر استحسان واحسان مندی دیکھی جائیگی +

اس کتاب میں علاوہ معنوی خوبیوں کے جو تاریخ، تنقید مسائل و معلومات آئین دربار مغلیہ و آئین سلف سے متعلق ہیں۔ سب سے بڑا حسن اس کی پاکیزہ ترتیبی ہے۔ لطف یہ کہ کتاب باب در باب نہ ہونے کے باوجود بھی محض عنوانات کی خوش وضعی و خوش ترتیبی کے باعث واضح تر بن گئی ہے۔ہر حصے کو بالکل جدا جدا مگر اس طرح پر لکھا گیا ہے کہ ہر ایک میں شان تکمیل موجود ہے۔ اور ایسی دل آویزی و دلچسپی پیدا کی گئی ہے۔ کہ طبیعت خود بخود حصص آئندہ کی مشتاق مطالعہ ہوتی چلی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے بار بار پڑھنے پر بھی جی سیر نہیں ہوتا +

مکمل کتاب (علاوہ فہرست مضامین و فہرست حواشی) ۲۰×۳۰/۸ تقطیع کے ایک سو چونسٹھ (۱۶۴) صفحات اور ستتر عنوانات پر مشتمل ہے۔ فہرست حواشی سات قسموں پر منقسم ہے۔ اوّل میں مشاہیر رجال جن کا تذکرہ کتاب میں آیا ہے۔ ان کے نام، حواشی کے نمبر سلسلہ و نمبر صفحات درج ہیں۔ دوسرے میں خوانین کے۔ تیسرے میں عمارات، باغات او مقامات کے۔ چوتھے میں اشیا کے۔ پانچویں میں ادبی و تاریخی اصطلاحات وغیرہ۔ چھٹے میں رسوم

کہدو تم اپنے منہ سے کہ کشتہ ہے یہ مرا ۔۔۔ مل جائے کچھ تو عشق میں دادِ وفا مجھے

ضبطِ فغاں کی تاب کیا کیسے چھپاؤں رازِ عشق ۔۔۔ تارِ نفس کی لے میں ہے شورِ صدائے سازِ عشق
وجہِ قرارِ قلب ہے بیخودی نیازِ عشق ۔۔۔ حسن سکوں شکن ترا فاش کرے نہ رازِ عشق
جذب ہوئیں وہ بجلیاں ذرۂ خاک طور میں ۔۔۔ شکرِ خدا کہ ہو گیا حسن کو امتیازِ عشق
لطف و کرم نہ پوچھئے مجھکو امین دل کیا ۔۔۔ دل کو ازل میں کر دیا حسن نے سرفرازِ عشق
گردشِ دل رہے سدا حلقۂ زلفِ یار میں ۔۔۔ ختم نہ ہو خدا کرے سلسلۂ درازِ عشق

(از رسالہ "فانوس" جھانسی بابت جولائی ۱۹۲۷ء)

آہ و فغاں کے ساتھ جو درد نہاں ہے اب ۔۔۔ کیا کائنات عشق کا حاصل عیاں ہے اب
حد شکیب ٹوٹ گئی ہے فراق میں ۔۔۔ دھوکا ہے صرف صبر کی دنیا کہاں ہے اب؟
بالیں غم پہ روز تھی مرنے کی آرزو ۔۔۔ وہ آگئے تو منت عمر رواں ہے اب
روتا ہے کون کشتہ بیکس کی لاش پر؟ ۔۔۔ اک ہجر کی ہے رات جو نوحہ کناں ہے اب

تھا میں سرشار تغافل مجھے کچھ ہوش نہ تھا ۔۔۔ ورنہ یہ سبزۂ تربت لب خاموش نہ تھا
خفتہ بختوں کی کہانی تو وہ سنتے لیکن ۔۔۔ محو آرائش گیسو تھے انہیں ہوش نہ تھا

یہ طلاطم خیزی سیلاب موج زندگی ۔۔۔ اس میں پنہاں ہے مگر طوفان محشر دیکھئے

(از گلدستہ افضل مرتبہ افضل اکبر آبادی)

ہوں شمع بزم الفت اک شب کی زندگی ہے ۔۔۔ ہے ابتدائے غم میں انداز انتہا کا

(از نغمۂ جھانسی)

ضمیمۂ تبصرہ و تعارف "تختِ طاؤس"

جذباتِ لطیف

۱۔ تاثرات

ہاں تڑپ جائے تڑپتا دیکھکر قاتل مجھے | بجلیاں لا دے خدارا اضطرابِ دل مجھے
ہے ازل سے جستجوئے کوچۂ قاتل مجھے | زندگی میں چاہیئے آرام گاہ دل مجھے
زندگی کو میں سکونِ قلب پر کردوں نثار | چین لینے دے جو بربادِ تمنا دل مجھے
خاک پروانوں کی اُڑتی پھر رہی ہے بزم میں | اور کیا دکھلائے دیکھوں گرمیٔ محفل مجھے
کیا سمجھتا ہے مجھے نا آشنائے بحرِ غم | گھورتا ہے دور سے کیوں دیدۂ ساحل مجھے
خاکِ مجنوں سے بنے تھے میرے اجزائے حیات | روح نے محصور ہو کر کر دیا محمل مجھے
ہو گیا ظاہر مآلِ سوزِ غم افسوس ہے | میرے نالوں نے کیا شرمندہ محفل مجھے
میرے خونِ شوق کے دھبوں پہ پردے ڈالدے | حشر میں رسوا نہ کرائے دامنِ قاتل مجھے

آشنائے بحرِ غم ہوں ڈوبنے میں ہے نجات
موج نے سمجھائے کشتۂ ساحل مجھے

(از ماثر الشعراء مرتبہ حضرت نضیر علوی ایل۔ ایل۔ بی منصف مین پوری)

ہے جسمِ عنصری مرا وجہ فنا مجھے | یہ خاک میں ملے تو ہو حاصل بقا مجھے
بخشش بقدرِ وسعتِ ہمت ضرور تھی | پھر کیا گلہ جو رنج ملے ہیں سوا مجھے
چپکا کھڑا ہوں داورِ محشر کے سامنے | آتا نہیں تمہارے ستم کا گلا مجھے

موسم گرما کا آخری گلاب

یادگارِ موسم گل تھا چمن میں ایک پھول
اک ہوائے تند کے جھونکے سے مرجھایا ہوا
کچھ پریشاں حال سا افسردہ خاطر، دل ملول
پتّے پتّے سے نمایاں زردیِ رنگ فنا

مجمع یاران ہمدم ہو چکا تھا منتشر
تھے لب خاموش اس کے صد بیان مدعا
کر چکے تھے رخت ہستی چاک اسکے ہم سفر
ہو چکے تھے ترجمان رازِ ہستی و فنا

نوحۂ ماتم بنا تھا شور مرغانِ بہار
وعدہ حسن تبسم سے نہ تھا مٹنے کا ہوش
جب مٹانے پر ہوا آمادہ چرخ کج مدار
نہ دیا ٹھنڈا پیام مرگ نے نخوت کا جوش

دیکھ لی پامالی کشت چمن زار حیات
سامنے تھیں چند روزہ عمر کی رسوائیاں
سر سے پا تک محو حیرت تھا اسیر حیات
روکش آئینہ تاریخ فطرت پتیاں

تھی یہی بربادہستی زینت صحن چمن
روح فرسا ہے یہ انجام بہارِ کائنات
آج ہے یادِ حوادث سے جو محتاج کفن
ہے انہیں بکھرے ہوئے اوراق میں درس حیات

کون کر سکتا میری بربادیوں کا امتیاز
آج تک کس کو ہوئی انجام کی اپنے خبر
سرنگوں بھی ایک دن ہوگا جو ہے گردن فراز
آنکھ کھولی تھی کہ فطرت نے دیا حکم سفر

(از ایجوکیشنل گزٹ۔ جالندھر بابت ماہ مئی ۱۹۳۰ء)

اب تک نہ پتہ پایا اس دشمن ایمان کا ۔۔۔ یارب نہ کوئی مجھ سا مایوسِ تمنا ہو
للہ نہ ٹھکراؤ تم ناز سے قبروں کو ۔۔۔ محشر سے کہیں پہلے اک حشر نہ برپا ہو

(از اخبار عزیز ہند جھانسی)

پھر آرہا ہے اشک مسلسل کا قافلہ ۔۔۔ پھر ضبط دل ہے شکوۂ قاتل لئے ہوئے

طائر جاں مائل پرواز ہے ۔۔۔ آج ساماں شکست ساز ہے
آرہی ہے کیا صدائے بازگشت ۔۔۔ گل چمن میں گوش برآواز ہے
کہتی ہیں کلیاں چٹک کر باغ میں ۔۔۔ "دل میں جب تک ہے جبھی تک راز ہے"
اس نے مردوں کو جلایا کہہ دیا ۔۔۔ "یہ کوئی اعجاز میں اعجاز ہے"
دل پہ پھر بجلی گرے کی خیر ہو ۔۔۔ فتنہ ساماں پھر نگاہ ناز ہے
آپ بھی رکھ دیجئے دو چار پھول ۔۔۔ یہ مزار کشتۂ جانباز ہے

(از "عزیز ہند" اخبار جھانسی)

نظم نگاری پر توجہ کی اور موسم گرما کا آخری گلاب" کے عنوان سے ٹامس مور کی مشہور نظم "لاسٹ روز آف سمر" کے خیالات کو جس کا نثر ترجمہ جناب تنہا بی۔اے نے "شاعرانہ خیالات" نامی کتاب میں کیا ہے۔ جامۂ نظم پہنایا۔ وہو ہذا +

تاریخ

تختِ طاؤس

از

کشتہ قادری

۲۔ مصنوعات

یوسفستاں جہان حسن محشر دیکھئے — جنت وصل ایک طرف، ہجراں کا آذر دیکھئے
ہیں ملک سیرت غریق چاہ ذرف سامری — جادوے بابل نمائے چشم عبہر دیکھئے
دیدنی ہے جذر و مدبحر زخسار و موع — جذب ماہ روے رخشاں سنبر دیکھئے
انہام پوچ گوئی ہے سخن فہمی کمال — آئے ہر بیت میں معنی کا دفتر دیکھئے

(از گلدستہ افضل)

شور نشور ہستی ماکاں و مایکوں — کونین میں ہے ایک فقط دل لئے ہوئے
مجروح تیر ناز و ادا کے لئے نمک — چٹکی میں ہے ملاحت قاتل لئے ہوئے
کہتے ہیں لوگ میں نے جو برتی اسد کی طرز — "کشتہ ہے مہلانت کا قائل لئے ہوئے"

یہ تمام انتخاب باستثنائے غزل اولیں (بسلسلۂ تاثرات) وسط ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۹ء تک (دوراں تعیناتی جھانسی کالج) کے کلام کا ہے۔ ۱۹۲۵ء سے پہلے کا کلام جس میں نعتیہ حصہ زیادہ تھا نہ قلمی ہاتھ آیا اور نہ وہ رسائل دستیاب ہوئے جن میں کبھی کبھی مولانا کا کلام شائع ہوتا رہا +

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

مقدمہ



آج سے بارہ برس قبل یعنی ۱۹۱۶ء میں جبکہ میں اورنٹیل کالج۔ رامپور (یو۔پی)
کا ایک طالب علم تھا اور اضافۂ معلومات کے لئے عموماً اکثر کتبِ تاریخ و تذکرہ کا
مطالعہ کیا کرتا تھا، دورانِ مطالعہ میں نے دیکھا کہ اکثر یوروپین مصنفین اور سیاحوں نے
اپنا یہ اصول بنا رکھا ہے کہ ایشیائی ممالک کی صنعتوں میں جو کچھ خوبی نظر آئے۔ اس کو
کسی نہ کسی طرح یورپ سے منسوب کر دیں۔ چاہے اس سعی لاطائل میں ضمیر کے خلاف
انہیں کچھ ہی کیوں نہ کہنا پڑے۔ چنانچہ اور ممالک سے قطع نظر کر کے میں نے صرف
ہندوستان کی طرف نظر ڈالی تو اس کی اکثر شہرہ آفاق مصنوعات مجھے ایسی دکھائی
دیں جن کے متعلق انہوں نے ان رشحات سے کام لیا ہے کہ ان کی صنعتگری میں یورپی
صناعوں کی دستگاہ بہت کچھ شریک تھی +

ادھر چونکہ اہل یورپ کی آمد آمدِ ہندوستان سلاطینِ مغلیہ کے دور سے شروع ہوتی
ہے اس لئے انہوں نے مغلوں ہی کی تاریخ کو کہ تاریخ اسلام کا ایک زرین باب ہے۔ بہت
کچھ غلط کیا ہے۔ اور ان کی اس طرز عمل سے صرف یہی نہیں ہوا کہ مغلوں کی ہندوستانی
اقوام کے ساتھ رواداری، یگانگت، اپنی ملکی صنعت کے ساتھ مقامی صنعت و حرفت کی
تربیت اور دستکاروں کی حوصلہ افزائی پہ تاریک پردے پڑ گئے ہوں۔ بلکہ تاریخ تمدنِ

لے تو حضرتِ امیر خسروؒ کے تصدق میں پہلے ہی قائم ہو چکی تھی "درباری" نے اور بار پایا۔ مصوّری و روغن کاری (آئل پنٹنگ Oil Painting) نے ایک نئی طرز نکالی جو آج تک جاذب نظر اور "مغل اسکول" کے نام سے موسوم ہے۔ ہندوؤں کے منہ میں ایرانی اور مسلمانوں کے منہ میں ہندوستانی زبان پہنچکر ایک نیا رنگ لائی اور اُردو کہلائی۔ جس نے کیا ہندوستانی کیا ایرانی سب کی زبانوں پر دخل و تصرف حاصل کر لیا۔ انسانی رشتوں کے ساتھ ساتھ رنگا رنگ پیوندوں اور درختوں سے ہندوستان چمنستان بن گیا۔ سنگھاسن بتیسی کی پریوں اور مہابھارت کے سورماؤں کی طرح صدہا ہزارہا ہندوستانی تخیلات کی شاہکاروں نے ایرانی لباس پہن لیا +

زیورسازی، تعمیرات اور جواہر تراشی میں صدہا گوشے نکلے اور اس سلسلہ میں ایرانی تہذیب کا کہ مرقع نفاست تھی خصوصیت کے ساتھ بہت بڑا اثر پڑا۔ نور جہان نے جہانگیری وغیرہ بے شمار زیورات ایجاد و اختراع کئے۔ جن کی نقول آج تک یورپ سے بن کر آتی اور ہمیں عدم معلومات کی بنا پہ ایجادِ یورپ کا دھوکا دی جاتی ہیں +

تمام منصف مزاج ماہرینِ فن تعمیر اس امر پر متفق ہیں۔ کہ مغل عہد کی صنعت تعمیر میں ہندی اور ایرانی طرز تعمیر کا میل ہے اور اس طرح یہاں کی مصنوعات خالص ایشائی ذہانت، ذکاوت اور خوش مذاقی کا آئینہ ہیں +

اگر ہم غور کریں تو اکبر کے عہد میں ایرانیوں کی آمد شروع ہوتی ہے۔ اور جہانگیر و شاہجہاں کے زمانہ میں وہ اس کثرت سے ہندوستان پہنچ جاتے ہیں کہ یہاں کے بڑے بڑے شہروں کا محلہ محلہ خطہ ایران بن جاتا ہے۔ اور فن تعمیر بھی اسی رفتار کے دوش بدوش متاثر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان اثرات کا ثبوت پکار پکار کر ہمیں وہ عمارات دے رہی ہیں جو اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کی یادگار رہ ہیں۔

عالم کا سلسلہ درہم و برہم ہوگیا۔ اور ماہرینِ فنونِ لطیفہ نے عجیب و غریب رائیں قائم کیں۔ جیسے کہ بعض مبصرینِ فنِ تعمیر کی یہ رائے ہے کہ ہندوستانِ متوسط (اسلامی ہند) کی عمارات و دستکاری میں یوروپین صنعت و دستکاری کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اور اس طرح خالص ایشیائی تمدّن کے اجزائے ترکیبی میں خواہ مخواہ یورپ کا عنصر شریک ہوگیا ؀

حالانکہ بمقابلہ دوسرے مسلم فرمانروایانِ ہند کے مغلوں ہی نے ہندوستانی فنونِ لطیفہ کی ترقی میں جلیل القدر مساعی کیں۔ اور انہیں کے عہد میں تمدنِ ہند تمدنِ اسلام" سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ کیونکہ انہیں کو زیادہ اطمینان کے ساتھ یہاں کی حکومت میسّر آئی تھی علاوہ ازیں خود وہ اور ان کے امراء قدردان و قدرشناس علم و فن تھے۔ ان کی دریا دلی اور فیاضی کا شہرہ سن کر ملک ملک کے علماء، شعراء اور اہلِ ہنر آتے تھے۔ اور اپنے کمالات کے باعث سونے میں تولے جاتے۔ اور حوصلہ سے زیادہ انعام و اکرام پاتے تھے۔ اس لئے ان کا دربار عربوں، ایرانیوں، ترکوں مصریوں، ہندوستانیوں اور اقطاع و اطرافِ عالم کے باشندوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ انہیں کے عہد میں اس مجمع کے درمیان اتفاق و اتحاد کے دیوتا نے جو اکبر اعظم کی موہنی صورت میں (کہ حقیقی بانی دولتِ مغلیہ ہے) وجود پذیر ہوا تھا ایک عجیب و غریب ہولی کھیلی جس کی رنگین چھینٹوں سے ہر شعبۂ زندگی کچھ نہ کچھ رنگے بغیر نہ رہا۔ یعنی اس یکجائی کی بدولت رفتہ رفتہ تمدن ہند کے ہر شعبہ میں تمدن اسلام کی کہ تمدن عالم کے رنگا رنگ پھولوں کا ایک موزوں گلدستہ تھا۔ دلچسپ و نظر فریب گلکاریاں نظر آنے لگیں۔ ہم صرف چند امور کو مشتے از نمونہ خروارے پیش کرنا چاہتے ہیں ؀

موسیقی میں دھرپت کی جگہ قوّل و قلبانہ کے بہت سے راگ اور مردا راگ کی

جواہرات کی صنعت و دستکاری کے متعلق، جواہرات کو مختلف شکلوں میں تراشنے کے ساتھ سب سے اہم جو امر ہے وہ یہ کہ ان کو شش پہل، ہشت پہل اور ایسی ہی مختلف شکلوں میں اس خوبصورتی سے کاٹا جائے کہ سطوح، زوایا اور خطوط متناسب ہندسی شکل اختیار کریں +

یمنی جن کی امم عاد وثمود کا ذکر اور ارم ذات العماد کا اشارہ کلام مجید میں بھی ہے، ایک ایسی قوم گزری ہے جس نے تمام بڑی بڑی مشہور اقوام کی طرح دنیا میں اپنی عظیم الشان یادگاریں چھوڑیں۔ یہ قوم اپنے وطن مالوف سے اٹھ کر ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایران والوں سے اپنی ترقی میں ہم آغوش ہوئی اور ان قوموں کے باہم ربط ضبط سے دنیا میں عجیب وغریب صنعتیں پیدا ہوئیں۔ "الماس تراشی" جو یہودیوں کے لئے مخصوص ہو گئی تھی۔ فی الحقیقت انہیں اقوام کی یادگار ہے جن کے یہاں کان جواہر بکثرت موجود تھیں۔ اور "یہودیوں" ہی نے منتشر ہو کر یورپ والوں کو یہ صنعت پہنچائی۔ مسلمان (جن کو علمی، فنی و صنعتی میراث بیشتر شامیوں، کلدانیوں، یونانیوں، مصریوں اور ایرانیوں سے یا وسط ایشیا میں پہنچکر خطا و ختن کے باشندوں سے پہنچی) جو اس مخصوص صنعت کی ترقی میں فائز المرام ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ایرانیوں وغیرہ کی نہایت عجیب وغریب صنعتوں کے نمونے ان کے پیش نگاہ تھے۔ جن میں ترقی کر کے انھوں نے نئی تراش خراش پیدا کی +

ہندوستانی "جواہر تراشی" اور "نگینہ سازی" میں پہلے ہی سے خاصہ مذاق رکھتے تھے اور جواہرات سے کھڑاؤں، چھڑی، ڈبیا اور اس قسم کی بہت سی دوسری نادر، نایاب اور قابل تعریف اشیاء تیار کر لیا کرتے تھے +

ایرانی و ہندوستانی صناعوں کے میل جول نے جس طرح فن تعمیرات و خطاطی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اسی طرح فن جواہر تراشی و نگینہ سازی میں بھی ان کی

شاہجہانی عمارتوں (تاج محل، موتی مسجد (آگرہ)، قلعہ معلےٰ، جامع مسجد اور دیوانِ خاص وعام و مثمن برج (دہلی) میں جس نفاستِ مذاق اور سلامتِ طبع کا دَور دورہ ہے۔ وہ اکبری عہد میں تو بالکل عنقا ہے جس کی مثال فتحپور سیکری اور قلعہ آگرہ کے وہ محلات ہیں جو اکبر کے دَورِ حکومت میں تیار ہوئے۔ اور جہانگیری عہد میں اس کی آمد آمد کا پتہ چلتا ہے جس کی تمثیل سکندرہ، ایوانِ جہانگیری اور مقبرہ اعتماد الدولہ (آگرہ) ہے۔ اس راز کو ایک تاریخ دان بآسانی یوں منکشف کرسکتا ہے کہ جہانگیری عہد سے خاندانِ اعتماد الدولہ[1] کا رشتۂ اتحاد سلاطین مغلیہ سے شروع ہُوا اور اس کی "نورافشانیوں" نے عہدِ شاہجہانی میں یہاں تک "امتیاز" پایا اور ترقی کی کہ ایک ایک قریہ اس سے منور ہوگیا +

[1] اعتماد الدولہ:۔ خواجہ غیاث وزیر شہنشاہ جہانگیر کا خطاب ہے۔ یہ تاتاری النسل اور شیعی المذہب تھا۔ اکبر کے زمانہ میں ایران سے نہایت عسرت و پریشانی کی حالت میں ہندستان پہنچا۔ چونکہ ہمایوں کے سفر ایران کے زمانہ میں اس کے آباؤ اجداد نے خدماتِ شائستہ انجام دی تھیں اور خود بھی قابل آدمی تھا۔ لہذا اکبر نے اس کو رفتہ رفتہ دیوان بیوتات کے عہدے تک پہنچایا۔ عہدِ جہانگیری میں یہ خود "اعتماد الدولہ" کے خطاب سے مخاطب ہوکر وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر پہنچا ۔ اور اس کے دونوں بیٹے آصف خان اور اعتقاد خان کے خطاب پاکر امرائے شاہی میں داخل ہوئے نورجہاں بیگم جو جہانگیر کی محبوبہ اور اس کے پردے میں فرمانروائے ہندوستان تھی۔ اسی کی بیٹی تھی اور اس کی پوتی بنتِ آصف خان شاہجہان کی ملکہ تھی۔ جو ممتاز محل کے خطاب سے مخاطب ہوئی "تاج" (آگرہ) اسی بیگم کا مقبرہ ہے۔ آصف خان شاہجہان کے زمانہ میں "دیوان کل" تھا +

اعتماد الدولہ آگرہ سے بادشاہ کے ساتھ کشمیر جاتے ہوئے راستہ میں ۱۶۲۱ء میں فوت ہُوا۔ اس کی نعش آگرہ لائی ۔ اور جمنا کنارے دفن کی گئی۔ نورجہاں پہلے باپ کی قبر پر چاندی کا مقبرہ بنوانے والی تھی۔ مگر امراء کے سمجھانے بجھانے سے باز رہی اور ایک عالیشان مقبرہ بنوایا جو "اعتماد الدولہ" کہلاتا ہے۔ اس کے متعلق جو مشہور ہے کہ "تاج" کے بچے ہوئے مسالہ سے بنا غلط ہے کیونکہ وہ "تاج" سے پہلے بنا ہے +

اعتماد الدولہ مرزا غیاث انشا پردازی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ لکھنے پڑھنے میں وقت گزارتا تھا۔ خوش محاورہ، رنگین صحبت اور شگفتہ رو تھا اسکے متعلق جہانگیر کہا کرتا تھا "اسکی صحبت ہزارہا مفرح یاقوتی سے بہتر ہے"۔ اتنا سلیم النفس تھا کہ دشمن سے بھی عداوت نہ کرتا تھا شش ہزاری وسہ ہزار سوار کا منصب رکھتا تھا علم و نقارہ سے سرفراز اور حضور میں نقارہ بجانیکے اعزازِ مخصوص سے معزز تھا

کے معزز خطاب سے مخاطب کی جاتی ہے۔ یورپ کی سطح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ قریب قریب تمامتر "ازمنۂ رباعیہ" کی یادگار ہے۔ اور سوائے اس کے۔ کہ ہسپانیہ (اسپین) کی زمین "نوسائی و آتشی صخور" سے مل کر بنی ہے۔ ورنہ قریب قریب تمام یورپ کی بالائی سطوح پر "آبی صخور" پائی جاتی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہاں کوئلہ بکثرت ملتا ہے۔ اور چونکہ جواہرات قریب قریب سب ہی "صخور آتشی" کے تحت جگر ہیں۔ اس لئے یہ امر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ کہ جب اہل مغرب کے یہاں کانِ جواہر ہی نہیں تو انہیں اس زمانۂ ماضی بعید میں کان کنی، جواہر تراشی یا جواہرات کے تعبیہ و پیوند کی سلیم المذاقی میں دستگاہ کس طرح حاصل ہو جاتی؟ یہ اتنا مہتم بالشان مسئلہ ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے مصنفین یورپ اور ان کے عقیدت مندوں کی وہ تمام توجیہات باد ہوا نظر آتی ہیں، جو انہوں نے خالص ایشیائی مصنوعاتِ ہند کی ساخت میں اہل یورپ کی شرکت ثابت کرنے کے لئے وضع کر رکھی ہیں۔

ممکن ہے کہ بعض حضرات کو یہ خطور ہو کہ شاہجہان نے کوہ نور کو تراشنے کے لئے تو ہارٹینلو بارگس کو دیا تھا، جو امسٹرڈم کا باشندہ تھا۔ اس لئے یہ جواب قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ان حضرات کی تشفی کے لئے میں ایک تاریخی حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا ہوں۔

بنی اسرائیل یعنی قوم یہود نے دنیا اور دنیا کی ان تمام قوموں پر جو اُن کے قبضۂ قدرت میں تھیں۔ انتہا درجہ کے ظلم توڑے اور اس لئے "قہر ربانی" ان پر نازل ہوا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دنیا میں "من حیث القوم" یک جا ہو کر نہ رہ سکی۔ بلکہ منتشر ہو گئی۔ اور اس کے افراد جہاں جہاں گئے اپنی صنعت اپنے ساتھ لے گئے، چنانچہ کچھ والندہ (ہالینڈ) بھی پہنچے۔ قوم ولندیز نہایت آزاد خیال تھی۔ اس نے ان کو اپنے یہاں جگہ دی اور انہوں نے اپنی صنعت کو ہمیشہ قائم رکھا۔ یہ وہی یہودی النسل ولندیز ہیں جن کے یہاں سارے

ہنرشناسیوں اور ترکیبوں کے رنگا رنگ جوہر نمایاں ہوئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اِس عہد میں خاص طریقے سے ہمیں مختلف نگینوں کے وصل و پیوند کی وہ زر نگار کیفیت نظر آتی ہے۔ جو اس سے قبل قریب قریب معدوم تھی۔ "تاج" جس کو بالکل صحیح و بجا طور پر بعض مصنفین یورپ نے "سنگ مرمر کا خواب نوشیں" قرار دیا ہے جس پچیکاری کی عجیب و غریب صنعتوں سے مملو ہے یا تخت طاؤس جس جواہر تراشی، نگینہ سازی اور ترصیع کا زندہ معجزہ تھا۔ اس کی مثالیں دنیا میں کہیں نظر نہیں آتیں۔ اور یہ فی الحقیقت ایرانی استادوں کی استادی کا تصدق اور ہندوستانی کاریگروں کی عالی دماغی کا طفیل ہے +

تاریخی مذاق رکھنے والے حضرات شاید یہ خیال کریں کہ مغلوں کا دربار جو ایشیائی ماہرین علم و فن کا مرکز تھا، دانایانِ فرنگ سے بھی خالی نہ تھا۔ پس ایسی صورت میں یہ کس طرح ممکن ہے کہ ان کے کمالات کا اثر ہندوستانی صنعت پر نہ پڑا ہو۔ ان کے جواب میں سب سے پہلے تو میں فن تعمیر کے ایک یوروپین ماہر مسٹر ہیول کا قول نقل کروں گا وہ فرماتے ہیں

"مسلمانوں کے عہد حکومت میں جو عمارتیں بنیں وہ"
" ہندو کاریگروں اور دستکاروں نے بنائی ہیں"
" اور ان میں صنعت یورپ کا اثر نہیں دکھائی دیتا"

اور اس کے بعد ایک اصولی اور "سائنٹفک" جواب دونگا۔ جو یہ ہے کہ جب ہم "طبقات ارض" پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں "صخور" کی دو قسمیں نظر آتی ہیں۔

(۱) صخور آبی (۲) صخور آتشی

آبی صخور اکثر اوقات بالائی سطوح کے داب کی وجہ سے مصفاً و مجلی ہوکر "آتشی صخور" کے مثل منقلب ہو جاتی ہیں۔ اور اس طرح ایک تیسری قسم اور ظہور پذیر ہوتی ہے جو "جواہرات"

تخت طاؤس نام سے لے کر کام تک "خالص ایشیائی" فن تعمیر، جواہر تراشی۔ زیور سازی اور خطاطی کا مرقع، اسلامی تمدن و "تمدن ہند" کی ترکیب، جواہرات اور نگینوں کے تعبیہ، پیوند اور ترصیع، ہندو مسلم اتحاد، مغل فرمانروایانِ ہند کی رواداری اور ہندوستانی اقوام کے ساتھ ان کی یگانگت کا آئینہ اور زمانۂ متوسط ہند (اسلامی ہندوستان) کے فنون لطیفہ کی ترقی، سلاطین مغلیہ خصوصاً شاہجہان کے عہد کی سلیم المذاقی، دستکاری اور اپنے ہم قوموں، ہم مذہبوں اور قدیمی ہم وطنوں کی صنعت و حرفت کی تربیت کے قدم بقدم ہندوستانی صنعت و دستکاری کی سرپرستی کا جام جہاں نما ہی نہیں۔ بلکہ پائداری کے دوش بدوش نزاکت، باریکی اور موشگافی میں شہرۂ آفاق تاج سے بھی کہیں بالا و برتر تھا۔ اور جو رتبہ آج تاج کو حاصل ہے کہ دور دست ممالک سے لوگ اس کی زیارت کے لئے طرح طرح کی صعوبات سفر برداشت کر کے آگرہ آتے اور اس کی سیر کو اپنے لئے باعث اعزاز و افتخار جانتے ہیں، کبھی تخت طاؤس کو بھی حاصل تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر ہمارے مقصد کی تکمیل کے لئے وہ بیحد موزوں ہے +

اس تخت کے حالات کو یکجا کر دینے سے امور مصرحۂ بالا کے علاوہ "آئین دربار مغلیہ" اور اپنے ملک کے بادۂ غفلت سے سرشار اس نوجوان طبقہ کے سامنے ایک مرقع عبرت بھی پیش کر دینا میرا مطمح نظر تھا۔ جو ایک خاص وضع کی تاریخوں کے مطالعہ سے اپنی بصیرت کو کھوئے ہر امر میں خود کو محتاج و تلمیذ یورپ سمجھتے ہوئے پائے ہمت کو توڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھا ہے۔ دفاتر کی کرسیاں اس کی معراج نظر ہیں اور تعلیم سے اس کی غرض و غایت خود کو دفتری مشین کا ایک چلتا ہوا پرزہ بنانا۔ وہ صنعت و دستکاری کی فارغ البال، مطمئن، باعزت اور آزاد زندگی کی مسرتوں کو ملازمت کی عسرت آمیز پابندیوں پہ قربان کر دینا عین عقلمندی اور داخل وضعداری جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حالات جو اس کے بزرگوں کے شاندار کارنامۂ حیات

یورپ کے جواہرات اور الماس، تراش خراش کی غرض سے پہنچتے تھے۔ انہیں میں سے کچھ لوگ شاہجہان کے دربار تک پہنچے تھے۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں اقوام یورپ میں ولندیزی بھی بسلسلۂ تجارت ہندوستان میں موجود تھے۔ اور آج بھی یہ صنعت ہالینڈ ہی تک محدود ہے۔ اور گو اور اقوام بھی اس میں ساعی ہیں۔ مگر اب تک ان کو وہ درجہ حاصل نہ ہؤا۔ اس طرح میرا مذکورہ بالا بیان قطعی صحیح ہے +

ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہؤا کہ دورِ حکومت مغلیہ کے "ہندوستانی فنون لطیفہ" پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے فی الجملہ فن تعمیرات، زیور سازی اور جوہر تراشی کی ترقی، ان میں "تمدن اسلام" کے آثار پر تبصرہ اور غلط فہمی پھیلانے والی روایات کی تنقید و تصحیح کر دی جائے۔ تاکہ نبّاضان تمدن و تہذیب شاہراہ تحقیق و تفتیش میں گمراہ نہ ہوں +

اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے میں نے تخت طاؤس اور اس سے ایک خاص تعلق رکھنے والے کوہ نور ہیرے کو انتخاب کیا۔ کیونکہ تاج کے منظرِ عام پر واقع اور اس تک ہر کہ ومہ کی رسائی ہونے کے باعث اس پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی جا چکی ہے اور بہت سے منصف مزاج یوروپین اور ملکی اہل قلم حضرات دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے دکھا چکے ہیں۔ لیکن تخت طاؤس و کوہ نور چونکہ عموماً خزانوں کے گوشوں میں مکتوم رہے۔ یا دربار میں عام نظروں سے مستتر، اس لئے ان کی طرف خاص طور پر کسی نے توجہ نہیں کی اور خصوصاً تختِ طاؤس کی جانب جو انقلاب زمانہ اور حوادثِ روزگار کا شکار ہو کر تبدیل ہیئت بھی کر چکا۔ اور اس کے رقیب شہرت، لوگوں کو عجیب و غریب مغالطے دے رہے ہیں اور اسی وجہ سے اب تک اس کے حالات پر گہرا پردہ پڑا ہؤا ہے، اور جو کچھ منتشر حالات میسّر آتے ہیں۔ وہ ہماری بیان کردہ یوروپین مصنفین کی عادتِ مخصوص کا مظہرِ اتم ہیں +

۱۹۲۲ء میں میں سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں منسلک ہوکر گورنمنٹ ہائی اسکول باندا میں تعینات ہوا +

باندا ایک عجب بد مذاق مقام تھا۔ کہ وہاں نہ تو کوئی شخصی کتب خانہ ہے۔ اور نہ پبلک لائبریری۔ اس لئے قریب قریب دو (۲) سال تک میں وہاں سوائے موجودہ یادداشتوں پر غور و فکر کرنے کے اور کچھ نہ کرسکا +

مئی ۱۹۲۴ء میں میرا تبادلہ گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج۔ جھانسی کو ہوا۔ اور گو یہ مقام بھی آثار علمیہ کی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ مگر پھر بھی یہاں کی بلدیہ کی قائم کردہ پبلک لائبریری اور گورنمنٹ کالج کا کتب خانہ اپنے اراکین کی خوش مذاقی کے باعث ایک تشنۂ تحقیق کی بہت کچھ پیاس بجھا سکتا ہے۔ اور ریلوے کا عظیم الشان مقام اتصال (جنکشن) ہونے اور مختلف سمتوں میں متعدد ٹرینوں کے آنے جانے کی وجہ سے یہاں ایک بہت بڑی سہولت یہ ہے کہ ایک تلاشکار بہت سے اُن مقامات تک جہاں متعدد کتب خانے اور عجائب خانے موجود ہیں، بہت تھوڑا وقت صرف کرکے آمد و رفت جاری رکھ سکتا اور وہاں کے تاریخی آثار و ذخائر سے استفادہ کرسکتا ہے +

جھانسی پہونچکر میرا جنون دیرینہ رنگ لایا اور میں نے گوالیار، آگرہ، دہلی، جے پور، سانچی، بھوپال، کانپور اور لکھنؤ کی خاک چھاننا اور وہاں کی لائبریریوں کی کتابیں ٹٹولنا اور عجائب خانوں میں رکھی ہوئی اشیاؤ، تصاویر وغیرہ پر غور و فکر کرنا شروع کردیا +

قصہ مختصر کوہ نور کے حالات کو ایک مضمون کی شکل میں مرتب کرکے میں نے سررشتۂ تعلیمات ممالک متحدہ کے علمی و ادبی مجلہ "ایجوکیشنل گزٹ" لکھنؤ کے جنوری فروری نمبر بابتہ ۱۹۲۵ء میں شائع کرادیا۔ مگر تخت طاؤس کی داستان تھی کہ پیچیدہ ہی

کا مجموعہ ہیں اس کے لئے درسِ عبرت ثابت ہوں۔ اور وہ مائل بہ صنعت و حرفت ہو کر عالم صنعت میں "بھارت ورش" کا ایک بار پھر بول بالا کردے۔ کیونکہ دنیا کے بہت سے لوگوں نے "ہمارے بزرگ اور ان کے کارنامے کیا تھے؟ ہم اور ہمارے کرتوت کیا ہیں؟" کا مقابلہ کرکے دنیا میں بڑے بڑے موثر کام کئے۔ اور حیاتِ جاوید کا لطف اٹھایا ہے ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما (حافظ شیرازیؒ)

میں نے کتاب ہذا کی تیاری کے متعلق ضروری یادداشتیں تو رامپور ہی میں قلمبند کرنا شروع کر دی تھیں۔ مگر بہت کچھ سرمایہ "شعیب محمدیہ ہائی اسکول" آگرہ کی ملازمت کے دوران (۱۹۱۸ء لغایت ۱۹۲۲ء) میں جمع کیا۔ اور اس معاملہ میں "شعیب اسکول" کی مربی "انجمن محمدیہ" کے "اسلامی عجائب خانہ اور کتبخانہ محمدیہ" نے میری زبردست معاونت کی۔ یہ کتب خانہ انجمن مذکور کے سکرٹری مولوی سعید احمد مارہروی (صاحب امرائے ہنود) کی خوش مذاقی اور تاریخی دلچسپی کی وجہ سے بیش بہا، نادر اور نایاب تاریخی ذخیرے پر مشتمل ہے +

جون ۱۹۲۱ء میں جبکہ میں بڑی سرگرمی کے ساتھ تخت طاؤس اور کوہ نور کے حالات جمع کرنے میں مصروف تھا۔ مجھے "شعیب اسکول" کی جانب سے ایک وفد میں شامل ہو کر حیدر آباد (دکن) کا سفر کرنا پڑا۔ اس سلسلہ سفر میں میں نے حیدر آباد، گولکنڈہ، جالنہ، اورنگ آباد، خلد آباد، دولت آباد (دیوگری)، ایلورا اور بمبئی وغیرہ کی سیاحت کے علاوہ ان مقامات پر جہاں جہاں آثار قدیمہ، عجائب خانے اور کتب خانے تھے۔ ان کی بھی سیر کی۔ یہ سفر میرے پیش نظر مضمون کی تکمیل کے لئے آیۂ رحمت تھا۔ جس کے دوران میری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوا +

ان پر ایک نظر میں رائے قائم کر لینا اور قیام رائے کے وجوہات کو تلاش کر لینا یا واقعات کے علل و اسباب معلوم کر لینا اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس لئے میں نے بیشمار جدید و قدیم تاریخی کتابیں، تذکرے، رسائل، اخبارات اور یادداشتوں کو لفظ لفظ کر کے پڑھا ہے۔ ہر واقعہ کو مختلف مورخین قدیم و جدید کے یہاں دیکھ کر اور مختلف فیہ امور کے متعلق ایک معیار مقرر کر کے قائلین کے بیانات کو پرکھا ہے۔ اور پھر ذاتی قیاس و اجتہاد کے مطابق جس کو شواہد تاریخی سے سرحد یقین تک پہونچا دیا ہے حوالہ قلم کیا ہے۔ اور اسی سلسلہ میں جا بجا مشرقی و مغربی مورخین کے تاریخی اشتباہات و اغلاط کی تصحیح اور مغربی مورخین کے سرتا پا غلط بیانات کی تحقیق و تنقید بھی کی ہے اور ہر امر کی چھان بین کرنے میں حتی الوسع کمی و کوتاہی کو دخل نہیں دیا ہے۔ تب کہیں اس جامعیت کے ساتھ اس تخت کے حالات پیش کرنے میں (بخیال خود) کامیاب ہوا ہوں ؎

یوں لائے، واں سے ہم صد دل صد پارہ ڈھونڈکر
دیکھا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا، اٹھا لیا (للا اعلم)

گو دوران تنقید میں نے خود کو غیر جانب دار رکھا ہے۔ مگر نہیں عرض کر سکتا کہ اس امر میں میں کہاں تک کامیاب ہوا +

تنقید اور جمع واقعات کے ذیل میں میں نے عموماً امراء، درباریوں اور اس زمانہ کے مورخین کے بیانات کو مغربی مورخین اور سیاحوں کے بیانات پر ترجیح دی ہے اور جس امر میں وہ خاموش ہیں اور اس کا کسی مذہبی و سیاسی مسئلہ سے تعلق بھی نہیں ہے، قوم پرستی و جنبہ داری کا شک بھی نہیں ہوتا ہے اور قرین قیاس بھی ہے۔ اس کو مغربی مورخین کے یہاں سے لے لیا اور موثق و معتبر تصور کر لیا ہے اور چونکہ اس تاریخ کو مغل سیاسیات و ہندوستانی مذہبیات سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ اس لئے

ہوتی چلی جاتی تھی۔ بالآخر پرنسپل صاحب کالج کی فرمائش پر آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں سنانے کے لئے جو نومبر ۱۹۲۸ء میں بمقام لاہور منعقد ہونے والا تھا۔ میں نے اس کے حالات کو ایک بسیط مضمون کی شکل میں جولائی ۱۹۲۸ء میں مرتب کرہی دیا۔ جس کو کانفرنس میں پڑھنے کے لئے ازراہ قدردانی وحوصلہ افزائی عالی جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتۂ تعلیمات یو۔پی نے مجھے رخصتِ مخصوص عطا فرمائی مگر "تدبیر کند بندۂ و تقدیر زند خندہ" تواریخ اجلاس سے چند ہی روز پیشتر دفعتاً میں علیل ہوگیا۔ اور شرکت نہ کرسکا اور اب باضافہ حواشی مجموعی طور پر کم وبیش سات سال تک تاریخوں کی ورق گردانی اور عجائب خانوں کی خاک چھاننے کے بعد بدالنست خود آج اس تخت کے مکمل حالات کتابی شکل میں اردو دان پبلک کے سامنے پیش کررہا ہوں۔

یہ کتاب گو باب در باب نہیں اور اس کے مضامین مختلف عنوانات کے تحت میں ہیں۔ مگر پھر بھی وہ سات بسیط حصص پر منقسم ہوسکتی ہے۔

(۱) مختصر سوانح شاہجہان، اس کا مذاق، تخت طاؤس بنوانے میں اس کا نقطۂ نظر۔
(۲) ساخت اور مہتمم ساخت "تخت طاؤس"۔
(۳) ہیئت، بیانِ اجزا و تنقید تصاویر "تخت طاؤس"۔
(۴) تخمینۂ مصارف۔
(۵) یہ تخت کب کب، کہاں کہاں اور کس کس کے قبضہ میں رہا؟
(۶) موجودہ حالت "تخت طاؤس"۔
(۷) "تخت طاؤس" کے رقیب شہرت۔

مجھے اس تخت کے حالات قلمبند کرنے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کو کچھ میرا ہی دل خوب جانتا ہے۔ چونکہ ہماری قدیم تاریخیں عموماً واقعات کی فہرستیں ہیں اور ان میں بے شمار تاریخی اشیا و اشخاص کے حالات اس طرح پھیلے پڑے ہیں کہ

ارسال کئے - مولوی احسان اللہ خان صاحب ایم - اے - ایل - ٹی اور بابو جودھیا پرشاد صاحب بی - اے - ایل - ٹی - مولوی ریاض علی صاحب فاضل اور مولوی افتخار حسین صاحب ایم - اے - ایل - ایل - بی (اسسٹنٹ ماسٹران گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی) کا جنھوں نے کتابیں دیکھ دیکھ کر بہت سا مواد بہم پہنچایا - اور مرزا علی احمد صاحب و مولوی ابو البقا صاحب بی - اے - ایل - ٹی (اسسٹنٹ ماسٹران گورنمنٹ کالج جھانسی) کا جنھوں نے ترتیب مضامین کے متعلق مجھے بہت موزوں مشورے عنایت فرمائے - یہ صاحبان میرے دلی شکریہ کے مستحق ہیں - بڑی ہی ناشکری ہوگی - اگر اس سلسلہ میں میں اپنے عزیز ترین دوست بابو سعید الزمان صاحب شرر اکبر آبادی (کلرک ریلوے سٹور جھانسی) بابو رفیق احمد صاحب چیف کلرک اور منشی حسین الدین کلرک محکمہ ریلوے جھانسی کا شکریہ ادا نہ کروں کیونکہ موصوفین نے مجھے بعض اہم کتابیں بہم پہنچائی تھیں *

اس شکر گزاری کے دوش بدوش مجھے اس شکوہ نگاری پر افسوس ہے - کہ بعض حضرات سے میں نے استفسارات کئے - اور انہوں نے میرے سوالات پر روشنی ڈالنا تو درکنار رسید خط سے بھی شاد نہ کیا - خیر ؎

سفینہ جبکہ کنارہ پر آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہئے (غالب)

دیکھئے ہمارا ملک کبتک ان مہذب ممالک کا ہم پایہ بنتا ہے - جن کے کسی اہلِ علم و فن سے اگر کوئی سوال کر دیا جائے - تو وہ اس کے ما فیہ و ما علیہ پر اتنی روشنی ڈال دیتے ہیں - کہ سائل کو پھر ضرورتِ سوال رہنا تو ایک طرف اس کی معلومات میں بیش قرار اضافہ اور ہو جاتا ہے *

اس کے بعد میں طریقۂ پارینہ کے خلاف کتاب ہذا کا مطالعہ کرنے والے حضرات سے یہ عرض کروں گا - کہ وہ اس میں جو سقم اور خرابیاں پائیں ان کی کھلی ہوئی تنقید

قریب قریب ایسا ہوا ہی نہیں۔ الا بعض بعض ان مقامات پر جہاں مغربی مصنفین نے تعصب قومی سے ایشیائیوں کی صنعت پر پانی پھیرا ہے۔ ایسے مواقع پر بھی ان کے بیانات کی تردید حتی الامکان انہیں کی قلموں یا واقعات تاریخی کی بنا پر کی گئی ہے +
پائیں صفحہ حوالہ جات دے دیئے گئے ہیں۔ اور شروع میں ان تمام کتابوں کے نام مع اسمائے مصنفین د توضیح زبان لکھ دیئے گئے ہیں۔ جن سے یہ کتاب ماخوذ ہے +
متن کی طرح اس کتاب کے حواشی بھی میرے حقیقی نقطۂ نظر (تصحیح و تنقید روایات مصنفین یورپ) کے مظہر ہیں، جن کی کثرت اور متن سے زیادتی بعض نازک مزاج حضرات کو غالباً گراں گزرے گی۔ مگر میں نے فہرست مضامین کے بعد فہرست حواشی حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے گویا کتاب ہذا سے جداگانہ ایک چھوٹی سی کتاب المعارف (بک آف نالج") اس کتاب میں اور شامل کر دی ہے۔ جو قسم در قسم فوائد تاریخی پر مشتمل ہے۔ اور ایک ایسی زبان کے لئے جو "انسائکلوپیڈیا" سے عاری ہو۔ سود مند ثابت ہوگی۔ شاید میری یہ سعی ناچیز اس شکایت کو رفع کر سکے +
اب مجھے ان احباب اور بزرگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ جنہوں نے اس کتاب کی تالیف و تدوین میں میری امداد فرمائی۔ خصوصاً مولوی سید منظور علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی (ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈا) مولوی سعید احمد صاحب مارہروی (سکرٹری انجمن محمدیہ آگرہ) مولوی میر مہدی حسین صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی (ہیڈ ماسٹر اور) مولوی بشارت حسین خان صاحب آفریدی و مولوی عبدالرشید خانصاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (اسسٹنٹ ماسٹران شعیب ہائی اسکول آگرہ) سید ماجد علیصاحب دریابادی سی۔ ٹی (اسسٹنٹ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علیگڈھ) شیخ اطہر حسین صاحب قریشی، مشیر احمد صاحب علوی، ایثار الحق صاحب، کلیم الدین احمد صاحب علوی (متعلمین مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) کا جنہوں نے ضروری مضامین کی نقلیں اور تراجم

فہرست حوالہ جات "تاریخ تختِ طاؤس"

(الف)

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مولفین	کیفیت
۱	آبحیات	اردو	شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی	
۲	آثار الصنادید	"	سر سید احمد خان کے سی۔ ایس آئی ایل۔ ایل۔ ڈی	
۳	ارض تاج	"	واحد یار خان اکبر آبادی۔ بی۔ اے مدیر روزنامہ "نئی روشنی"۔ الہ آباد	
۴	امرائے ہنود	"	منشی سعید احمد مارہروی۔ مینجر شعیب ہائی اسکول آگرہ	
۵	اناجیل	"	شائع کردہ بائیبل سوسائٹی اور ریلجس بک سوسائٹی	
۶	بڑی جنتری بابتہ ۱۸۹۴ء	"	مرتبہ محمد رحمت اللہ رعد کانپور	
۷	تاریخ ہند	"	شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ دہلوی	یہ تاریخ تیرہ جلدوں میں ہے اور ہر ایک کا نام علیحدہ علیحدہ ہے

کریں۔ تاکہ میں اپنی کوتاہیوں سے مطلع ہو جاؤں۔ اور ناظرین دوسرے ایڈیشن کے انتظار کی تکلیف اٹھائے بغیر استفادہ کر سکیں ٭

محمد عبداللطیف خان کشتہ قادری فیضی فاضل
(آنرز ان پرشین) پی۔ ایل۔ ای (ایڈوانسڈ ان اُردو)

گورنمنٹ انٹر کالج جھانسی (یو۔ پی)
۱۰۔ مارچ ۱۹۲۹ء

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنّفین و مؤلّفین	کیفیت
۱۶	دربار اکبری	اُردو	مولانا آزاد دہلوی	
۱۷ الف	سوانح اورنگ زیب	"	مترجمہ لطیف احمد بی - اے ایل - ایل - بی	اصل کتاب "لین پول" کی تصنیف ہے -
۱۷ ب	سیر المصنفین	"	محمد یحیٰی تنہا بی - اے - ایل - ایل - بی	
۱۸	شعر العجم	"	علامہ شبلی نعمانی	
۱۹	شعر الہند	"	مولانا عبدالسلام ندوی	
۲۰	عالمگیر اورنگ زیب پر ایک نظر	"	علامہ شبلی نعمانی	
۲۱	قصص ہند	"	مولانا آزاد دہلوی	
۲۲	قاموس المشاہیر	"	نظامی بدایونی	
۲۳	مختصر تاریخ ہند	"	محمد عنایت اللہ بی - اے	
۲۴	وقائع سیاحت برنیر	"	خلیفہ محمد حسین صاحب	سفرنامہ برنیر کا اُردو ترجمہ

رسائل اور اخبارات اُردو

۲۵ (۱) "ایجوکیشنل گزٹ" لکھنؤ - بابت جنوری - فروری ۱۹۲۵ء

۲۶ "پیمانہ" آگرہ " ستمبر ۱۹۲۵ء

۲۷ "حسن" حیدرآباد " نومبر ۱۸۹۱ء (از مضمون حقیقۃ الالماس" مولانا تمنائی)

۲۸ "صبح صادق" جھانسی " نومبر - دسمبر ۱۹۲۶ء

۲۹ "فانوس" جھانسی " جنوری ۱۹۲۷ء

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مولفین	کیفیت
				کتاب ہذا میں اس کتاب کی جلد ششم "کارنامۂ جہانگیری" اور جلد ہفتم "ظفر نامۂ شاہجہان" سے زیادہ کام لیا گیا ہے +
۸	تاریخ ہند	اُردو	ڈاکٹر ایشری پرشاد ایم۔اے رکن شعبہ تاریخ الہ آباد یونیورسٹی	
۹	"	"	ای مارسڈن بی۔اے سابق انسپکٹر مدارس	
۱۰ الف	تاریخ آگرہ	"	منشی سیتل چند	
۱۰ ب	تاریخ اسلام	"	مولوی احسان اللہ عباسی	
۱۱	جہانگیر اور اسکی توزک	"	علامہ شبلی نعمانی	
۱۲	جہان آرا	"	مولوی محبوب الرحمن کلیم بی۔اے ایل۔ایل۔بی	
۱۳	حیات صالح	"	منشی سعید احمد مارہروی	
۱۴	حیات نورجہاں	"		
۱۵	خیابان فارس جلد (۱)	"	مترجمہ ظفر علی خان بی۔اے مدیر روزنامہ "زمیندار" لاہور	لارڈ کرزن کی کتاب "پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن" کا نامکمل ترجمہ ہے +

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مولفین	کیفیت
۴۲ الف	سیر المتاخرین	فارسی	علامہ طبا طبائی	اس کو حواشی میں کہیں کہیں "سیر" لکھا گیا ہے
۴۳ ب	شاہجہاں نامہ	"	عنایت خان	
۴۴	طبقات اکبری	"	نظام الدین بخشی	
۴۵	عالمگیر نامہ	"	مرزا محمد کاظم	
۴۶	کلمات طیبات	"	مجموعہ خطوط اورنگ زیب	
۴۷	منتخب التواریخ	"	ملا عبد القادر بدایونی	
۴۸ الف	مآثر الامراء	"	میر عبد الرزاق شاہنواز خان خوافی	حواشی میں کہیں کہیں اس کو "ماثر" لکھا گیا ہے
۴۸ ب	منتخب اللباب	"	محمد ہاشم المعروف بہ خافی خان	

لغات اردو، عربی اور فارسی جن سے کتاب ہذا میں امداد لی گئی

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مولفین	کیفیت
۴۹	برہان قاطع			
۵۰	غیاث اللغات		ملا غیاث رامپوری	
۵۱	نفائس اللغات			
۵۲	المنجد	عربی	باب یسوعی۔ بیروت	
۵۳	بہار عجم	فارسی	ٹیک چند بہار	

۳۰	"نیرنگ خیال"	لاہور عہد نمبر بابت ۱۹۲۲ء
۳۱	"حسن"	حیدرآباد ،، ستمبر ۱۸۹۰ء (از مضمون" نادر شاہ اور اس کی تعجب انگیز کامیابی سید آغا حیدر"

(ب) اخبارات :-

۳۲	"العدل"	بدایون	۱۹- مارچ ۱۹۲۶ء
۳۳	"آگرہ اخبار"	آگرہ	۷- نومبر ۱۹۲۸ء
۳۴	"ترجمان"	جھانسی	۲۳- اکتوبر ۱۹۲۷ء
۳۵	"ہمدم"	لکھنؤ	۱۴- ستمبر ۱۹۲۵ء

	(ب) اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مولفین	کیفیت
۳۶	آئین اکبری	فارسی	علامہ ابوالفضل	
۳۷	اقبال نامہ و بادشاہنامہ	،،	معتمد خان و ملا عبدالحمید لاہوری	
۳۸	توزک جہانگیری	،،	جہانگیر۔ شائع کردہ سرسید مرحوم	
۳۹	تذکرہ سرخوش	،،	ملک الشعرا سرخوش	
۴۰	تاریخ عالمگیری المعروف بہ تاریخ عاقل خان	،،	میر عسکری المخاطب بہ عاقل خان	
۴۱	تاریخ فرشتہ	،،	ابوالقاسم۔ فرشتہ	
۴۲	جہانگیر نامہ	،،	جہانگیر	
۴۳	خزانہ عامرہ	،،	علامہ آزاد بلگرامی	
۴۴	داستان ترکتازان ہند	،،	مرزا نصراللہ فدائی المخاطب بہ دولت یار جنگ بہادر	

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مولفین	کیفیت
۶۸	ہسٹری آف انڈیا	انگریزی	مسٹر ونسنٹ اسمتھ	
۶۹	"	"	کرنل وڈ	
۷۰	"	"	ٹامس رو	
۷۱	ہسٹری آف جہانگیر	"	بابو بینی پرشاد ایم-اے	
۷۲	ہسٹری آف انڈیا	"	مسٹر الفنسٹن	

انگریزی اور سنسکرت لغات

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مولفین	کیفیت
۷۳	اورنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری	انگریزی	ٹی - ڈبلیو - بیل	
۷۴	انسائیکلوپیڈک ڈکشنری	انگریزی		مطبوعہ کیسل کمپنی
۷۵	ٹوانٹی اینتھ سینچری ویبسٹر ڈکشنری	"		
۷۶	ڈکشنری فریزا اینڈ فیبل	"		
۷۷	رائل ڈکشنری	"		
۷۸	سنسکرت انگلش اسٹینڈرڈ ڈکشنری	انگریزی اور سنسکرت		

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین و مولفین	کیفیت
۵۴	اورنگ زیب	انگریزی	ڈاکٹر جادو ناتھ سرکار	
۵۵	ہسٹری آف انڈیا	"	سر ایچ۔ایم۔ ایلیٹ اور پروفیسر جان ڈاؤسن	یہ کتاب ایلیٹ ڈاؤسن بھی کہلاتی ہے۔
۵۶	انسائکلوپیڈیا برٹانکا	"		
۵۷	بک آف نالج	"		
۵۸	پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن	"	لارڈ کرزن	
۵۹	چیمبرس انسائکلوپیڈیا	"		
۶۰	سفرنامہ ڈاکٹر برنیر	"	مترجمہ مسٹر اروِنگ برک	
۶۱	" "	"	مترجمہ مسٹر اے کانسٹبل	
۶۲	گریٹ مغل	"	ڈاکٹر سرکار	
۶۳	لیٹر مغل	"	مسٹر ولیم ارون	
۶۴	لون اگزبیشن آف انٹی کوئٹیز کارونیشن دربار ۱۹۱۱ء			
۶۵	مڈیول انڈیا	"	مسٹر لین پول	
۶۶	"	"	ڈاکٹر ایشوری پرشاد	
۶۷	منوچی اسٹوریا ڈوموگور	"	منوچی	

تخت طاؤس

ہندوستان کی دلکشی

سرزمین ہند اپنی سرسبزی، شادابی، زرخیزی اور گوناگوں دلفریبیوں کی وجہ سے ہمیشہ دیگر اقوامِ عالم کی جاذبِ نظر اور اس کی تسخیر ان کا نصب العین رہی ہے۔ اور یہ اس کی دلفریبی ہی تھی کہ اسے اکثر ایشیا اور یورپ کے بادشاہوں کا جولانگاہ بنا کے رہی اور جو یہاں آیا یہیں کا ہو رہا۔ لیکن چونکہ قدرت نے طبائع اور مذاق جداگانہ بنائے ہیں۔ اس لئے ان آئے دن آنے والے فتحمندوں اور اولو العزم بادشاہوں کی الگ الگ یادگار ایک جداگانہ حیثیت سے ہندوستان میں جلوہ فگن ہے۔ جس سے سارا ہندوستان مملو ہے ؛

سلاطین مغلیہ

چونکہ ہم شاہانِ مغلیہ کی ایک مٹی ہوئی یاد کو تازہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے اور دوسرے فاتحین و سلاطین سے قطع نظر کر کے ہمارا بیان صرف اسی خاندان کے بعض فرمانرواؤں کی بابت ہو گا۔ جن کی سطوت کا دور دورہ ہمارے موجودہ حکمران فاتحین سے پہلے صدہا برس تک ہندوستان میں رہ چکا ہے۔ گو زمانہ نے اپنی عادت

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین ومولفین	کیفیت

انگریزی اخبارات ورسائل

نمبر شمار	اسمائے کتب	زبان	اسمائے مصنفین ومولفین	کیفیت
۷۹	دی السٹریڈ ویکلی آف انڈیا ۱۵۔ستمبر ۱۹۲۹ء	انگریزی		
۸۰	انڈین نیشنل ہیرلڈ	"		
۸۱	فیلڈ	"		

عالم کچھ سے کچھ ہو گیا۔ مگر ان کی تہذیب و تمدن کا اثر آج تک سارے ہندوستان پر چھایا ہوا ہے۔ ان میں سے چند اولوالعزم بادشاہوں کی تاریخ کا لب لباب چند فقروں میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ بابر نے تو سلطنت ہند کی داغ بیل ڈالی، ہمایوں نے بنیاد کھودی اور ساز و سامان جمع کیا۔ اکبر نے اس پر عظیم الشان قصر حکومت تعمیر کیا، جہانگیر نے اس کی زیب و زینت میں عمر گزاری، شاہجہان نے اطمینان سے بیٹھ کر چین کئے، لطف اٹھائے، شہرتِ عام اور بقائے دوام کے پھریرے اڑائے، اور اورنگ زیب عالمگیر نے ہر کمی کو پورا کر دیا ٭

فی الحال ہم ان میں سے صرف شاہجہان کے متعلق جو دودمان تیموریہ کا پانچواں فرمانروائے ہند تھا مختصراً کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں ٭

شاہجہان

شاہجہان جس کا نام انتظام و انصرام، حکمرانی و فرمانروائی، رعایا پروری و عدل گستری، تربیت علم و فن، بے تعصبی و صلح جوئی اور جاہ و مرتبت غرض ہر حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھا جاتا ہے۔ وہ ایک اقبالمند، نفیس مزاج، جدّت پسند، جدّت طراز اور طبیعت دار بادشاہ تھا۔ وہ تزک و احتشام کے ساتھ زندگی بسر کرنے، عمارتیں بنوانے اور باغات لگانے کا بیحد شائق تھا۔ تاج محل (آگرہ) جو اس کی چہیتی بیگم نواب ممتاز محل اور خود اس کی ابدی خواب گاہ اور عجائبات عالم میں شمار ہونے والی دنیا کی عدیم المثال عمارت ہے، اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ قلعہ معلّی، جامع مسجد (دہلی) اور موتی مسجد (آگرہ) جو دنیا کی حیرت انگیز عمارتیں ہیں اسی کی تعمیر کردہ ہیں۔ حیات بخش، فیض بخش اور شالامار نامی ہندوستان کے مشہور و معروف پُر فضا باغ اسی کی طبع رنگین کے ترتیب دادہ ہیں۔ لیکن آنی جانی دنیا میں یہ

کے موافق آج ان کا وجود اس صفحۂ ملک سے جس پر وہ صدیوں فرمانروائی کرتے رہے تھے مٹا دیا۔ تاہم ان کے کارنامے ایسے نہ تھے جو ان کی عارضی ہستی کی طرح ناپید ہوجاتے ؎

سعدیا! مرد نکو نام نمیرد ہرگز
مردہ آنست کہ نامش بہ نکوئی نبرند

اپنی قدردانی، صنعت نوازی اور نکتہ سنجی کے باعث ان کی سرپرستی نے علوم و فنون اور صنعتوں کے دریا بہا دیئے۔ ان کے عہد کی تاریخیں، تذکرے، تصانیف، ایجادات، اختراعات، عمارتیں اور دیگر متنوع الاقسام آثارِ قدیمہ آج تک جبکہ انہیں خواب عدم میں سوئے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں بزبانِ بے زبانی ان کی تربیت علم و فن اور ان کی شوکت پارینہ کی داستان سرائی کر رہے ہیں اور آنے والی نسلوں کے سامنے ان کی تہذیب کا مرقع پیش کر کے انہیں محو حیرت بنا دینے کے لئے کافی ہیں ؎

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ
آثار پدید است صنادیدِ عجم را

مگر ان محامد و محاسن سے متصف اس خاندان کے تمام ہی بادشاہ نہیں گزرے قابلیت، استعداد اور اہلیت وہ گرانقدر عطیئے ہیں جنہیں قدرت جس دماغ میں چاہتی ہے اسی میں ودیعت کرتی ہے ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

سلاطین مغلیہ کے عروج و اقبالمندی کی مدت ڈیڑھ سو سال سے کچھ اوپر ہوتی ہے۔ جس کے بعد زمانہ نے اپنی عادت کے مطابق کروٹ بدلی اور

دروازے سے آگے چل کر باغ، اسکی روشنیں، روشوں کے درمیان لمبے حوض اور وسط باغ میں سنگ مرمر کا ایک مربع حوض بنا ہوا ہے۔ طولانی حوضوں میں فوارے اور فواروں کے بالمقابل سرو کے درخت لگے ہیں۔ باغ غرباً شرقاً ۱۸۶۰ فٹ اور شمال جنوب میں ... ا فٹ ہے۔ جواب مغربی طور پر آراستہ ہے۔ بنسبت قدیم کے باعث آج تک آگرہ کے بازاروں میں میوہ جات روضے کی باغ کی طرف منسوب کرکے فروخت کئے جاتے ہیں۔ اور لوگ بشوق خریدتے ہیں۔

خاتمہ باغ پر چار فٹ اونچا چبوترہ ہے جس کے اوپر مقبرہ ہے۔ چاروں گوشوں پر چار مینار ہیں۔ ان میناروں کے متعلق کسی عوج زمین نے کہا ہے "چار بلند قامت اور حسین خواصیں ہیں جو ممتاز محل کی خدمت کے لئے کھڑی ہیں"۔ مولوی غلام امام شہید نے بھی وصفِ تاج گنج کی تعریف کرتے ہوئے کیا خوب شاعرانہ فقرہ ان میناروں کے متعلق تحریر کیا ہے "مینار آسمان کی طرف تعجب کا ہاتھ اٹھائے ہیں کہ یہ خم دیکھئے اور اس عمارت کی ہمسری کا دعویٰ اور دم دیکھئے"۔ گو میناروں پر جن میں مار پیچ کا زینہ بنا ہے چڑھنے سے سانس ضرور پھول جاتی ہے۔ لیکن شہر کا نظارہ پیش نظر ہوجاتا ہے۔ یہ چبوترہ ۳۱۳ فٹ مربع ہے میناروں کی بلندی سطح باغ سے ۱۶۲ ½ فٹ ہے۔ اور خاص روضہ کی عمارت ۱۸۶ فٹ مربع بنی ہوئی ہے۔ روضہ کے چاروں طرف ۶۶ ½ فٹ اونچی محرابیں ہیں۔ ان کی چوٹیوں سے محرابیں ۲۶ فٹ رہ جاتی ہیں۔ وسطی گنبد کا قطر ۵۸ فٹ ہے۔ اور اس کی چوٹی سطح زمین سے ۲۱۳ ½ فٹ۔ گویا گنبد کے مقابلہ میں میناروں کی بلندی تقریباً ½ ہے۔ گنبد پر جو کلس ہے ۳۰ فٹ لمبا ہے۔ دونوں بازو کے سرے سے محراب کی چوٹی تک کلام مجید کا سورہ جو چوب قلم سے لکھا ہے۔ اس کی تحریر یہ طلسمی تحریر سے کم نہیں کہ ہر حرف جیسا نزدیک سے نظر آتا ہے ویسا ہی دور سے دکھلائی دیتا ہے۔ گنبد کے اندر وسط میں ممتاز محل اور اس کے پہلو میں مغرب کی جانب شاہجہان کی قبر ہے۔ بیگم کی قبر پر ۱۰۴۰ھ اور بادشاہ کی قبر پر ۱۰۷۶ھ لکھا ہوا ہے۔ جو علی الترتیب ۱۶۳۱ء اور ۱۶۶۶ء عیسوی کے مطابق ہے۔ (اگر اس روضہ میں کوئی نقص وعیب ہے تو صرف یہ کہ ہر ہر جگہ تو جواب کا خیال رکھا گیا ہے۔ لیکن تعمیر مقابر میں یہ امر مدنظر نہ رہا۔ بیگم کی قبر ٹھیک وسط میں بنی تھی۔ شاہجہان کے بعد میں دفن ہونے نے یہ بات پیدا کردی) اوپر صرف تعویذ ہیں اصلی قبریں تہ خانے میں ان کے نیچے ہیں تعویذوں کے گرد جو پتھر کی جالیاں لگی ہیں باوجود استادان فن تعمیر کے مجمع اور مسالے کی فراوانی کے دس برس میں تیار ہوئی تھیں اور بجائے ان کے شروع میں طلائی مرصع بجواہر جالیاں لگائی گئی تھیں جب یہ جالیاں بنگئیں تو طلائی جالیاں علیحدہ کردی گئیں ممتاز محل کی قبر پر ایک موتیوں کی چادر جس کی قیمت لاکھوں روپیہ تھی پڑی رہتی تھی کہتے ہیں۔ اسکو امیر الامراء حسین علی خان (المتوفی ۱۱۳۲ھ) ۱۷۲۰ء میں لوٹ کرلے گیا۔

اخبار "فرشتہ" آگرہ اپنی اشاعت مورخہ ۲۱- فروری ۱۹۲۶ء میں رقمطراز ہے"۔ لارڈ ریڈنگ اور لیڈی ریڈنگ نے حال ہی میں ہز ہائنس مہاراجہ بڑودہ کے جواہر خانے کو دیکھا۔ تحفہ نادر اور بیش قیمت جواہر کی ایک چادر دس فٹ لانبی اور چھ فٹ چوڑی دیکھی جو سراسر موتیوں سے بنائی گئی ہے۔ سونے چاندی کی لڑیوں میں موتی گندھے ہوئے ہیں۔ اس کی قیمت ۳۰- لاکھ (تیس لاکھ) روپیہ ہے۔ ہندوستان کے کسی بادشاہ نے رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم کے مزار پر انوار پر چڑھانے کے لئے بنوائی تھی۔ تاریخ دان حضرات سے التماس ہے کہ وہ اس کا پتہ چلائیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مرہٹوں نے انگریزی فتنے کے دوران میں اس پر قبضہ کیا ہے۔ اور آخر کار یہ گائیکوار کے پاس پہنچ گئی"۔ ہیں مورخ

ناپائدار عمارتیں اور انکی دلفریبیاں چلتی پھرتی چھاؤں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں اکبر نے جس کی بنیاد رکھی اور شاہجہاں نے جس بنیاد پہ ایک استوار عمارت قائم کی وہ ہندو مسلم اتحاد ہے۔ جس کے آثار ہندوستان کے ہر ہر گوشہ میں اردو کی پاک و پاکیزہ صورت میں جلوہ افروز ہیں۔ یہ وہ خدمت ہے جس سے بڑی خدمت دنیا کے کسی تاجدار نے کسی ملک کی نہ کی ہوگی۔ نور اللہ مرقدھم +

نوٹ۔ ا۔ تاج محل ”تاتاریوں میں دستور تھا کہ ہر آدمی حتی الوسع اپنی زندگی میں اپنے مقبرے کیواسطے کوئی باغ پسند کر لیا کرتا تھا۔ زندگی بھر تو اس میں رہتا تھا اور مرنے پر اسی میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ شرط یہ ہوتی تھی کہ باغ جائز طور پر حاصل کیا گیا ہو۔ چنانچہ ممتاز محل کے مقبرے کیواسطے جو باغ تجویز ہؤا وہ بقول مولانا آزاد راجہ مان سنگھ اور بقول صاحب ارض تاج (واحد یار خان بی۔ اے) راجہ جے سنگھ کی ملکیت تھا۔ بہرصورت وہ باغ راجگان جے پور کا تھا۔ اس باغ کے معاوضہ میں شاہجہان نے اپنی ذاتی جائداد میں سے زمین دی اور اپنی محبوبہ کی وصیت کے مطابق یہ عدیم المثال روضہ بنوانا شروع کیا +

صدہا نقشوں میں سے استاد عیسی (باشندہ ایشیائے ترکی) کا پیش کردہ نقشہ منظور ہؤا۔ بغداد۔ دہلی اور ملتان سے معمار، سمرقند و ایشیائے ترکستان سے گنبد ساز، قنوج و بغداد سے پچہ کار، شیراز سے طغرا نویس، جے پور سے سنگ مرمر، فتح پور سیکری سے سرخ پتھر، پنجاب سے کٹھو، چین سے بلور اور رتونیا، تبت سے فیروزہ، لنکا سے نیلم، عرب سے مونگا اور عقیق، اس کے علاوہ اور قسم قسم کے پتھر اور مسالے سارے ہندوستان اور وسط ایشیا کے تمام حصوں سے مہیا کئے گئے۔ بیس ہزار آدمی تقریباً ۱۸ برس تک کام کرتے رہے۔ بقول مورخین قدیم پچاس لاکھ میں اور بہ تحقیق جدید تین کروڑ روپیہ میں بن کر تیار ہؤا۔ ایک ضعیف قول ۴½ کروڑ روپیہ بھی ہے +

بیرونی عمارتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم ناظرین کے سامنے صرف تاج کا اندرونی خاکہ پیش کرتے ہیں۔

اول ایک عالیشان پھاٹک ہے۔ اس کے اندر ایک بڑا چوک۔ جس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ یہ صحن عہد مغلیہ میں کاروان سرا کا کام دیتا تھا۔ یہیں غربا کے لئے لنگر جاری رہتا تھا۔ ہر سال بیگم کی تاریخ وفات پر بڑی خیرات ہوتی تھی۔ کچھ زمانہ ہؤا اس چوک کے گرداگرد کی عمارتیں کھنڈر تھیں۔ لیکن لارڈ کرزن آنجہانی (المتوفی ۱۹۲۵ء) اور محکمہ آثار قدیمہ کی قدردانی و مساعی نے ان کو از سر نو تعمیر کرا دیا ہے +

چوک کے وسط میں شمال کی طرف روضے کا خاص دروازہ۔ اور دروازے کے اندر اوپر جانے کا زینہ ہے جو بھول بھلیوں میں لیجاتا ہے۔ جبکہ اس دروازے میں بائیں جانب کے بالائی حصہ میں ایک مختصر عجائب خانہ ہے جس میں روضے کے مختلف زاویوں اور مختلف حالتوں کی تصاویر۔ ان پتھروں کے نمونے جو روضے میں لگے ہوئے ہیں اور قلمی نقشے وغیرہ رکھے ہیں +

شاہجہان کا انتقال ہوا تو بعض امرائے عالمگیر سے کہا، مرحوم کی خواہش تھی۔ کہ روضہ ممتاز محل کے بالمقابل، دریا کے اس پار دفن ہو"۔ عالمگیر نے جواب دیا" میرے ماں باپ چکوا چکوی نہیں ہیں۔ جو ایک اس پار اور دوسرا اس پار رہے۔ یہ کہ کر حکم دیا" قبر ممتاز محل کے پاس قبر بنائی جائے" +

مسجد کے جنوب میں چبوترے سے اتر کر دہ جگہ ہے جہاں ممتاز محل کی نعش امانتاً سپرد زمین ہوئی تھی۔ باغ کے مغربی جنوبی گوشے میں ایک مکان ہے۔ جس میں درخت ہیں۔ اسی گوشے میں والان کے اندر ایک اور مکان ہے۔ جس میں عجیب وغریب درخت دولت برطانیہ نے لگائے ہیں۔ پشت مسجد پر ایک باغ ہے۔ جس میں اب پود تیار کی جاتی ہے۔ روضہ کی پشت پر جمنا بے فائدہ سر ٹکرایا کرتی ہے +

یہ جو کہا جاتا ہے کہ آگرہ کی مشہور عمارت اعتماد الدولہ جو نورجہاں کے باپ مرزا غیاث بیگ المخاطب بہ اعتماد الدولہ (المتوفی ۱۶۲۲ء) کا مقبرہ ہے۔ وہ تاج محل کے بچے ہوئے مسالے سے بن کر تیار ہوئی ہے۔ غلط ہے۔ کیونکہ اعتماد الدولہ کی عمارت پہلے بنی ہے۔ اور اسے نورجہاں نے دو برس میں بنوایا ہے۔ اور وہ ۱۶۲۶ء میں بن کر تمام ہوئی ہے۔ یہ ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ شاہجہان نے یہ خیال کرکے کہ ایک وزیر کا مقبرہ تو اتنا شاندار ہو لہذا میری محبوبہ بیگم کا مقبرہ بہت ہی عمدہ ہونا چاہیئے۔ اس عمارت کو اتنا عجیب وغریب بنوایا ہوگا +

تاج محل کے جائے وقوع کے متعلق ابھی کچھ اور عرض کرنا ہے۔ اس عمارت کے جائے وقوع پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے یہ خیال کرکے وہاں بنوائی تھی۔ کہ ہمیشہ اس کے پیش نظر رہے۔ سمن برج (ثمن برج) آگرہ کی عمارت قلعہ میں نورجہاں کے رہنے کے لئے مخصوص تھی۔ بعد میں ممتاز محل بھی اسی میں رہی۔ ممتاز محل کے مرنے کے بعد شاہجہان نے بذات خود وہیں رہنا شروع کر دیا۔ تاکہ اس کی محبوبہ کا مقبرہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ مرض الموت میں مبتلا ہونے پر وہ قطعی وہیں رہا۔ اور تاج کا نظارہ کرتے کرتے جاں بحق تسلیم ہوا۔ گویا تاج محل اس خوبی ومناسبت سے بنایا گیا ہے۔ کہ بمقابلہ اور حصص قلعہ کے وہ سمن برج سے بخوبی نظر آتا ہے۔ اس روضہ کی مرمت، خدام کی تنخواہ اور بیگم کی ختم فاتحہ کے خرچ کے لئے ایک لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کے دیہات اور دو لاکھ سالانہ آمدنی کی دوکانیں اور سرائیں (جو اس کے گرداگرد بنائی گئی تھیں۔ اور جن سے مل جل کر یہ ایک چھوٹا موٹا شہر بن گیا تھا۔ اور جس کا نام ممتاز آباد، ممتاز محل کے نام پر رکھا گیا تھا) بادشاہ نے وقف کر دی تھیں۔ یہ آبادی اب تاج گنج کہلاتی ہے یہاں تھانہ، شفاخانہ، ڈاکخانہ اور پرائمری مدارس منجانب دولت برطانیہ موجود ہیں +

یہ عمارت محکمہ آثار قدیمہ کے تحت انتظام میں ہے۔ برابر مرمت وغیرہ کا کام جاری رہتا ہے۔ حکومت نے شہر آگرہ و تاج گنج کے درمیان ہولناک اور غیر آباد ٹیلوں کو جا بجا سے ہموار کرکے اعلےٰ درجہ کا ایک باغ ترتیب دیا ہے۔ بہشت ارضی کا راستہ حقیقتاً اتنا ہی پُر بہار ہونا چاہیئے تھا۔ اب بھی سالانہ عرس بادشاہ کا ہوا کرتا ہے۔ جس کے مصارف سرکار انگلشیہ سے مرحمت ہوتے ہیں۔ اس عمارت پر یہ شعر فی المثل صادق آتا ہے ؎

نہیں البتہ فن تاریخ سے ذوق ضرور رکھتا ہوں۔ یہ مجھے معلوم نہیں کہ میرا مذاق تاریخ بینی صحیح ہے یا غلط بہرحال میں نے بہت سے امرائے وسلاطین تیموری کی ساختہ اشیاء نذرانہ مقامات مقدسہ عتبات عالیات کے حالات دیکھے ہیں لیکن اس قسم کی کسی چادر کے حالات میری نظر سے نہیں گزرے۔ عجب نہیں ہے کہ یہ وہی چادر ہو جس کا امیر الامراء حسین علی خاں کا تاج محل سے لے جانا بیان کیا جاتا ہے چونکہ اس زمانہ میں جب کہ سادات بارہہ و فرخ سیر (المتوفی ۱۷۱۹ء) سے بگاڑ تھا۔ امیر مذکور کے علاوہ راجگان جے پور، جاٹ اور مرہٹے وغیرہ بھی شورش مچا رہے تھے اسی گڑبڑ میں باواسطہ یا بلاواسطہ یہ راجہ موصوف کے قبضہ میں پہنچ گئی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سید مذکور نے بذات خاص اس چادر کو غارت نہ کیا ہو۔ بلکہ اسی کے سلسلہ والی بغاوت میں لٹی ہو۔ اور اس کی نسبت سے اسکے نام پر اسکی لوٹ لکھی گئی ہوگی اس لئے کہ سرغنہ وہی تھا +

روضہ میں چاندی کے دروازے بھی تھے انہیں ۱۷۶۴ء میں جاٹ لوٹ کر لے گئے اور انہوں نے گلا ڈالا علاوہ ازیں لاکھوں روپیہ کا سامان مثل قالین، طلائی قنادیل و شمعدان وغیرہ کے بھی رہا کرتا تھا میں نے ایک کتاب موسومہ "ہفت عجائبات عالم" میں دیکھا ۔ اس میں لکھا تھا "صناع نے گنبد کو اس خوبی سے بنایا ہے کہ ہر بارش میں ایک قطرہ آب باراں کا بیگم کی قبر پر گرتا ہے" لیکن کسی معتبر تاریخ سے اس کی سند نہ ملی۔ جس کی بنا پر میں قدیم زمانہ کے خوش غپ حضرات کا اس کو شگوفۂ طبعی سمجھتا ہوں +

دنیا بھر کو آگرہ پر اس عمارت کی وجہ سے رشک آتا ہے۔ سات عجائبات عالم میں مشہور رہیں۔ مگر وہ سب اس ایک کے آگے گرد ہیں۔ یورپ والے اسی تمنا میں مرے جاتے ہیں کہ کاش انہیں اس کے معمار ہونے ہی کی عزت میسر آجائے۔ چنانچہ بہت سی روائتیں بھی گھڑلی ہیں۔ بات بناتے ہیں لیکن بنائے نہیں بنتی۔ غور کیا جائے اور مقبرۂ ہمایون دہلی کو بہ نظر غائر دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ اس عمارت کا خیال یہیں پیدا ہوا یہیں بڑھا۔ گویا جس خیال کی ابتداء ہمایوں کا مقبرہ تھا۔ اس کی انتہا تاج ہے +

اہل امریکہ اس کی تمثیل کی دھن میں عرصہ سے لگے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں مستقبل قریب میں ایک نمائش ہونے والی ہے۔ جس میں ساٹھ (۶۰) لاکھ ڈالر (۲ کروڑ ۴۴ لاکھ روپیہ) کے صرف سے "تاج محل" کا نمونہ بنا کر دکھایا جائیگا۔ اس کا ٹھیکہ "انڈین ٹریڈنگ کمپنی" نامی ایک ہندوستانی شراکت کو دیا گیا ہے +

تاج محل میں مسجد اور تسبیح خانہ بھی ہے۔ مسجد کے جنوب میں ایک برج ہے۔ جس میں باولی بنی ہے مسجد کے شمال میں جو برج ہے۔ بہشتی برج کہلاتا ہے۔ مسجد کا جواب بنانا ضرور تھا۔ الٹی مسجد ہو نہیں سکتی تھی۔ لہذا مسجد مثال عمارت بنا کر تسبیح خانہ کے نام سے موسوم کیا تھا۔ اس کے صحن کے چبوترے پر اتر کی جانب روضہ کے کلس کا پورا خاکہ سنگ سیاہ سے بنا ہوا ہے +

روضہ کے شمال میں زیریں چبوترے پر دو زینے بنے ہیں۔ جو تہ خانے میں اتر گئے ہیں۔ ایک سے دوسرے میں آجا سکتے ہیں۔ مگر بہت ہی تنگ و تاریک ہیں +

دریا کے اس پار ایک عمارت کے کچھ مٹے مٹے آثار دکھلائی دیتے ہیں۔ کہتے ہیں شاہجہان نے اپنے لئے اس پار مقبرہ بنوانا شروع کیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پل بنا کر دونوں عمارتوں کو ملا دے (میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ اس دوسری عمارت کو سنگ سیاہ کی بنانا چاہتا تھا) مگر دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ جب

ممتاز محل کی لاش پہلے باغ آہوخانہ (المعروف بہ باغ زین آباد) واقع برہانپور میں دریائے تاپتی کے اس پار امانتاً سپرد زمین کی گئی۔ بیدل خان نے تاریخ کہی ؎

جائے ممتاز محل جنت باد

۱۰ ھ ۴۰

۶ مہینے کے بعد ۱۷۔ جمادی الاوّل ۱۰۴۱ھ کو مرحومہ کی نعش شاہزادہ محمد شجاع، جہاں آرا بیگم، وزیر خاں اور صدر النساء ستی النساء خانم (اخت طالب آملی) کی معیت میں دارالخلافہ آگرہ کی طرف منتقل ہوئی۔ برہانپور سے آگرہ تک بیشمار روپے اور مختلف قسم کے کھانے غربا میں تقسیم کئے گئے۔ چونکہ مقبرے کی عمارت ابھی زیر تعمیر تھی اور مدفن نامکمل اس لئے مسجد روضہ کے جنوب کی طرف (چبوترے سے اتر کر) باغ میں دوبارہ امانتاً مدفون کی گئی۔ اور ۱۵۔ جمادی الثانی ۱۰۴۱ھ کو اپنی اصلی جگہ پر دفن ہوئی۔ ممتاز محل کا مقبرہ جو "تاج محل" یا "تاج" یا "تاج بی بی کا روضہ" یا "روضہ" کر کے مشہور ہے۔ دنیا کی بیمثل، عدیم النظیر، اور ایک ایسی عمارت ہے۔ جو اپنی مثال آپ ہے۔ اور مختلف مذاہب اور ممالک کے سیاح اس کے دیدار کو اپنے لئے سرمایہ صد نازش و افتخار سمجھتے ہیں +

ممتاز محل ایک نہایت درجہ حسین، ادب شناس، مراتب پرستاری سے بخوبی واقف، قابل اور روشن دماغ بیگم تھی۔ اس کی فیاضی و رحمدلی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس نے صدہا مفلس و نادار لوگوں کی لڑکیوں کی شادیاں اپنے صرفے سے کرادیں۔ بیشمار محتاجوں کو مالدار و صاحب ثروت بنا دیا۔ ہزاروں مجرموں کو جو سزائے موت کے سزاوار تھے رہائی دلوائی +

وہ بڑی ذکی، فہیم اور صائب الرائے عورت تھی۔ یہی وجوہ ہیں جن کے باعث شاہجہاں کو ایک لحظہ کے لئے اس کی جدائی گوارا نہیں ہوتی تھی۔ سفر، حضر، رزم، بزم، غرض ہر جگہ اور ہر حال میں وہ اس کی رفیق و ہمدم ہوتی تھی۔ خوفناک حالتوں میں وہ بادشاہ کو بہت عمدہ رائیں دیا کرتی تھی۔ اس جلیل القدر بادشاہ کے بہت سے مشہور و معروف کارنامے اسی سنجیدہ بیگم کے قیمتی اور قابل قدر مشوروں کے مرہون منت ہیں +

یہ تحقیق نہ ہوسکا کہ اس مشہور عصر و شہرہ آفاق بیگم کی تعلیم و تربیت کی خدمت کن ستودہ صفات و لائق ستائش ہستیوں کے حصے میں آئی تھی۔ لیکن اس کی موزونی طبعی، حاضر جوابی، طالب آملی کی بہن صدر النساء ستی النساء خانم کا اس کی بارگاہ میں منصب مصاحبت پر سرفراز ہونا وغیرہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ لائق و یکتائے روزگار ماں باپ نے جیتی اور لاڈلی بیٹی کو شہنشاہ ہند کی رفیقہ حیات بنانے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ پھر یہ اس گھر کی بیٹی تھی جس گھر کی علمیت، قابلیت اور دانائی ہمیشہ کنیز بنی رہی۔ اعتماد الدولہ، آصف خاں، دیوانجی بیگم، اور نورجہاں بیگم وہ مقتدر ہستیاں تھیں۔ جن کے علم و فضل کی تعریف میں ایک عالم رطب اللسان ہے۔ اس گھرانے کی لڑکی جو کچھ بھی نہ ہو تھوڑا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مورخین قدیم کسی شخص کی زندگی پر ہر ہر پہلو سے یکجائی بحث نہیں کرتے اور اکثر عام حالات کو نظرانداز کرنے کے عادی ہیں۔ جو موجودہ زمانے کے مورخین کی نظر میں اگلے زمانہ کی تہذیب سے

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است وہمین است وہمین است

(ماخوذ از سیر المتاخرین، بادشاہنامہ، مڈل انڈیالین پول، سفرنامہ ڈاکٹر برنیر، ترجمہ خلیفہ سید محمد حسین مع حواشی اور ارض تاج واحد یار خان بی-اے)" +

نوٹ ۲۔ ممتاز محل"۔ ارجمند بانو بیگم نام، نواب ممتاز الزمانی ممتاز محل خطاب، قدسیہ بیگم اور نواب عالیہ بیگم مشہور یمین الدولہ آصف خان، خان خانان، مرزا ابوالحسن بن اعتماد الدولہ، مرزا غیاث بیگ طہرانی کی بیٹی تھی۔ یہ مشہور و معروف بیگم۔ دیوانجی بیگم بنت خواجہ غیاث الدین قزوینی (بن آقا ملا مصاحب شاہ طہماسپ صفوی) کے بطن سے ۱۰۰۱ھ مطابق ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوئی۔ سلسلہ نسب کے لئے یہ کہدینا کافی ہے کہ نورجہاں کی بھتیجی اور اعتماد الدولہ کی پوتی تھی جسبی سلسلہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ کے توسط سے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ تک جا پہنچتا ہے۔ ۱۹ سال ۲۱ دن کی عمر میں جبکہ شاہجہان کی عمر بحساب شمسی ۲۰ سال ایک مہینہ اور ۸ دن کی تھی۔ ربیع الاول ۱۰۲۱ھ میں اُس کے ساتھ بیاہی گئی۔ تمام مراسم اعتماد الدولہ کے گھر میں ادا ہوئے۔ جہانگیر بہ نفس نفیس خود اس بزم عروسی میں شریک تھا ۵۔ لاکھ روپیہ کا مہر قرار پایا تھا۔ گو اس سے پہلے شاہجہان کی شادی شاہ اسماعیل صفوی بادشاہ فارس کی پوتی کے ساتھ ہو چکی تھی اور اس کے بعد بھی اس نے اپنے اسلاف کی طرح متعدد شادیاں کی تھیں۔ لیکن بیگمات میں جو عزت و توقیر ممتاز محل کی تھی وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ یہ بیگم چودہ مرتبہ حاملہ ہوئی۔ بہت سے لڑکے لڑکیاں ہوئیں۔ جن میں سے چار بیٹے اور تین بیٹیاں اس بیگم کے مرتے دم تک زندہ رہیں۔ آخری مرتبہ ذیقعد ۱۰۴۰ھ میں گوہر آرا بیگم کی ولادت پر بمقام برہانپور وفات پائی۔ تاریخی روایت ہے کہ جب بچی کی ولادت کا وقت قریب آیا تو اندر تجربہ کار دائیاں اور باہر اطباے حاذق جمع ہوئے۔ دفعتہً پیٹ کے اندر سے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ سب سن کر نہ صرف حیران رہ گئے بلکہ سب کے اوسان خطا ہو گئے۔ بیگم نے اپنی بڑی بیٹی (بیگم صاحبہ) کے ذریعہ سے خود بادشاہ کو طلب کیا۔ بادشاہ زندگی سے مایوس بیگم کے پاس پہنچا۔ ممتاز محل نے آہٹ پاکر آنکھیں کھولدیں۔ اور بادشاہ کو بڑی حسرت کی نگاہ سے دیکھا۔ شاہجہان سے اپنی پیاری بیگم کا یہ حال دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا اور بے اختیار اسکے آنسو ٹپک پڑے۔ بیگم نے یہ دو وصیتیں کیں :-

(۱) یہ کہ اس کی قبر پر ایسی بے نظیر عمارت بنوائی جائے کہ عالم میں یادگار رہے +

(۲) یہ کہ بادشاہ دوسری شادی نہ کرے کیونکہ بچے پریشان ہوں گے +

ان وصیتوں کے بعد جبکہ اس کی نظر اپنے جان نثار رفیق زندگی کے روئے تابان پر جمی ہوئی تھی اس کے مرغ روح نے عالم قدس کی طرف پرواز کی۔ اس وقت اس کی عمر ۳۹ سال ۴ مہینے کی تھی۔ شاہجہان کو ممتاز محل کے انتقال کا سخت ملال ہوا۔ دو برس تک اس نے رنگین کپڑا نہ پہنا۔ عطر و خوشبویات سے محترز رہا۔ ترتیب جشن واعیاد موقوف رہی۔ سماع جو اُس کی زندگی کا جزو لاینفک تھا ترک کر دیا۔ چند ہی دنوں میں صدمے کی وجہ سے اس کے بال سفید ہو گئے +

میں اپنے اور پرائے کا امتیاز نہیں کرتے ۔ بے تکلفی کے ساتھ اپنے عیوب کا اعتراف اور دوسرے کی خوبیوں کا اقرار کر لیتے ہیں (بامداد تاریخ ہند مصنفہ مسٹر اسمتھ، تاریخ ہند مصنفہ ابو الشیری شاہد ایم۔ اے، تاریخ ہند مصنفہ اے مارسڈن صاحب بی۔ اے تاریخ ہند جلد ہفتم شمس العلما مولوی ذکاء اللہ مرحوم۔ آئینہ ادا۔ سیر المتاخرین۔ بادشاہنامہ ملا عبد الحمید لاہوری۔ جہاں آرا مصنفہ مولوی محبوب الرحمن کلیم بی اے وکیل اورنگ زیب مصنفہ پروفیسر سرکار بالقابہ۔) ۱۲۔

نوٹ نمبر ۳ ۔ قلعہ معلیٰ (دہلی) [illegible] نے اپنے جلوس کے بارہویں سال مطابق ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء میں شاہجہان آباد (دہلی جدید) کی آبادی کا حکم دیا۔ ۱۲ ذالحجہ کو یہ قلعہ بننا شروع ہوا۔ استاذ حامد اور احمد معمار جو اپنے فن میں یکتا تھے اس کی تعمیر کے لئے مقرر ہوئے۔ پہلے عزت خاں کو اس کا اہتمام ملا۔ پانچ مہینے دو دن میں قلعہ کی بنیادیں کھدیں اور کچھ مسالہ جمع ہوا۔ اور کہیں کہیں سے بنیاد اونچی بھی ہو آئی۔ پھر الہ وردی خان کو یہ کام سپرد ہوا۔ اور دو برس ایک مہینہ گیارہ دن میں قلعہ کے سب طرف کی دیوار ۱۲۔۱۲ گز اونچی ہو گئی۔ پھر مکرمت خاں کے سپرد انتظام کیا گیا۔ بیسویں سال جلوس یعنی قریب نو برس کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ ۲۴۔ ربیع الاول ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء یعنی تخت نشینی کے اکیسویں سال میں بادشاہ نے اس میں پہلا جلوس کیا۔ یہ قلعہ ہشت پہل بنا ہے۔ اس کا طول ایک ہزار گز، عرض چھ سو گز ہے۔ قلعہ آگرہ سے گویا دگنا ہے۔ اس کی فصیل ۲۵ گز اونچی اور بنیاد ۱۱ گز گہری ہے دیوار کا آثار بنیاد سے پندرہ اور اوپر سے ۱۱ گز کا ہے۔ اس کی خندق ۲۴ گز چوڑی اور ۱۰ گز گہری بنی ہے۔ جس کا محیط تین ہزار چھ سو گز ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ بقول صاحب مرأت آفتاب نما ایک کروڑ روپیہ لاگت آئی جس میں سے پچاس لاکھ تعمیر قلعہ میں اور پچاس لاکھ اندر والے محلات وغیرہ کی تعمیر میں خرچ ہوا ہے۔ اس قلعہ میں عمارات خاص وعام۔ غسل خانہ۔ محل سرائے اور عالمگیر کی بنائی ہوئی موتی مسجد قابل دید اور بے نظیر عمارتیں ہیں۔ اگر اس قلعہ کو ہندوستانی عمارت، پچی کاری، منبت کاری، صنعت گری، سنگکاری کا عجائب خانہ کہا جائے تو بہت ہی موزوں ہوگا۔ (ماخوذ از سفرنامہ ڈاکٹر برنیر۔ آثار الصنادید سرسید۔ ظفرنامہ شاہجہان و قصص ہند آزاد)

نوٹ نمبر ۴ ۔ جامع مسجد (دہلی) اس کی بنیاد ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء میں رکھی گئی تھی۔ پانچ ہزار مزدور، بیلدار اور سنگ تراش روزانہ کام کرتے تھے۔ تب بھی چھ برس میں دس لاکھ روپیہ کے صرف سے بن کر تیار ہوئی تھی۔ اسکے تین گنبد ہیں۔ نوے گز طول اور تیس گز کے عرض میں۔ اندر کو سات محرابیں۔ باہر صحن کی طرف گیارہ دروازے ہیں۔ جن میں ایک تو بہت بلند ہے اور ۵۔۵ ادھر ادھر والے ذرا نیچے ہیں۔ بڑے دروازے پر کلمہ 'یا ہادی' بطور طغرا اور باقی دروازوں پر شاہجہان کے نام کا کتبہ، تاریخ تعمیر اور زر مصارف جس کو نور اللہ خوشنویس نے خط نسخ میں لکھا تھا۔ سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے بنا ہوا ہے۔ دروازوں کے دونوں طرف نہایت بلند اور خوشنما مینار ہیں۔ جن میں اوپر جانے کے لئے زینے اور سروں پر بارہ دری کی برجیاں بہت ہی دلکشا بنی ہوئی ہیں۔ شمالی مینار بجلی کے صدمے سے گر پڑا تھا۔ اور فرش صحن بھی جو سنگ سرخ کا ہے خراب ہو گیا تھا۔ ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء میں دولت برطانیہ نے دونوں کی تعمیر و درست کرا دی۔ چونکہ اس مسجد میں کوئی مکبر نہ تھا۔ اس لئے شہزادہ مرزا سلیم بن معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ نے ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء میں بیچ دروازے کے بیچ میں سنگ باسی کا بہت ہی خوشنما مکبر بنوا دیا ہے مسجد کے اندر سنگ مرمر کا فرش ہے جس میں رنگ موسیٰ کی پچیکاری سے مصلے بنائے گئے ہیں منبر بھی سنگ مرمر کا بہت خوش قطع بنا ہوا ہے شمالی دالان میں کچھ تبرکات محمدؐ کے رکھے ہیں اور وہ مقام درگاہ آثار شریف کہلاتا ہے

آشنائی بہم پہنچانے کے لئے ایک رہبر کامل کا کام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس بیگم کی تعلیم و تربیت علم و فضل کے متعلق قلم اٹھانے سے معذور ہیں۔ اور صاحب کتاب "جہان آرا" کی نوشتہ چند سطور اور ایک واقعے کے قلمبند کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جس سے فہیم، سنجیدہ اور با مذاق حضرات بہت کچھ کھوج لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ کتاب مسطور کے مصنف نے بھی اسی طرح صدہا کتابوں کی ورق گردانی کر کے ایک ایک جملہ ڈھونڈ کر اس کتاب کو جمع کیا ہے۔ جس طرح آج کوئی "م" اور بیٹھا ہوا کر رہا ہے ۔

وہ لکھتے ہیں "ارجمند بانو (ممتاز محل) زیور علم و فضل سے آراستہ تھی۔ شعر و سخن میں بھی اس کو دخل تھا۔ ایک مرتبہ شاہجہان جمنا کے کنارے تفریح طبع کی غرض سے بیٹھا ہوا تھا۔ اور قدرت کے دلکش مناظر کی سیر کر رہا تھا۔ اس موقع پر بیگم بھی وہاں جلوہ گر تھی۔ شاہجہان نے دریا کی موجوں کی طرف اشارہ کر کے ممتاز محل سے کہا ؎

"آب از برائے دیدنت می آید از فرسنگ ہا"

ممتاز محل نے برجستہ کہا ؎ "از ہیبت شاہِ جہاں سر می زند بر سنگ ہا"

عہد حاضرہ کے ایک مشہور مورخ کی تصنیف کردہ "تاریخ ہند" میں جو ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے مدارس میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے۔ میں نے اس بیگم کے متعلق لکھا ہوا دیکھا "وہ بڑی پکی مسلمان تھی" اور غور کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ فاضل مورخ نے لفظ "مسلمان" بطور ہجو ملیح "شمشیر زن" یا "سفاک" کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ جو ایک صریحی غلطی اور بیجا الزام ہے۔ میرے رائے میں مصنف موصوف کی رائے اس لئے چشم پوشی کے قابل ہے کہ انہوں نے اہل مغرب کا تتبع کیا ہے۔ لیکن اس لئے وہ قابل گرفت ہیں۔ کہ انہوں نے باوجودیکہ ان کی آنکھیں نئی روشنی سے منور تھیں۔ اہل مغرب کی تقلید کو روش کی ہے ان کا ماخذ غالباً منوچی کی کتاب موسومہ "منوچی اسٹوریا ڈو موگور" ہے۔ منوچی کے متعلق اس زمانہ کے مشہور و معروف مورخ عالی جناب بابو جادو ناتھ صاحب سرکار بالقابہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "اورنگ زیب" میں تحریر فرماتے ہیں۔ ایک معمولی کم علم آدمی تھا۔ بہت ہی ستم رسیدہ تھا۔ اس نے بہت سی باتیں زمانۂ ماقبل کی لکھی ہیں۔ اور وہ بھی صرف یادداشت سے۔ اس نے بہت سی باتیں خلاف قیاس و برعکس واقعات بھی لکھی ہیں" اس واسطے ہم اس کی باتوں کو صحیح نہیں سمجھتے"۔ منوچی کی کتاب اس لئے بھی ہر معاملے میں خصوصاً شاہجہان وغیرہ کی ذاتیات کے متعلق ماخذ بنانے کے قابل نہیں۔ کہ اس کے ہم قوم اور ہم مذہب پرتگیزی (پرتگالی) شاہجہان کے ہاتھوں اور بقول مسٹر اسمتھ ممتاز محل کے اشارے سے قتل و غارت کئے گئے تھے۔ وہ اگر ممتاز محل اور آل تیمور کو متہم نہ کرتا تو اور کون کرتا۔ رہا شاہجہاں سو قوم مذکور کی تباہی کے معاملے میں اس کی نظر ہندو مسلم قوم کے مفاد پر تھی، سیاسی نقطۂ نظر سے اس کا یہ فعل کسی پہلو سے نکتہ چینی کے قابل نہیں۔ اسی قسم کی غلط روایات دو ہندی بھائیوں (ہندو مسلمانوں) میں باہمی تنافر و تفریق کا باعث ہوئی ہیں۔ اول تو ہمیں سرکار موصوف کا اتباع کرنا چاہیئے کہ زیادہ تر اسی زمانہ کے مورخوں کی تاریخوں، درباریوں اور حاشیہ نشینوں کی تصانیف سے استخراج و اخذ واقعات کریں ورنہ پھر ان منصف مزاج اور محقق اہل مغرب کی کتابوں کو ذریعہ معلومات بنائیں۔ جو اظہار صداقت

محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن | موتی سے ہیں دالان، تو ہے دودھ سا آنگن
کافور کا تودہ ہے کہ الماس کا معدن | یا فجر کا مطلع ہے کہ خود روز ہے روشن
بلور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس | باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوتِ احساس
ہاتھوں نے مہندسک کے اک سحر کیا ہے | سانچے میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
یا تارِ نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے | مرمر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
نے شمع، نہ فانوس، نہ بتی، نہ دیا ہے | ہاں چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے
چلئے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور | نظارے کی دو مجھ کو اجازت ابھی کچھ اور
مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی | "اس قلعہ میں اہلِ شاہجہاں کی ہیں نشانی"
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اس نے کہانی | کچھ حالت موجودہ بایں شعر بیانی
اُن حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی | فواروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی
تسبیح، نہ تہلیل، نہ تکبیر و اذاں ہے | بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفل گراں ہے
جمگھٹ تھا کبھی یاں وزراء و امراء کا | مجمع تھا کبھی یاں علما و صلحا کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکرِ خدا کا | ہوتا تھا ادا خطبہ صد احمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھیرا تھا یہاں عزّ و علا کا | جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا
ہیں اب تو ہماری مرے باقی یہی دو تین | یا دھوپ ہے، یا چاندنی، یا سایۂ مسکین"

نوٹ نمبر ۶۔ حیات بخش۔ قلعۂ دہلی کا مشہور و معروف پُرفضا باغ ہے۔ یہ باغ اپنے احیاض و عمارات سمیت ۱۰۵۸ھ۔ ۲۱ سنہ جلوس میں بن کر تیار ہوا تھا۔ اس کے حوض کے وسط میں ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر (المتوفی ۷۔ نومبر ۱۸۶۲ء) نے ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۲ء۔ ۶ سنہ جلوس میں سنگ سرخ کا محل بنا کر اس کا تاریخی نام "ظفر محل" رکھا تھا۔ جو اب "جل محل" کے نام سے مشہور ہے۔ اب یہ باغ مغربی طرز پر آراستہ پیراستہ ہے۔ اس کی سرسبزی و شادابی کا ہر بادشاہ نے بہت لحاظ رکھا۔ خصوصاً عالمگیر کو اس کی تازگی پر خاص توجہ تھی۔ (ماخوذ از آثار الصنادید و رقعات عالمگیری) ۱۲ +

نوٹ نمبر ۷۔ شالامار۔ تین باغوں کا نام ہے۔ جن میں سے ایک کشمیر میں وہاں کی مشہور جھیل (ڈل) اور اس کے ادھر والے پہاڑوں کے درمیانی پہاڑوں کے ڈھال پر واقع ہے۔ یہ باغ بہت ہی پرفضا اور عجیب و غریب درختوں سے پُر ہے۔ اس باغ کو جہانگیر کے پندرھویں سال جلوس میں شاہجہان نے باپ کی فرمائش سے بنایا اور مقام تعمیر کی مناسبت سے اس نام سے موسوم کیا تھا۔ گو شاہجہان نے اپنے جلوس کے ساتویں سال اس کا نام بدل کر "فرح بخش" رکھدیا تھا۔ لیکن اس نام نے رواج نہ پایا۔ صرف کتابوں اور کاغذات میں لکھا جاتا رہا۔ عام لوگ "شالامار" ہی کہتے رہے۔ آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ دوسرا لاہور میں۔ یہ شاہجہان کے عہد میں اسی کی فرمائش سے شالامار کشمیر کی طرز پر تعمیر ہوا تھا اور باغ فیض بخش کے نام سے موسوم کیا گیا تھا اب بھی لاہور میں موجود ہے۔ بہترین باغوں میں شمار ہوتا ہے۔ نام نے اس کے بھی رواج نہ پایا اور "شالامار" ہی کہلایا

صحن مسجد عرض و طول سے ۱۳۶ گز ہے۔ جس کے وسط میں ۱۵×۱۲ گز کا خالص سنگ مرمر کا حوض ہے۔ اور اس میں فوارہ لگا ہوا ہے۔ صحن کے گرد دالان، حجرے اور مکانات بنے ہوئے ہیں۔ چاروں کونوں پر بارہ دری کے چار برج ہیں۔ جنوبی و مشرقی دالان کے سامنے دائرہ ہندی وقتِ نماز دیکھنے کا بنا ہوا ہے۔ تینوں دروازے مسجد میں برنجی پھاٹک چڑھے ہوئے ہیں۔ جنوبی دروازے پر رہائش کے قابل حجرے بنے ہوئے ہیں پینتیس ۳۵ سیڑھیاں ہیں جن پر تیسرے پہر کو بازار لگتا اور مجمع عام ہوتا ہے۔ اس مسجد کا مہتمم پانچ مہینے تک جعفر خان دو سال تک خلیل اللہ خاں تین سال پانچ مہینے۔ سعد اللہ خاں، اور اس کے انتقال کے بعد روح اللہ داروغہ عمارت رہا اسی کے زمانہ میں بن کر تمام ہوئی تھی۔ کسی نے تاریخ کہی۔ ع

مسجد شاہ جہاں قبلۂ حاجات آمد

اور گو ایک سال کا فرق ہے۔ یعنی مسجد بنی ہے ۱۰۶۶ھ میں اور اس تاریخ سے ۱۰۶۷ھ نکلتا ہے۔ لیکن جدت ادا کی بنا پر بادشاہ نے بہت پسند کی (ماخوذ از آثار الصنادید و سیر المتاخرین) +

نوٹ نمبر ۵ - موتی مسجد (آگرہ)۔ قلعہ آگرہ میں دہلی دروازے کے اندر داخل ہونے کے بعد سب سے پہلی عمارت یہی ہے۔ یہ مسجد بہت ہی خوبصورت ہے۔ اور ایک مرتفع چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ اس کی مغربی شمالی دیواریں ۲۳۴ فٹ لمبی ہیں۔ اور شمالی و جنوبی دیواریں ۱۸۷ فٹ کی ہیں۔ باہر تو سنگ سرخ ہے جو اپنی سادگی میں بھی لطف دیتا ہے۔ لیکن اندر قبۂ نور ہے۔ نرا سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے۔ اور کاریگری باعتبار تناسب ختم کر دی گئی ہے۔ اس کی اعلیٰ خوبصورتی (Classic Beauty) کو قلم کی مجال نہیں کہ تحریر میں لا سکے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملاء اعلیٰ سے جنت کا جگر پارہ اس فرش خاکی پر عقل انسانی کو حیرت میں ڈالنے کے لیے اتر آیا ہے۔ صحن مسجد ۱۵۵ فٹ مربع ہے۔ بیچ میں پیارا چوکور حوض ہے۔ اور جنوبی و مشرقی گوشہ میں ایک دھوپ گھڑی نہایت نفیس بنی ہوئی ہے۔ صحن کے تین طرف خوشنما دالان دلفریبی پر حکومت کر رہے ہیں۔ جن کی چوڑائی گیارہ فٹ ہے۔ دالان مسجد ۱۴۲ فٹ لمبا اور ۵۶ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے اوپر تین سڈول اور پر نزاکت گنبد ہیں۔ اور ہر گوشے میں ایک مینار ہے گنبدوں کے واسطے ہیول لکھتا ہے۔" بالکل کلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ جو کھلنے کو ہیں"۔ مسجد کے دونوں طرف حجرے ہیں جو غالباً مستورات کے واسطے مخصوص ہونگے۔ کیونکہ ان میں پتھر کی سبک اور نفیس جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ مسجد رنگ آمیزی سے بالکل معرا ہے۔ البتہ صفوں میں زرد پتھر دکھوا دیا گیا ہے۔ مگر سادگی بھی وہ بلا کی ہے جس کے لئے بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔ ع

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا

اس مسجد کو شاہجہان نے بنوایا تھا۔ ۱۶۴۸ء میں بننا شروع ہوئی، اور ۱۶۵۵ء میں اختتام کو پہنچی۔ لاگت تین لاکھ (۳۰۰۰۰۰) روپیہ بیان کی جاتی ہے، جو اب تین لاکھ ہی مرتبہ اس مسجد پر سے نچھاور کرنے کو جی چاہتا ہے۔ (ماخوذ از ارض تاج مصنفہ واحد یار خان بی۔اے) خانصاحب مولوی محمد اسمعیل خان مرحوم ہیڈ مولوی نارمل اسکول آگرہ نے اس کی سادگی اور موجودہ دردناک حالت کا فوٹو بہ عنوان مثمن "قلعہ آگرہ" کے جن پُر درد و پُر اثر اشعار میں کھینچا ہے۔ درج ذیل ہیں:۔ ~

وہ مسجد زیبا کہ ہے اس بزم کی دلہن خوبی میں یگانہ ہے مگر سادہ و پُرفن

نوٹ نمبر۵ ۔ اردو صاحبِ "شعر الہند" کی رائے ہے کہ اُردو زبان اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں جنم لے چکی تھی۔ اور قطب شاہی دور میں دکن میں بہت کچھ ترقی پا چکی تھی۔ زبان کی حیثیت سے اس کو اورنگ زیب کے عہد میں اس کی فتوحات دکن کے زمانہ سے ماننا چاہیئے۔ اس کے بعد کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ جن میں پایا جاتا ہے کہ فارسی شعرا ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگے تھے۔ اور اسی کو انہوں نے اُردو کی ابتدا مانی ہے۔ لیکن صاحب ادبیات و صاحب آثار الصنادید شاہجہاں کے عہد میں اس کا وجود میں آنا بیان کرتے ہیں اور یہی متفقہ جمہور ہے +

اخبار "العدل" بدایوں کی اشاعت ۱۹۔ مارچ ۲۶ء کے بیان کے مطابق ہندوستان کے ان باشندوں کی تعداد جن کی مادری زبان اُردو یا ہندوستانی ہے دس کروڑ کے قریب ہے۔ اگر اس میں وہ لوگ بھی شامل کرلئے جائیں جن کی زبان رپورٹ مردم شماری میں راجستانی یا مارواڑی دکھائی گئی ہے اور ماہرین لسان اقرار کرتے ہیں کہ یہ بھی محض مغربی ہندی یا اُردو کی ایک شاخ ہے تو اُردو کے کل اہل زبان گیارہ کروڑ ہوتے ہیں۔ اور زبان اُردو دنیا کی سب سے بڑی سات زبانوں میں شمار ہوسکتی ہے۔ بولنے والوں کی کثرت اور علاقوں کی وسعت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی زبانیں حسب ذیل ہیں:۔
چینی، انگریزی، جرمنی، روسی، عربی تاتاری اور اُردو ۱۲۔ +

ولادت

اس خوش نصیب، اقبالمند اور ہردلعزیز بادشاہ کا مہرِ وجود مانؒ متی جودھ بائی دختر راجہ اُودے سنگھ، راٹھور والئ جودھپور کے برج حمل سے ۱۵۹۱ء = ۳۶ جلوس اکبر شاہی میں بمقام لاہور طلوع ہوا +

اس زمانہ کے منجمین نے اسے "صاحبقرانؔ" مانا ہے۔ اور چونکہ اس خاندان کا مورث اعلیٰ تیمورلنگ بھی "صاحبقران" تھا۔ اس لئے اس کو "صاحبقران ثانی" کہا جاتا ہے۔ اس کا عالم شاہزادگی کا نام "خورم" تھا اور جہانگیر اس کو پیار میں "بابا" کہا کرتا تھا +

نوٹ نمبر۱ ۔ مان متی جودھ بائی ۔ یہ رانی "جگت گسائیں" کے نام سے مشہور ہے راجہ مالدیو کی پوتی اور راجہ اودے سنگھ راٹھور عرف راجہ موٹہ" فرمانروائے جودھپور کی بیٹی تھی۔ ۱۹۔ رجب ۹۹۳ھ کو شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کے ساتھ بیاہی گئی۔ نہایت حسین، دانشمند، نیک طینت، باسلیقہ، خوش بیان، شیریں کلام اور حاضر جواب رانی تھی۔ اس کی حاضر جوابی کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ نورجہاں بیگم میں

تیسرا دہلی میں جو لاہوری دروازے سے باہر فصیل شہر سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے بقول صاحب آثار الصنادید۔ شاہجہان نے اس کی بنیاد تخمیناً سنہ میں جبکہ وہ شہر پناہ بنوا کر فارغ ہوا ہے رکھی تھی۔ اب غیر آباد ہے۔ چند درخت آم کے باقی ہیں۔ جن کا آم بہت ہی خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ اس باغ کا نام اعز آباد رکھا گیا تھا۔ لیکن مشہور نہ ہوا۔ اور شالا ماہی کے نام سے معروف ہے +

لفظ شالا مار کے متعلق خلیفہ سید محمد حسین نے اپنے ترجمہ کردہ وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر کے حواشی میں لکھا ہے "ٹیک چند بہار نے اس کو سنسکرت کا لفظ بتایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "شالا" اور "مار" سے مرکب ہے۔ جو بمعنی "خانہ شہوی" کے ہے۔ اور مجازاً باغ کے معنی میں مستعمل ہو گیا ہے۔ اس کی سند میں مرزا عبدالغنی قبول کا یہ شعر لایا ہے ؎

زباغ زلف درخ یار دادہ است فراغم — کہ سنبل حبش کم ز شالا مار نباشد

لیکن ان معنوں کی غلطی خود ظاہر ہے۔ کیونکہ شاعر نے اس لفظ کو باغ کے عام معنوں میں نہیں لیا ہے اور ظاہرا یہ ترکیب قواعد زبان سنسکرت کے بھی خلاف معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ لفظ ہندی ہوتا تو مار شالا ہونا چاہئے تھا۔ جیسے دھرم شالا۔ پاٹ شالا۔ گئو شالا وغیرہ۔ اصل یہ ہے کہ یہ صرف اس جگہ کا نام تھا جہاں شہنشاہ جہانگیر کے پندرھویں سال جلوس میں شاہجہان نے باپ کی فرمائش سے باغ بنایا تھا اور مقام تعمیر کی مناسبت سے اس کا نام شالا مار پڑ گیا تھا۔ جس کو شاہجہان نے اپنے عہد کے ساتویں سال میں بدل کر فرح بخش نام رکھا۔ چنانچہ تزک جہانگیری اور شاہجہان نامہ وغیرہ کتب تاریخ میں صاف اور صریح لکھا ہے اور دیوان کرپا رام صاحب نے جو اپنی کتاب موسوم بہ گلزار کشمیر کے صفحہ ۲۱۰ پر شاہجہان کا ایک فرمان نقل کیا ہے۔ اس کے ایک فقرے سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ فقرہ یہ ہے۔ "باغ فرح بخش کہ واقع است در موضع معروف شالما ما بدولت و اقبال در ایام فرخندہ فرجام شاہزادگی احداث فرمودہ بودیم" +

میری رائے میں خلیفہ محمد حسین صاحب کا قیاس بہت ہی مدلل اور صحت سے بہت زیادہ قریب ہے لیکن ٹیک چند بہار کی تحقیق کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا کیونکہ صاحب آثار الصنادید نے جو جہانگیر جیسے محقق بادشاہ کا قول توزک جہانگیری اور مرآت آفتاب نما کے حوالے سے نقل کیا ہے اس سے بھی بہار کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔ جہانگیر لکھتا ہے "شالا مار دو ہندی لفظوں شالا (بمعنی کھڑکی) اور مار (بمعنی عیش یا خوشی) سے مرکب ہے جس کے معنی "دریچۂ فرح" ہیں +

میں نے خود اس زمانے کی ترتیب یافتہ زبان سنسکرت کی مستند لغت موسومہ سنسکرت انگلش اسٹنڈرڈ ڈکشنری سے تحقیق کیا ہمیں مار کے معانی مارنا، مخالفت، محبت خدا، عیش، خواہش نفسانی اور شیطانی وغیرہ کے ہیں اور شالا کے معانی مکان، کوٹھڑی اور شاخ درخت کے اس حیثیت سے بھی بہار کی تحقیق محقق اور اس کی رائے صائب ہے۔ لیکن جہانگیر کی تحقیق مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ نہ لغت مذکور میں شالا کے معنی دریچہ کے نکلے اور نہ مجھے دیگر ذرائع سے تحقیق ہو سکے۔ لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کل بول کر جزو مراد لیا گیا ہے تو اس کی رائے بھی صحیح ہوئی جاتی ہے اور غالباً ایسا ہی ہوگا +

یہ بہت ممکن ہے کہ شالا مار کشمیر کا نام محل وقوع کی حیثیت سے شالا مار رکھتے وقت اس میں یہ معنوی خوبی بھی مدنظر رکھی گئی ہو جس کا اور باغوں کے تسمیہ میں خصوصیت کے لحاظ رکھا گیا ہو

ممتاز محل کی لاش پہلے باغ آہو خانہ (المعروف بہ باغ زین آباد) واقع برہانپور میں دریائے تاپتی کے اس پار امانتاً سپرد زمین کی گئی۔ بیدل خان نے تاریخ لکھی ؎

جائے ممتاز محل جنت باد

۱۰ ۵ ۴۰

۶ مہینے کے بعد ۱۷۔ جمادی الاول ۱۰۴۱ھ کو مرحومہ کی نعش شاہزادہ محمد شجاع، جہاں آرا بیگم، وزیر خاں اور صدر النسا ستی النسا خانم (اخت طالب آملی) کی معیت میں دارالخلافہ آگرہ کی طرف منتقل ہوئی۔ برہانپور سے آگرہ تک بیشمار روپے اور مختلف قسم کے کھانے غربا میں تقسیم کئے گئے۔ چونکہ مقبرے کی عمارت ابھی زیر تعمیر تھی اور مدفن نامکمل اس لئے مسجد روضہ کے جنوب کی طرف (چبوترے سے اتر کر) باغ میں دوبارہ امانتاً مدفون کی گئی۔ اور ۱۵۔ جمادی الثانی ۱۰۴۱ھ کو اپنی اصلی جگہ پر دفن ہوئی۔ ممتاز محل کا مقبرہ جو "تاج محل" یا "تاج" یا "تاج بی بی کا روضہ" یا "روضہ" کر کے مشہور ہے۔ دنیا کی بے مثل، عدیم النظیر اور ایک ایسی عمارت ہے۔ جو اپنی مثال آپ ہے۔ اور مختلف مذاہب اور ممالک کے سیاح اس کے دیدار کو اپنے لئے سرمایہ صد نازش و افتخار سمجھتے ہیں +

ممتاز محل ایک نہایت درجہ حسین، ادب شناس، مراتب پرستاری سے بخوبی واقف، قابل اور روشن دماغ بیگم تھی۔ اس کی فیاضی و رحمدلی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اس نے صدہا مفلس و نادار لوگوں کی لڑکیوں کی شادیاں اپنے صرفے سے کرادیں۔ بیشمار محتاجوں کو مالدار و صاحب ثروت بنا دیا۔ ہزاروں مجرموں کو جو سزائے موت کے سزاوار تھے رہائی دلوائی +

وہ بڑی ذکی، فہیم اور صائب الرائے عورت تھی۔ یہی وجوہ ہیں جن کے باعث شاہجہاں کو ایک لحظہ کے لئے اس کی جدائی گوارا نہیں ہوتی تھی۔ سفر، حضر، رزم، بزم، غرض ہر جگہ اور ہر حال میں وہ اس کی رفیق و ہمدم ہوتی تھی۔ خوفناک حالتوں میں وہ بادشاہ کو بہت عمدہ رائیں دیا کرتی تھی۔ اس جلیل القدر بادشاہ کے بہت سے مشہور و معروف کارنامے اسی سنجیدہ بیگم کے قیمتی اور قابل قدر مشوروں کے مرہون منت ہیں +

یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ اس مشہور عصر و شہرہ آفاق بیگم کی تعلیم و تربیت کی خدمت کن ستودہ صفات دلائق ستائش ہستیوں کے حصے میں آئی تھی۔ لیکن اس کی موزونی طبعی، حاضر جوابی، طالبائے آملی کی بہن صدر النسا ستی النسا خانم کا اس کی بارگاہ میں منصب مصاحبت پر سرفراز ہونا وغیرہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ لائق و یکتائے روزگار ماں باپ نے چہیتی اور لاڈلی بیٹی کو شہنشاہ ہند کی رفیقہ حیات بنانے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ پھر یہ اس گھر کی بیٹی تھی جس گھر کی علمیت، قابلیت اور دانائی ہمیشہ کنیز بنی رہی۔ اعتماد الدولہ، آصف خاں، دیوانجی بیگم، اور نورجہاں بیگم وہ مقتدر ہستیاں تھیں۔ جن کے علم و فضل کی تعریف میں ایک عالم رطب اللسان ہے۔ اس گھرانے کی لڑکی جو کچھ بھی نہ ہو تھوڑا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ مورخین قدیم کسی شخص کی زندگی پر ہر پہلو سے یکجائی بحث نہیں کرتے اور اکثر عام حالات کو نظر انداز کرنے کے عادی ہیں۔ جو موجودہ زمانے کے مورخین کی نظر میں اگلے زمانہ کی تہذیب سے

اور اس میں اکثر رقیبانہ نوک جھونک رہا کرتی تھی۔

لطیفہ۔ فتح پور سیکری جیسا دلکش مقام تھا اور ہر طرف سکوت طاری، چاندنی رات تھی اور زمین سے آسمان تک عالم نور، ہر چیز پر بیخودی چھائی ہوئی تھی مے و مینا کا دلدادہ جہانگیر شغل مے نوشی میں مصروف تھا۔ اس کی محبوبہ نورجہاں اپنے عادت کے موافق سفید لباس زیب تن کئے پہلو میں بیٹھی ہوئی زہد شکن اور ستوالی اداؤں سے اس کا دل لبھا رہی تھی۔ یکایک اس منظر پر کیف سے سرشار بادشاہ کو جودھ بائی یاد آئی۔ اور اس کے شریک صحبت ہونے کا حکم ہوا۔ پرستاریں دوڑیں اور یہ آن کے آن میں سرخ لباس میں ملبوس بادشاہ کے برابر آکر بیٹھ گئی۔ بادشاہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ نورجہاں کو رشک ہوا۔ بادشاہ سے کہنے لگی: "دیکھئے! جودھ بائی آخر ہے نا ایک زمیندار کی بیٹی اور ہندوستانی گنوار یا؟ کوئی پوچھے اس وقت سرخ جوڑا پہننے کی کیا تک تھی؟ جہانگیر نے جودھ بائی کی طرف ایک معنی خیز نظر ڈالی کہ کیا جواب ہے؟ جودھ بائی نے عرض کیا "حضور! ان کا سہاگ تو شیر افگن خان کے مرنے سے اجڑ گیا۔ اللہ رکھے میرا سہاگ بھاگ قائم ہے اور یہ دوہا پڑھا:

جار نار تاسس کا ہیّا ایک چھوڑ جن دوجا کیا

نورجہاں بید خفیف ہوئی اپنا سامنہ لے کر رہ گئی اور اس قدر جھینپی کہ اٹھ کر چلدی۔ جہانگیر ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گیا +

قلعہ آگرہ و فتح پور سیکری میں جودھ بائی کے عالیشان محلات اب تک اس کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ اس نے آگرہ میں "سہاگ پورہ" کے نام سے ایک محلہ آباد کرکے اس میں اپنے عالیشان محلات و باغات تعمیر کرائے تھے۔ اب یہ محلہ ویران ہوچکا ہے۔ صرف اس کے عالیشان مقبرے کے جو اسی محلہ میں واقع تھا مٹے مٹے سے نشانات باقی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقام اب تک جودھ بائی کے نام سے مشہور اور موضع بھوگی پورہ پرگنہ صدر تحصیل آگرہ میں شہر کے متصل واقع ہے۔ اس لائق وفائق رانی نے بروز جمعہ ۳۰۔ ربیع الثانی ۱۰۲۸ھ کو رحلت کی۔ جہانگیر کو بہت رنج ہوا۔ دوسرے دن غمزدہ بیٹے (خورم) کے مکان پر خود گیا اور اسے تسلی تشفی کرکے اپنے ساتھ لے آیا۔ (ماخوذ از امرائے ہنود۔ دربار اکبری، تاریخ ہند مصنفہ ای مارسڈن، ماثرالامرا بادشاہنامہ وغیرہ)۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲۔ راجہ اُودے سنگھ راٹھور۔ موٹہ راجہ عرف — سنہ پیدائش لامعلوم۔ راے مالدیو فرمانروائے جودھ پور کا بڑا بیٹا تھا۔ راے مالدیو امارت و جمعیت لشکر کی حیثیت سے تمام راجگان ہند میں ممیز و ممتاز راجہ تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا "چندرسین" اس کا جانشین ہوا جس نے ۱۵ جلوس اکبر شاہی میں اکبر کی اطاعت قبول کرلی تھی لیکن ۱۹ جلوس میں باغی ہوگیا۔ شاہی فوجیں اس کی گوشمالی کے لئے متعین ہوئیں۔ کئی معرکوں کے بعد ۲۵ جلوس میں پاینده خان مغل سے شکست فاش کھاکر بھاگا اور روپوش ہوگیا۔ اس کی فراری کے بعد راجہ اودے سنگھ مسند نشین حکومت جودھ پور ہوا اور اس قدر اکبر کے اخلاق و محبت کا گرویدہ ہوا کہ خاندانی رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر اس نے اپنی چہیتی بیٹی (جودھ بائی) ولیعہد سلطنت شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کو بیاہ دی۔ اکبر خود امراء و بیگمات کے ہمراہ راجہ کے مکان پر بیٹے کے

میں اپنے اور پرائے کا امتیاز نہیں کرتے۔ بے تکلفی کے ساتھ اپنے عیوب کا اعتراف اور دوسرے کی خوبیوں کا اقرار کر لیتے ہیں (بامداد تاریخ ہند مصنفہ مسٹر اسمتھ، تاریخ ہند مصنفہ ابو البشیر شاہد ایم۔ اے، تاریخ ہند مصنفہ اے مارسڈن صاحب بی۔ اے۔ تاریخ ہند جلد ہفتم شمس العلما مولوی ذکاءاللہ مرحوم۔ آئینہ اکبری۔ سیر المتاخرین۔ بادشاہنامہ ملا عبدالحمید لاہوری۔ جہاں آرا مصنفہ مولوی محبوب الرحمن کلیم بی اے وکیل اورنگ زیب مصنفہ پروفیسر سرکار بالقابہ۔) ۱۲۔

نوٹ نمبر ۳۔ قلعۂ معلی (دہلی) شاہجہان نے اپنے جلوس کے بارہویں سال مطابق ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء میں شاہجہان آباد (دہلی جدید) کی آبادی کا حکم دیا۔ ۱۲ ذالحجہ کو یہ قلعہ بننا شروع ہوا۔ استاد حامد اور احمد معمار جو اپنے فن میں یکتا تھے اس کی تعمیر کے لئے مقرر ہوئے۔ پہلے عزت خاں کو اس کا اہتمام ملا۔ پانچ مہینے دو دن میں قلعہ کی بنیادیں کھدیں اور کچھ مسالہ جمع ہوا۔ اور کہیں کہیں سے بنیاد اونچی بھی ہو آئی۔ پھر الہ وردی خان کو یہ کام سپرد ہوا۔ اور دو برس ایک مہینہ گیارہ دن میں قلعہ کے سب طرف کی دیوار ۱۲-۱۲ گز اونچی ہو گئی۔ پھر مکرمت خاں کے سپرد انتظام کیا گیا۔ بیسویں سال جلوس لیعنی قریب نو برس کے عرصہ میں مکمل ہوا۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء یعنی تخت نشینی کے اکیسویں سال میں بادشاہ نے اس میں پہلا جلوس کیا۔ یہ قلعہ ہشت پہلو بنا ہے۔ اس کا طول ایک ہزار گز، عرض چھ سو گز ہے۔ قلعہ آگرہ سے گویا دوگنا ہے۔ اس کی فصیل ۲۵ گز اونچی اور بنیاد ۱۱ گز گہری ہے۔ دیوار کا آثار بنیاد سے پندرہ اور اوپر سے ۱۱ گز کا ہے۔ اس کی خندق ۲۵ گز چوڑی اور ۱۰ گز گہری بنی ہے۔ جس کا محیط تین ہزار چھ سو گز ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر میں پچاس لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ بقول صاحب مرأت آفتاب نما ایک کروڑ روپیہ لاگت آئی جس میں سے پچاس لاکھ تعمیر قلعہ میں اور پچاس لاکھ اندر والے محلات وغیرہ کی تعمیر میں خرچ ہوا ہے۔ اس قلعہ میں عمارات خاص و عام۔ غسل خانہ۔ محل سرائے اور عالمگیر کی بنائی ہوئی موتی مسجد قابل دید اور بے نظیر عمارتیں ہیں۔ اگر اس قلعہ کو ہندوستانی عمارات، پچی کاری، منبت کاری، صنعت گری، دستکاری کا عجائب خانہ کہا جائے تو بہت ہی موزوں ہوگا۔ (ماخوذ از سفرنامہ ڈاکٹر برنیر۔ آثار الصنادید سرسید۔ ظفرنامہ شاہجہان و قصص ہند آزاد)

نوٹ نمبر ۴۔ جامع مسجد (دہلی) اس کی بنیاد ۱۰۶۰ھ ۱۶۵۰ء ۲۴ ج میں رکھی گئی تھی۔ پانچ ہزار مزدور، بیلدار اور سنگ تراش روزانہ کام کرتے تھے۔ تب بھی چھ برس میں دس لاکھ روپیہ کے صرف سے بن کر تیار ہوئی تھی۔ اسکے تین گنبد ہیں۔ نوے گز طول اور تیس گز کے عرض میں۔ اندر کو سات محرابیں۔ باہر صحن کی طرف گیارہ دروازے ہیں جن میں ایک تو بہت بلند ہے اور ۵-۵ ادھر ادھر والے ذرا نیچے ہیں۔ بڑے دروازے پر کلمہ یا ہادی بطور طغرا اور باقی دروازوں پر شاہجہان کے نام کا کتبہ، تاریخ تعمیر اور زر مصارف جس کو نوراللہ خوشنویس نے خط نسخ میں لکھا تھا۔ سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے بنا ہوا ہے۔ دروازوں کے دونوں طرف نہایت بلند اور خوشنما مینار ہیں۔ جن میں اوپر جانے کے لئے زینے اور سروں پر بارہ دری کی برجیاں بہت ہی دلکشا بنی ہوئی ہیں۔ شمالی مینار بجلی کے صدمے سے گر پڑا تھا اور فرش صحن بھی جو سنگ سرخ کا ہے خراب ہو گیا تھا۔ ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۷ء میں دولت برطانیہ نے دونوں کی تعمیر و مرمت کرا دی۔ چونکہ اس مسجد میں کوئی مکبر نہ تھا۔ اس لئے شہزادہ مرزا سلیم بن معین الدین محمد اکبر شاہ بادشاہ نے ۱۲۴۵ھ ۱۸۲۹ء میں بیچ دروازے کے بیچ میں سنگ باسی کا بہت ہی خوشنما مکبر چنوا دیا ہے۔ مسجد کے اندر سنگ مرمر کا فرش ہے جس میں سنگ موسیٰ کی پچی کاری سے مصلے بنائے گئے ہیں۔ منبر بھی سنگ مرمر کا بہت خوش قطع بنا ہوا ہے۔ شمالی دالان میں کچھ تبرکات محمدؐ کے رکھے ہیں اور وہ مقام درگاہ آثار شریفہ کہلاتا ہے

آشنائی بہم پہنچانے کے لئے ایک رہبر کامل کا کام دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس بیگم کی تعلیم، تربیت علم و فضل کے متعلق قلم اٹھانے سے معذور ہیں۔ اور صاحب کتاب "جہان آرا" کی نوشتہ چند سطور اور ایک واقعے کے قلمبند کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جس سے فہیم، سنجیدہ اور با مذاق حضرات بہت کچھ کھوج لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ کتاب مسطور کے مصنف نے بھی اسی طرح صدہا کتابوں کی ورق گردانی کر کے ایک ایک جملہ ڈھونڈ کر اس کتاب کو جمع کیا ہے۔ جس طرح آج کوئی اور بیٹھا ہوا کر رہا ہے۔

وہ لکھتے ہیں "ارجمند بانو (ممتاز محل) زیور علم و فضل سے آراستہ تھی۔ شعر و سخن میں بھی اس کو دخل تھا۔ ایک مرتبہ شاہجہان جمنا کے کنارے تفریح طبع کی غرض سے بیٹھا ہوا تھا۔ اور قدرت کے دلکش مناظر کی سیر کر رہا تھا۔ اس موقع پر بیگم بھی وہاں جلوہ گر تھی۔ شاہجہان نے دریا کی موجوں کی طرف اشارہ کر کے ممتاز محل سے کہا ؎

"آب از برائے دیدنت می آید از فرسنگ ہا"

ممتاز محل نے برجستہ کہا ؎ "از ہیبت شاہِ جہاں سر می زند بر سنگ ہا"

عہدِ حاضرہ کے ایک مشہور مورّخ کی تصنیف کردہ "تاریخ ہند" میں جو ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے مدارس میں بطور نصاب پڑھائی جاتی ہے۔ میں نے اس بیگم کے متعلق لکھا ہوا دیکھا "وہ بڑی پکی مسلمان تھی" اور غور کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ فاضل مورّخ نے لفظ "مسلمان" بطور ہجو ملیح "شمشیر زن" یا "سفاک" کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ جو ایک صریحی غلطی اور بیجا الزام ہے۔ میرے رائے میں مصنف موصوف کی رائے اس لئے چشم پوشی کے قابل ہے کہ انہوں نے اہل مغرب کا تتبع کیا ہے۔ لیکن اس لئے وہ قابل گرفت ہیں۔ کہ انہوں نے باوجودیکہ ان کی آنکھیں نئی روشنی سے منور تھیں۔ اہل مغرب کی تقلید کو روش کی ہے ان کا ماخذ غالباً منوچی کی کتاب موسومہ "منوچی اسٹوریا ڈو موگور" ہے۔ منوچی کے متعلق اس زمانہ کے مشہور و معروف مورّخ عالی جناب بابو جادو ناتھ صاحب سرکار بالقابہ اپنی شہرہ آفاق تصنیف "اورنگ زیب" میں تحریر فرماتے ہیں۔ ایک معمولی کم علم آدمی تھا۔ بہت ہی ستم رسیدہ تھا۔ اس نے بہت سی باتیں زمانۂ ماقبل کی لکھی ہیں۔ اور وہ بھی صرف یادداشت سے۔ اس نے بہت سی باتیں خلاف قیاس و برعکس واقعات بھی لکھی ہیں" اس واسطے ہم اس کی باتوں کو صحیح نہیں سمجھتے۔ منوچی کی کتاب اس لئے بھی ہر معاملے میں خصوصاً شاہجہان وغیرہ کی ذاتیات کے متعلق ماخذ بنانے کے قابل نہیں۔ کہ اس کے ہم قوم اور ہم مذہب پرتگیزی (پرتگالی) شاہجہان کے ہاتھوں اور بقول مسٹر اسمتھ ممتاز محل کے اشارے سے قتل و غارت کئے گئے تھے۔ وہ اگر ممتاز محل اور آل تیمور کو متہم نہ کرتا تو اور کون کرتا۔ رہا شاہجہاں سو قوم مذکور کی تباہی کے معاملے میں اس کی نظر ہندو مسلم قوم کے مفاد پر تھی، سیاسی نقطۂ نظر سے اس کا یہ فعل کسی پہلو سے نکتہ چینی کے قابل نہیں۔ اسی قسم کی غلط روایات دو ہندی بھائیوں (ہندو مسلمانوں) میں باہمی تنافر و تفریق کا باعث ہوئی ہیں۔ اول تو ہمیں سرکار موصوف کا اتباع کرنا چاہیئے کہ زیادہ تر اسی زمانہ کے مورخوں کی تاریخوں، درباریوں اور حاشیہ نشینوں کی تصانیف سے استخراج و اخذ واقعات کریں ورنہ پھر ان منصف مزاج اور محقق اہل مغرب کی کتابوں کو ذریعہ معلومات بنائیں۔ جو اظہار صداقت

محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن — موتی سے ہیں دالان، تو ہے دودھ سا آنگن
کافور کا تو دہ ہے کہ الماس کا معدن — یا فجر کا مطلع ہے کہ خود روز ہے روشن
بلور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس — باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوتِ احساس
ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے — سانچے میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
یا تار نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے — مرمر میں مہ و مہر کا سا نور و ضیا ہے
نے شمع، نہ فانوس، نہ بتی، نہ دیا ہے — ہاں چشمۂ خورشید سے آب اس نے پیا ہے
چلئے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور — نظارے کی دو مجھ کو اجازت ابھی کچھ اور
مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی — "اس قلعہ میں ہیں شاہجہاں کی ہیں نشانی"
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اس نے کہانی — کچھ حالت موجودہ بایں شعر بیانی
اُن حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی — فواروں کے دل میں بھی ہے اک درد نہانی
تسبیح، نہ تہلیل، نہ تکبیر و اذاں ہے — بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفل گراں ہے
جمگھٹ تھا کبھی یاں وزراء و امراء کا — مجمع تھا کبھی یاں علما و صلحا کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکر خدا کا — ہوتا تھا ادا خطبہ صد احمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھیرا تھا یہاں عزّ و علا کا — جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا
ہیں اب تو ہماری مرے باقی یہی دو تین — یا دھوپ ہے، یا چاندنی، یا سایہ مسکین"

نوٹ نمبر ۶۔ حیات بخش ۔قلعۂ دہلی کا مشہور و معروف پُر فضا باغ ہے۔ یہ باغ اپنے احیاض و عمارات سمیت ۱۰۵۸ھ۔ ۲۱ سنہ جلوس میں بن کر تیار ہوا تھا۔ اس کے حوض کے وسط میں ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ ظفر (المتوفی ۷۔نومبر ۱۸۶۲ء) نے ۱۲۵۸ھ ۔ ۶ سنہ جلوس میں سنگ سرخ کا محل بنا کر اس کا تاریخی نام "ظفر محل" رکھا تھا۔ جو اب "جل محل" کے نام سے مشہور ہے۔ اب یہ باغ مغربی طرز پر آراستہ پیراستہ ہے۔ اس کی سرسبزی و شادابی کا ہر بادشاہ نے بہت لحاظ رکھا۔ خصوصاً عالمگیر کو اس کی تازگی پر خاص توجہ تھی۔ (ماخوذ از آثار الصنادید و رقعات عالمگیری) ۱۲

نوٹ نمبر ۷۔ شالامار ۔تین باغوں کا نام ہے۔ جن میں سے ایک کشمیر میں وہاں کی مشہور جھیل (ڈل) اور اس کے ادھر والے پہاڑوں کے درمیانی پہاڑوں کے ڈھال پر واقع ہے۔ یہ باغ بہت ہی پر فضا اور عجیب و غریب درختوں سے پُر ہے۔ اس باغ کو جہانگیر کے پندرھویں سال جلوس میں شاہجہان نے باپ کی فرمائش سے بنایا اور مقام تعمیر کی مناسبت سے اس نام سے موسوم کیا تھا۔ گو شاہجہان نے اپنے جلوس کے ساتویں سال اس کا نام بدل کر "فرح بخش" رکھ دیا تھا۔ لیکن اس نام نے رواج نہ پایا۔ صرف کتابوں اور کاغذات میں لکھا جاتا رہا۔ عام لوگ "شالامار" ہی کہتے رہے۔ آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ دوسرا لاہور میں۔ یہ شاہجہان کے عہد میں اسی کی فرمائش سے شالامار کشمیر کی طرز پر تعمیر ہوا تھا اور باغ فیض بخش کے نام سے موسوم کیا گیا تھا اب بھی لاہور میں موجود ہے۔ بہترین باغوں میں شمار ہوتا ہے۔ نام نے اس کے بھی رواج نہ پایا اور "شالامار" ہی کہلایا

صحن مسجد عرض و طول سے ۱۳۶ گز ہے۔ جس کے وسط میں ۱۵x۱۲ گز کا خالص سنگ مرمر کا حوض ہے۔ اور اس میں فوّارہ لگا ہوا ہے۔ صحن کے گرد دالان، حجرے اور مکانات بنے ہوئے ہیں۔ چاروں کونوں پر بارہ دری کے چار برج ہیں۔ جنوبی و مشرقی دالان کے سامنے دائرۂ ہندی وقتِ نماز دیکھنے کا بنا ہوا ہے۔ تینوں دروازہ ہائے مسجد میں برنجی پھاٹک چڑھے ہوئے ہیں۔ جنوبی دروازے پر رہائش کے قابل حجرے بنے ہوئے ہیں پینتیس ۳۵ سیڑھیاں ہیں جن پر تیسرے پہر کو بازار لگتا اور مجمع عام ہوتا ہے۔ اس مسجد کا مہتمم پانچ مہینے تک جعفر خان دو سال تک خلیل اللہ خاں تین سال پانچ مہینے۔ سعد اللہ خاں، اور اس کے انتقال کے بعد روح اللہ داروغہ عمارت رہا اسی کے زمانہ میں بن کر تمام ہوئی تھی۔ کسی نے تاریخ کہی۔ ع

مسجد شاہ جہاں قبلۂ حاجات آمد

اور گو ایک سال کا فرق ہے۔ یعنی مسجد بنی ہے ۱۰۶۶ھ میں اور اس تاریخ سے ۱۰۶۷ھ نکلتا ہے۔ لیکن جدت ادا کی بنا پر بادشاہ نے بہت پسند کی (ماخوذ از آثار الصنادید و سیر المتاخرین) +

نوٹ نمبر ۵۔ موتی مسجد (آگرہ)۔ قلعہ آگرہ میں دہلی دروازے کے اندر داخل ہونے کے بعد سب سے پہلی عمارت یہی ہے۔ یہ مسجد بہت ہی خوبصورت ہے۔ اور ایک مرتفع چبوترے پر بنی ہوئی ہے۔ اس کی مغربی شمالی دیواریں ۲۳۴ فٹ لمبی ہیں۔ اور شمالی و جنوبی دیواریں ۱۸۷ فٹ کی ہیں۔ باہر تو سنگ سرخ ہے جو اپنی سادگی میں بھی لطف دیتا ہے۔ لیکن اندر قبۂ نور ہے۔ نرا سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے۔ اور کاریگری باعتبار تناسب ختم کر دی گئی ہے۔ اس کی اعلیٰ خوبصورتی (Classic Beauty) کو قلم کی مجال نہیں کہ تحریر میں لا سکے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملاءِ اعلےٰ سے جنّت کا جگر پارہ اس فرش خاکی پر عقل انسانی کو حیرت میں ڈالنے کے لئے اتر آیا ہے۔ صحن مسجد ۱۵۵ فٹ مربع ہے۔ بیچ میں پیارا چوکور حوض ہے۔ اور جنوبی و مشرقی گوشہ میں ایک دھوپ گھڑی نہایت نفیس بنی ہوئی ہے۔ صحن کے تین طرف خوشنما دالان دلفریبی پر حکومت کر رہے ہیں۔ جن کی چوڑائی گیارہ فٹ ہے۔ دالان مسجد ۱۴۲ فٹ لمبا اور ۵۷ فٹ چوڑا ہے۔ اس کے اوپر تین سڈول اور پر نزاکت گنبد ہیں۔ اور ہر گوشے میں ایک مینار ہے گنبدوں کے واسطے ہیول لکھتا ہے " بالکل کلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ جو کھلنے کو ہیں"۔ مسجد کے دونوں طرف حجرے ہیں جو غالباً مستورات کے واسطے مخصوص ہونگے۔ کیونکہ ان میں پتھر کی سبک اور نفیس جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ مسجد رنگ آمیزی سے بالکل معرا ہے۔ البتہ صفوں میں زرد پتھر (کھٹوا) دیا گیا ہے۔ مگر سادگی بھی وہ بلا کی ہے جس کے لئے بے اختیار منہ سے نکلتا ہے۔ ع

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

اس مسجد کو شاہجہان نے بنوایا تھا۔ ۱۶۴۸ء میں بننا شروع ہوئی، اور ۱۶۵۵ء میں اختتام کو پہنچی۔ لاگت تین لاکھ (۳۰۰۰۰۰) روپیہ بیان کی جاتی ہے۔ جواب تین لاکھ ہی مرتبہ اس مسجد پر سے نچھاور کرنے کو جی چاہتا ہے۔ (ماخوذ از ارض تاج مصنفہ واحد یار خان بی۔ اے) خانصاحب مولوی محمد اسمٰعیل خان مرحوم ہیڈ مولوی نارمل اسکول آگرہ نے اس کی سادگی اور موجودہ دردناک حالت کا فوٹو بہ عنوان مضمون "قلعہ آگرہ" کے جن پُر درد و پُر اثر اشعار میں کھینچا ہے۔ درج ذیل ہیں :۔ ؎

وہ مسجد زیبا کہ ہے اس بزم کی دلہن   خوبی میں یگانہ ہے مگر سادہ و پُر فن

نوٹ نمبر۹۔ اردو صاحبِ "شعر الہند" کی رائے ہے کہ اُردو زبان اکبر اور جہانگیر کے زمانہ میں جنم لے چکی تھی۔ اور قطب شاہی دور میں دکن میں بہت کچھ ترقی پا چکی تھی۔ زبان کی حیثیت سے اس کو اورنگ زیب کے عہد میں اس کی فتوحات دکن کے زمانہ سے ماننا چاہیئے۔ اس کے بعد کچھ مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ جن میں پایا جاتا ہے کہ فارسی شعرا ہندی کے الفاظ استعمال کرنے لگے تھے۔ اور اسی کو انہوں نے اُردو کی ابتدا مانی ہے۔ لیکن صاحبِ آبحیات و صاحبِ آثار الصنادید شاہجہاں کے عہد میں اس کا وجود میں آنا بیان کرتے ہیں اور یہی متفقہ جمہور ہے +

اخبار "العدل" بدایوں کی اشاعت ۱۹۔ مارچ ۲۶ء کے بیان کے مطابق ہندوستان کے ان باشندوں کی تعداد جن کی مادری زبان اُردو یا ہندوستانی ہے دس کروڑ کے قریب ہے۔ اگر اس میں وہ لوگ بھی شامل کر لئے جائیں جن کی زبان رپورٹ مردم شماری میں راجستانی یا مارواڑی دکھائی گئی ہے اور ماہرین لسان اقرار کرتے ہیں کہ یہ بھی محض مغربی ہندی یا اُردو کی ایک شاخ ہے تو اُردو کے کل اہلِ زبان گیارہ کروڑ ہوتے ہیں۔ اور زبان اُردو دنیا کی سب سے بڑی سات زبانوں میں شمار ہو سکتی ہے۔ بولنے والوں کی کثرت اور علاقوں کی وسعت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے بڑی زبانیں حسب ذیل ہیں:۔
چینی، انگریزی، جرمنی، روسی، عربی تاتاری اور اُردو ۱۲۔ +

ولادت

اس خوش نصیب، اقبالمند اور ہر دلعزیز بادشاہ کا جوہرِ وجود مان متی[۱] جودھ بائی دختر راجہ اُودے سنگھ[۲] راٹھور والئ جودھپور کے برج حمل سے ۱۰۰۰ھ = ۱۵۹۱ء ۳۶ جلوس اکبر شاہی میں بمقام لاہور طلوع ہوا +

اس زمانہ کے منجمین نے اسے "صاحبقران[۳]" مانا ہے۔ اور چونکہ اس خاندان کا مورث اعلیٰ تیمور لنگ[۴] بھی "صاحبقران" تھا۔ اس لئے اس کو "صاحبقران ثانی" کہا جاتا ہے۔ اس کا عالم شاہزادگی کا نام "خورم" تھا اور جہانگیر اس کو پیار میں "بابا" کہا کرتا تھا[۵] +

نوٹ نمبر۱۔ مان متی جودھ بائی[۱]۔ یہ رانی موجگت گسائیں" کے نام سے مشہور ہے راجہ مالدیو کی پوتی اور راجہ اودے سنگھ راٹھور عرف راجہ موٹہ" فرمانروائے جودھپور کی بیٹی تھی۔ ۱۹۔ رجب ۹۹۳ھ کو شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کے ساتھ بیاہی گئی۔ نہایت حسین، دانشمند، نیک طینت، باسلیقہ، خوش بیان، شیریں کلام اور حاضر جواب رانی تھی۔ اس کی حاضر جوابی کے بہت سے لطیفے مشہور ہیں۔ نورجہاں بیگم میں

تیسرا دہلی میں جو لاہوری دروازے سے باہر فصیل شہر سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے بقول صاحب آثار الصنادید۔ شاہجہان نے اس کی بنیاد تخمیناً سنہ میں جبکہ وہ شہر پناہ بنوا کر فارغ ہوا ہے رکھی تھی۔ اب غیر آباد ہے۔ چند درخت آم کے باقی ہیں۔ جن کا آم بہت ہی خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ اس باغ کا نام اعز آباد رکھا گیا تھا۔ لیکن مشہور نہ ہوا۔ اور شالامار ہی کے نام سے معروف ہے +

لفظ شالامار کے متعلق خلیفہ سید محمد حسین نے اپنے ترجمہ کردہ وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر کے حواشی میں لکھا ہے "ٹیک چند بہار نے اس کو سنسکرت کا لفظ بنایا ہے۔ اور لکھا ہے کہ یہ "شالا" اور "مار" سے مرکب ہے۔ جو بمعنی "خانہ شہوی" کے ہے۔ اور مجازاً باغ کے معنی میں مستعمل ہو گیا ہے۔ اس کی سند میں مرزا عبد الغنی قبول کا یہ شعر لایا ہے ؎

زباغ زلف در رخ یار دادہ است فراغم   کہ سنبل سیش کم ز شالامار نباشد

لیکن ان معنوں کی غلطی خود ظاہر ہے۔ کیونکہ شاعر نے اس لفظ کو باغ کے عام معنوں میں نہیں لیا ہے اور ظاہرا یہ ترکیب قواعد زبان سنسکرت کے بھی خلاف معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر یہ لفظ ہندی ہوتا تو مارشالا ہونا چاہئے تھا۔ جیسے دھرم شالا۔ پاٹ شالا۔ گئوشالا وغیرہ۔ اصل یہ ہے کہ یہ صرف اس جگہ کا نام تھا جہاں شہنشاہ جہانگیر کے پندرھویں سال جلوس میں شاہجہان نے باپ کی فرمائش سے باغ بنایا تھا اور مقام تعمیر کی مناسبت سے اس کا نام شالامار پڑ گیا تھا۔ جس کو شاہجہان نے اپنے عہد کے ساتویں سال میں بدل کر فرح بخش نام رکھا۔ چنانچہ تزک جہانگیری اور شاہجہان نامہ وغیرہ کتب تاریخ میں صاف اور صریح لکھا ہے اور دیوان کرپا رام صاحب نے جو اپنی کتاب موسوم بہ گلزار کشمیر کے صفحہ ۲۱۰ پر شاہجہان کا ایک فرمان نقل کیا ہے۔ اس کے ایک فقرے سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ فقرہ یہ ہے۔ "و باغ فرح بخش کہ واقع است در موضع معروف شالامار بدولت و اقبال در ایام فرخندہ فرجام شاہزادگی احداث فرمودہ بودیم"+

میری رائے میں خلیفہ محمد حسین صاحب کا قیاس بہت ہی مدلل اور صحت سے بہت زیادہ قریب ہے لیکن ٹیک چند بہار کی تحقیق کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا کیونکہ صاحب آثار الصنادید نے جو جہانگیر جیسے محقق بادشاہ کا قول توزک جہانگیری اور مرآت آفتاب نما کے حوالے سے نقل کیا ہے اس سے بھی بہار کی رائے کی تائید ہوتی ہے جہانگیر لکھتا ہے "شالامار دو ہندی لفظوں شالا (بمعنی کھڑکی) اور مار (بمعنی عیش یا خوشی) سے مرکب ہے جس کے معنی "دریچۂ فرح" ہیں +

میں نے خود اس زمانے کی ترتیب یافتہ زبان سنسکرت کی مستند لغت موسومہ سنسکرت انگلش اسٹنڈرڈ ڈکشنری سے تحقیق کیا ہے میں مار کے معانی مارنا، مخالفت، محبت خدا، عیش، خواہش نفسانی اور شیطانی وغیرہ کے ہیں اور شالا کے معانی مکان، کوٹھڑی اور شاخ درخت کے اس حیثیت سے بھی بہار کی تحقیق محقق اور اس کی رائے صائب ہے۔ لیکن جہانگیر کی تحقیق مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ نہ لغت مذکور میں شالا کے معنی دریچہ کے نکلے اور نہ مجھے دیگر ذرائع سے تحقیق ہو سکے۔ لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کل بول کر جزو مراد لیا گیا ہے تو اس کی رائے بھی صحیح ہوئی جاتی ہے اور غالباً ایسا ہی ہو گا +

یہ بہت ممکن ہے کہ شالامار کشمیر کا نام محل وقوع کی حیثیت سے شالامار رکھنے وقت اس میں یہ معنوی خوبی بھی مدنظر رکھی گئی ہو جس کا اور باغوں کے تسمیہ میں خصوصیت کے لحاظ رکھا گیا ہو

ادھر نور جہاں نے بھائی (آصف خاں) کو بلا کر اپنے داماد کو بادشاہ بنانے کا مشورہ کیا۔ آصف خاں نے اسے پانے بتے دیئے۔ اور اس کو مع اس کی دوسری بہن اور اس کے شوہر کے اس کا ہم خیال تھا نظر بند کر کے داور بخش بن خسرو کو عارضی بادشاہ بنا کر مقصود خاں کے ساتھ جہانگیر کی نعش کو لاہور روانہ کر کے، شاہجہان کو خبر مرگ جہانگیر دے کر اور اسے دکن سے ہندوستان کی طرف متوجہ ہونے کا اشارہ کر کے خود داور بخش کی رکاب میں لاہور کی طرف کوچ کیا۔ چونکہ وہ بدل شاہجہان کی سلطنت کا خواہاں اور صاحب اثر تھا قریب قریب تمام سردار اسی کے جانب دار تھے +

لاہور سے تین کوس کے فاصلہ پہ داور بخش اور شہریار کے لشکروں میں لڑائی ہوئی شہریار شکست کھا کر قلعہ لاہور میں آیا۔ رات کے وقت ارادت خاں بن مرزا عزیز کوکلتاش خان اعظم نے قلعہ میں پہنچ کر اسے رام کر لیا۔ صبح کو امرا داور بخش کو لے کر قلعہ میں پہنچ گئے۔ اور اسے تخت پہ بٹھا لا۔ فیدی فیروز خان خواجہ سرا نے شہریار کو پکڑ کر الہ وردی خان کے سپرد کر دیا۔ اور وہ دست بستہ شہریار کو داور بخش کے سامنے لایا۔ کورنش کرائی۔ دو تین دن کے بعد شہریار کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ اور وہ اندھا کر دیا گیا۔ شہریار نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی ؎

زنرگس گلاب ارچہ نتواں کشید　　کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من　　بگو "کور شد دیدۂ آفتاب"

یہی تاریخ تاریخ وفات ہوئی۔ کیونکہ ۲۰۔ جمادی الاوّل ۱۰۳۷ھ کو شاہجہان کے اشارے سے آصف خان نے عارضی بادشاہ داور بخش، اس کے بھائی گشتاسپ (ابنائے خسرو) طہورث، ہوشنگ، اور مرزا بایسنقر (ابنائے دانیال) کے ساتھ ہی ساتھ شہریار کو بھی عین جوانی میں صابا او المخاطب بہ خدمت پرست خان کے ہاتھوں لاہور میں قتل کروا دیا۔ نعشوں تک کا پتہ نہ چلا ؎

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا　　کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

شاہجہان کے لئے بساط سلطنت خالی ہو گئی۔ اور اس نے زمام حکومت ہاتھ میں لے کر حکمرانی کرنا شروع کر دی +

شہریار اچھا خاصہ تعلیم یافتہ، بہادر اور سخی طبیعت شہزادہ تھا۔ وہ بیحد حسین تھا لیکن جتنا ہی حسین تھا اتنا ہی بیوقوف بھی تھا۔ اس نے باپ کی تقلید کی۔ یعنی خود کو بی بی کے ہاتھ میں دیدیا لیکن نبھا نہ سکا۔ اس کے ناعاقبت اندیش ہونے میں کلام نہیں۔

(ماخوذ از سیرالمتاخرین، بادشاہنامہ، مآثرالامرا، ظفرنامہ شاہجہان، کارنامہ جہانگیر، قصص ہند آزاد، سیرالمتاخرین، تزک جہانگیری، قاموس المشاہیر، ہسٹری آف جہانگیر بینی پرشاد ہسٹری آف انڈیا اسمتھ، اور اورنٹیل سائکلوپیڈیا ڈکشنری) +

نوٹ نمبر ۲۔ نور جہاں۔ مہرالنسا نام، نور محل اور نور جہاں خطاب، اعتماد الدولہ نواب مرزا غیاث بیگ طہرانی کی بیٹی۔ آصف خان خانخانان کی بہن اور جہانگیر کی شہرہ آفاق ملکہ تھی۔ اعتماد الدولہ کا خاندان دولتِ مغلیہ میں وہی منزلت رکھتا تھا جو دولتِ بنو عباسیہ بغداد میں برمکی خاندان۔ مگر خاندان برمک سیاسیات

اور اس میں اکثر رقیبانہ نوک جھونک رہا کرتی تھی۔

لطیفہ۔ فتح پور سیکری جیسا دلکش مقام تھا اور ہر طرف سکوت طاری، چاندنی رات تھی اور زمین سے آسمان تک عالم نور، ہر چیز پر بیخودی چھائی ہوئی تھی۔ مے و مینا کا دلدادہ جہانگیر شغل مے نوشی میں مصروف تھا۔ اس کی محبوبہ نورجہاں اپنے عادت کے موافق سفید لباس زیب تن کئے پہلو میں بیٹھی ہوئی زہد شکن اور متوالی اداؤں سے اس کا دل لبھا رہی تھی۔ یکایک اس منظر پر کیف سے سرشار بادشاہ کو جودھ بائی یاد آئی۔ اور اس کے شریک صحبت ہونے کا حکم ہوا۔ پرستاریں دوڑیں اور یہ آن کے آن میں سرخ لباس میں ملبوس بادشاہ کے برابر آکر بیٹھ گئیں۔ بادشاہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ نورجہاں کو رشک ہوا۔ بادشاہ سے کہنے لگی "دیکھئے! جودھ بائی آخر ہے نا ایک زمیندار کی بیٹی اور ہندوستانی گنوار یا؟ کوئی پوچھے اس وقت سرخ جوڑا پہننے کی کیا تک تھی؟ جہانگیر نے جودھ بائی کی طرف ایک معنی خیز نظر ڈالی کہ کیا جواب ہے؟ جودھ بائی نے عرض کیا "حضور! ان کا سہاگ تو شیر افگن خان کے مرنے سے اجڑ گیا۔ اللہ رکھے میرا سہاگ بھاگ قائم ہے اور یہ دوہا پڑھا

چار نار تاسں کا ہتّیا   ایک چھوڑ جن دوجا کیا

نورجہاں بحد خفیف ہوئی اپنا سا منہ لے کر رہ گئی اور اس قدر جھینپی کہ اٹھ کر چل دی۔ جہانگیر ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ گیا۔

قلعہ آگرہ و فتح پور سیکری میں جودھ بائی کے عالیشان محلات اب تک اس کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ اس نے آگرہ میں "سہاگ پورہ" کے نام سے ایک محلہ آباد کر کے اس میں اپنے عالیشان محلات و باغات تعمیر کرائے تھے۔ اب یہ محلہ ویران ہو چکا ہے۔ صرف اس کے عالیشان مقبرے کے جو اسی محلہ میں واقع تھا مٹے مٹے سے نشانات باقی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مقام اب تک جودھ بائی کے نام سے مشہور اور موضع بھوگی پورہ پرگنہ صدر تحصیل آگرہ میں شہر کے متصل واقع ہے۔ اس لائق و فائق رانی نے بروز جمعہ ۳۰۔ ربیع الثانی ۱۰۲۸ھ کو رحلت کی۔ جہانگیر کو بہت رنج ہوا۔ دوسرے دن غمزدہ بیٹے (خورم) کے مکان پر خود گیا اور اسے تسلی تشفی کر کے اپنے ساتھ لے آیا۔ (ماخوذ از امرائے ہنود۔ دربار اکبری، تاریخ ہند مصنفہ ای مارسڈن، ماثر الامرا بادشاہنامہ وغیرہ)۔ ۱۲۔

نوٹ نمبر ۲۔ راجہ اودے سنگھ راٹھور۔ موٹہ راجہ عرف سے۔ پیدائش لا معلوم۔ راے مالدیو فرمانروائے جودھ پور کا بڑا بیٹا تھا۔ راے مالدیو امارت و جمعیت لشکر کی حیثیت سے تمام راجگان ہند میں ممیز و ممتاز راجہ تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا چھوٹا بیٹا "چندر سین" اس کا جانشین ہوا جس نے ۹۱۵ھ اکبر شاہی میں اکبر کی اطاعت قبول کر لی تھی لیکن ۹۱۹ھ میں باغی ہو گیا۔ شاہی فوجیں اس کی گوشمالی کے لئے متعین ہوئیں۔ کئی معرکوں کے بعد ۹۲۵ھ میں پایندہ خان مغل سے شکست فاش کھا کر بھاگا اور روپوش ہو گیا۔ اس کی فراری کے بعد راجہ اودے سنگھ مسند نشین حکومت جودھ پور ہوا اور اس قدر اکبر کے اخلاق و محبت کا گرویدہ ہوا کہ خاندانی رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر اس نے اپنی چہیتی بیٹی (جودھ بائی) ولیعہد سلطنت شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کو بیاہ دی۔ اکبر خود امراء و بیگمات کے ہمراہ راجہ کے مکان پر بیٹے کے

نوٹ نمبر ۳ - آصف خان - مرزا ابوالحسن نام، اعتماد الدولہ مرزا غیاث کا بیٹا نورجہاں کا بھائی تھا۔ جہانگیر نے نورجہاں کے عقد کے بعد اعتقاد خان پھر ۱۰۲۶ھ میں آصف خان خطاب دیا۔ آصف جاہ و آصف جاہی بھی کہلاتا تھا۔ شاہجہان نے یمین الدولہ خان خانخان خطاب دیا ۱۰۳۱ھ میں جہانگیر نے اپنا وزیر مقرر کیا۔ اس کی لڑکی ارجمند بانو بیگم جو عوام میں ممتاز محل تاج بی بی نواب عالیہ اور قدسیہ بیگم مشہور ہے، شاہجہان کی بی بی تھی۔ ۱۷۔ شعبان ۱۰۵۱ھ = ۱۰۔ نومبر ۱۶۴۱ء بہ عمر ستر سال یا بہتر سال انتقال کیا۔ شہر لاہور کے بالکل مقابل دریائے راوی کے کنارے مدفون ہوا۔ شائستہ خان، مرزا مسیح، مرزا حسین اور نوشہ نواز خاں چار یادگاریں چھوڑیں۔ جو باپ کی طرح صاحب عزت و وقار ہوئیں۔ علم سے بہرۂ کامل رکھتا تھا۔ معقولات میں ید طولیٰ حاصل کیا تھا یہی وجہ ہے کہ فرامین شاہی میں اسے ان القاب سے ملقب کیا جاتا تھا "شعلہ افروز فطرت انشراقیاں ودانش آموز طبیعت مشائیاں" خوشنویس، درست محاورہ، سیاق داں، معاملہ فہم، ملائم، متواضع اور مردم شناس امیر تھا (ماثر قاموس)۔

نوٹ نمبر ۴ - شیر افگن خان - علی قلی نام قوم استجلو سے تھا۔ یہ شخص پہلے شاہ اسماعیل ثانی بن شاہ طہماسپ شاہ ایران کے نعمت خانہ کا داروغہ تھا۔ شاہ اسماعیل کی وفات کے بعد انقلاب سلطنت سے اکبر کے عہد میں براہ قندھار ہندوستان پہنچا۔ امیر الامرا خان خانان عبدالرحیم خان اس زمانہ میں مہم ٹھٹھہ میں مصروف تھا۔ علی قلی نے بمقام ملتان اس کے حضور میں شرفِ باریابی پایا۔ چونکہ جوان، خوش رو اور صاحب ہنر سپاہی تھا۔ اس لئے خان خانان نے بلا اجازت سلک ملازمانِ شاہی میں شامل کر لیا۔ اس مہم میں علی قلی سے کارہائے نمایاں ظہور میں آئے۔ بعد فتح ٹھٹھہ خان خانان نے اسے دربار شاہی میں پیش کر کے اکبر سے اس کو اس کے لائق منصب دلوا دیا۔ اسی زمانہ میں مہر النسا بنت مرزا غیاث بیگ (جو بعد میں نورجہاں ہو کر دنیا میں چمکی) پر شباب پھٹ پڑا۔ اس کے سادہ و پر فن حسن اور اس کی بھولی بھالی اداؤں نے ولیعہد سلطنت شاہزادہ سلیم (المعروف بہ شہنشاہ جہانگیر) کے مرغ دل کو شکار کر لیا وضعدار اور نیک نیت اکبر نے مہر النسا کے عقد کو سلیم کے ساتھ اپنی شانِ شاہانہ کے خلاف سمجھ کر اور یہ جان کر کہ امراء کی بہو بیٹیاں نظر بد سے بچانے کے لئے بیگمات شاہی کے مساوی ہیں۔ اسے علی قلی سے منسوب کر دیا۔ شہزادہ سلیم نے مرزا غیاث پر دباؤ ڈالا۔ اس نے یہ عذر کر کے پیچھا چھڑا لیا۔ کہ مجھ میں فرمان شاہی سے سرتابی کی مجال نہیں۔ چند روز بعد اکبر نے علی قلی و مہر النسا کا عقد کر کے علی قلی کو بردوان میں جاگیر دے کر اور اس کو ڈھاکہ کا حاکم بنا کر رخصت کر دیا۔

یہاں حضرت عشق رنگ لائے۔ سلیم نے باپ سے بغاوت کی اور ابوالفضل کو کہ عقد نہ کرنے کے مشورے میں بھی شریک تھا قتل کرا دیا۔ آخر بوڑھا اور مرگ اولاد کے صدمے اٹھایا ہوا اکبر دنیا سے کوچ کر گیا۔ اور بیٹے کی جہانگیری کے لئے میدان خالی کر گیا۔

کی پیچیدگیوں میں پڑ کر چن چن کر قتل کیا گیا۔ اور اس خاندان نے از ابتدا تا انتہا نہایت عز و فخار کی زندگی بسر کی۔ اور اس کے غلام تک خانی و خاقانی کے خطاب پاکر بڑے بڑے امراء پر سبقت لے گئے۔ اس خاندان کی دو بیگمات (ارجمند بانو بیگم المعروف بہ ممتاز محل اور مہر النسا المخاطب بہ نورجہاں) دولتِ مغلیہ کے دو جلیل القدر فرمانرواؤں یعنی شاہجہان اور جہانگیر کے حبالۂ عقد میں رہ کر ان بادشاہوں کے پردے میں خود حکومت کر گئیں۔ اور بڑی شان کے ساتھ کر گئیں۔ نورجہاں ۱۵۷۷ء میں جبکہ اس کا باپ انتہائی افلاس و پریشانی میں ایران سے ہندوستان کا سفر تلاشِ معاش میں کر رہا تھا جنگل میں پیدا ہوئی۔ اس کے باپ نے اپنے جوہر ذاتی کی بدولت دربارِ اکبری میں رفتہ رفتہ بڑا مرتبہ حاصل کیا۔ اس کا دورِ شباب تھا کہ جہانگیر مر مٹا۔ اکبر نے مصلحتاً اس کا عقد شیر افگن خان کے ساتھ (جس کے حالات انہی حواشی کے ذیل میں درج ہیں) کر دیا۔ مگر جہانگیر نے تخت نشین ہو کر اس کے خاندان کے مارے جانے پر اپنے عقد میں لے لیا۔ اور بادشاہ پر یہ اس قدر حاوی ہوئی کہ درحقیقت وہی حکمران ہند تھی۔ سکوں پر اس کا نام ٹھپہ ہوتا تھا۔ صرف خطبہ میں اس کا نام نہیں لیا گیا ورنہ اس کا نام تمام کاروبارِ سلطنت میں شریک تھا +

وہ بیحد حسین، عقلمند، بہادر، حاضر جواب تھی۔ مخفی تخلص کرتی اور شعر کہتی تھی۔ ایجاد پسند طبیعت رکھتی اور مختلف چیزوں کی موجد تھی۔ مثلاً مچھر دانی، بیگماتی پائجامہ۔ ٹپاپٹی کی گوٹ وغیرہ وغیرہ زیورات میں اس نے بہت سی دلچسپ ایجاد و اختراع کئے تھے۔ یورپ سے جو زیورات آتے ہیں ان میں بیشتر اسی کے ترمیم یا ایجاد کردہ ہیں۔ عطر گلاب کی ایجاد مورخین کی غلطی سے اس کے نام سے منسوب ہے دراصل یہ اس کی ماں "دیوانجی بیگم" کی ایجاد ہے +

چونکہ اس کی بیٹی جو شیر افگن خان کے صلب سے تھی۔ جہانگیر کے بیٹے شہریار کو بیاہی تھی اس لئے اس کی بہت طرفداری کرتی اور اپنے بھائی کے داماد شاہجہان کو بوجہ شریک و سہیم سلطنت ہونے کے اکثر تنگ رکھتی تھی۔ چنانچہ دھولپور کو کہ شاہجہان کی جاگیر میں تھا شہریار کے نام پر منتقل کر دیا تھا اسی بنا پر شاہجہان جہانگیر سے باغی ہوا۔ آخر میں جہانگیر کے انتقال کے بعد شاہجہاں کو ہی کامیابی ہوئی۔ اور وہ تاجدار ہند بنا۔ اور نورجہان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ یعنی ۲ لاکھ روپیہ سالانہ اس کی پنشن مقرر کر دی۔ اور اس کے آخری دم تک اس کے ساتھ عزت و حرمت کا برتاؤ کرتا رہا +

نورجہاں جہانگیر کی وفات کے بعد بارہ برس تک شاہجہان کی پنشن خوار رہ کر ۱۰۵۵ھ ۱۶۴۵ء رنگہرائے عالم باقی ہوئی۔ اس مدت میں وہ جہانگیر کا سوگ مناتی رہی۔ اور اس کی یاد میں کبھی رنگین کپڑا اپنے جسم سے مس نہ کیا۔ لاہور میں اپنے رفیق حیات جہانگیر کے پہلو میں مدفون ہوئی۔ (قصص ہند آزاد، دربار اکبری، قاموس المشاہیر، اورنٹیل بیل، ظفرنامہ) - ۱۲ +

روشنی ڈالی گئی ہے ؛

(کارنامہ جہانگیری - ہسٹری آف جہانگیر مصنفہ بینی پرشاد ایم اے - قاموس المشاہیر - حیات نورجہاں مصنفہ محمدالدین فوق - دربار اکبری آزاد مرحوم - تاریخ ہند ای مارسڈن قصص ہند آزاد)

جہانگیر کی وفات اور اس کے پسماندوں میں کشمکش

ان تعلقات نے ۱۰۳۷ھ میں جہانگیر کی رحلت کے بعد ایک خوفناک صورت اختیار کی آصف خان و نورجہاں (بھائی بہن) میں ایک عجیب کشمکش رونما ہوئی۔ ہر ایک نے اپنے اپنے گھر میں حصول سلطنت کے لئے علٰحدہ علٰحدہ ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ امراؤ اعیانِ دولت بھی علیٰ قدر تعلق و اغراض ان دو میں سے کسی نہ کسی کے شریک ہو گئے اور انجام یہ ہوا کہ چند امراء کی مدد سے بھائی نے بہن کو نظربند شہریار کو مقید اور خسرو بن جہانگیر کے بیٹے داور بخش کو مصلحتاً تخت نشین کر کے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی اور زبانی جہانگیر کے انتقال کی خبر دکن میں شاہزادہ خورم کے پاس بنارسی داس کی معرفت بھیجی ؛

یہ برقدم صبا رفتار پیک نیک شگون منزلِ چکرہٹی سے جو وسطِ کشمیر میں ہے روانہ ہو کر رواں دواں پراں شب و روز مسافت طے کرتا ہوا بیس روز کے عرصہ میں ۱۹ ربیع الاول ۱۰۳۷ھ کو جنیر (جو سرحد نظام کی انتہا پر ہے) جا پہنچا۔ اور آصف خان کی ہدایت کے مواقف مہابت خان سے جو وہاں موجود تھا عرض حال کیا۔ مہابت خان نے فوراً مشکوئے معلی میں خبر بھیجی، شاہزادہ محل سے برآمد ہوا۔ بنارسی داس نے آصف خان کی مُہر پیش کی اور اس حادثہ جانکاہ کی اطلاع دی ؛

نوجوان شاہزادے پر اس دلخراش اور جگر دوز خبر سے کوہ غم ٹوٹ پڑا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ باپ کا سایہ سر پر نہیں۔ نظم سلطنت میں اختلال پیدا ہو گیا۔ باغی، غادر، خائن، خود غرض اہل خاندان و اراکین سلطنت جن کی قوت واقتدار نے قہرمانی کا درجہ حاصل کر لیا ہے اپنی شاطرانہ حرفتوں سے سلطنت کو ذاتی ترقیوں اور ہوس پرستیوں کی آماجگاہ بنانے کے لئے تیار ہیں خود

سلطان سلیم نے جہانگیر کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ اور کچھ ایسی الجھنوں میں پڑا کہ مہرالنسا کا عشق افسانۂ خواب بن گیا۔ اسی زمانہ میں علی قلی نے تلوار سے شیر کا شکار کیا اور حضور (شاہی) سے اس کو "شیر افگن خاں" کا معزز خطاب ملا +

کچھ دنوں بعد وہ بادشاہ سے مشکوک ہو کر اور خدمات شاہی سے مستعفی ہو کر اپنی جاگیر پر چلا گیا +

۱۶۰۷ء میں بادشاہ نے اپنے رضاعی بھائی شیخ جیون المخاطب نواب قطب الدین کوکہ (دختر زادۂ حضرت شیخ سلیم چشتیؒ) کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کر کے بھیجا۔ وہ ایک دن بردوان گیا شیر افگن خاں نے اس کی آمد کی خبر پا کر اس کا استقبال کیا۔ شیخ موصوف نے دوران ملاقات کہا "اگر تم مہرالنسا کو طلاق دے کر اس کا عقد بادشاہ سے کر دو تو مناسب ہے"۔ شیر افگن خاں نے شیخ پر اچانک حملہ کر کے اسے قتل کر ڈالا۔ اور شیخ کے ساتھیوں نے اسے گھیر لیا۔ شیر افگن خاں نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ کچھ کو مارا کچھ کو زخمی کیا۔ لیکن خود بھی زخمی ہو گیا۔ اور چاہا کہ بھاگ کر حرم سرا میں پہنچے اور رابۂ فساد وعناد (مہرالنسا) کو قتل کر کے اطمینان سے جان دے۔ مہرالنسا اپنی خلقی دانائی سے معاملہ کی تہ کو پہنچ گئی۔ دروازے بند کرا دیئے۔ یہاں تک کہ شیخ کے آدمیوں نے شیر افگن خاں کو گھیر کر مار ڈالا۔ تمام مال واسباب حسب دستور سلطنت ضبط کر کے مع مہرالنسا اور اس کی لڑکی کے پایۂ تخت کو روانہ کر دیا گیا۔ مہرالنسا۔ خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطانہ بیگم یا بقول بعض سلیمہ سلطان بیگم (مادران جہانگیر) کی نگرانی میں دیدی گئی +

عرصے تک وہ بادشاہ کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند نہ ہوئی۔ لیکن آخر کار تاج و تخت کو ٹھکرانا مناسب نہ جان کر اس نے ۱۶۱۱ء میں جہانگیر سے عقد کر لیا۔ اور پہلے "نور محل" پھر "نور جہاں" خطاب پا کر دولت تیموریہ میں اپنے خاندان کی وہ رفعت کرا دی۔ جو بنی عباسیہ کے عہد میں برامکہ کو بھی میسر نہ آئی +

شیر افگن خاں ایک حسین، وضعدار، باغیرت، داب محفل کا ماہر، علم مجلسی میں کامل، بہادر اور نیبر دل نوجوان تھا۔ اسے فن نجوم میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ چھت پر کھڑا ستاروں کی سیر کر رہا تھا۔ نور جہاں پاس کھڑی تھی اس نے کہا "ذرا میرے متعلق تو دیکھو" تھوڑی دیر غور کرنے اور زائچے پر نظر ڈالنے کے بعد شیر افگن خاں نے کہا "بیگم! میں چتر شاہی کو تمہارے سر پر نثار ہوتے ہوئے دیکھتا ہوں" نور جہاں نے باتوں ہی باتوں میں ٹال دیا۔ لیکن اس واقعے کے بعد وہ اکثر فکرمند رہتا تھا اور نور جہاں بھی گھبرایا کرتی تھی +

بہت سے مورخین نے جہانگیر کو اس معاملہ میں بھی بدنام اور شیر افگن خاں کے قتل کو اسی کے اشارے پر محمول کیا ہے۔ اس مختصر میں اتنی گنجائش کہاں کہ نقد و تبصرۂ واقعات کیا جائے لیکن یہ ضرور ہے کہ ایسا نہ تھا۔ جو یائے تفصیل کو کارنامہ جہانگیری (یعنی جلد ہشتم تاریخ ہند شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ صاحب مرحوم) کا تتمہ دیکھنا چاہیئے۔ جس میں خصوصیت کے ساتھ اس امر پر کافی

صحیح النسب سادات رضویہ سے تھا۔ پہلے مرزا محمد حکیم (برادر اکبر) کا ملازم تھا۔ بعدہٗ اس نے اکبر کی ملازمت کر لی تھی۔ زمانہ بیگ بچپن میں احدیانِ جہانگیر کے سلسلہ میں منسلک ہوا اور بہت جلد حسن خدمات کے باعث بخشی شاگرد پیشہ کے عہدے پہ پہنچ گیا۔ عالم شہزادگی و بغاوت میں جہانگیر نے کسی کارنمایاں پر اسے مہابت خاں خطاب دیا اور بادشاہ ہونے پر اس کی بڑی قدر افزائی کی ۱۰۳۵ھ / ۱۶۲۶ء میں اس نے نورجہاں کے اثر اور اس کے بادشاہ کے مزاج میں حد سے زیادہ دخیل ہو جانے کی وجہ سے تنگ آکر جہانگیر کو نظر بند کر لیا۔ نورجہاں اپنے شوہر کی خاطر لڑی۔ اور کچھ ہی دن بعد جہانگیر آزاد ہو گیا۔ نورجہاں اور شاہجہاں کے مابین جب کدورت پیدا ہوئی تو یہ شاہجہان کی گوشمالی پر دربار شاہی سے متعین ہوا۔ آخر کار جہانگیر کی جہانگیری کو ختم اور نورجہاں کی شمع اقبال کو بے نور ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کی دوراندیشی نے اسے شاہجہان کا خیرخواہ بنا دیا۔ اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ المعروف بہ خواجہ اجمیری و خواجہ غریب نواز کے مزار پر انوار پر شاہجہان کی وفاداری کا عہد کیا۔ ۱ سنہ ج شاہجہانی میں خطاب خانخانان، سپہ سالاری، منصب ہفت ہزاری، ہفت ہزار سوار اور صوبہ اجمیر کی صوبہ داری پائی۔ ۵ سنہ ج میں دہلی کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ برہانپور (دکن) میں تھا کہ مرض بھگندر میں مبتلا ہوا۔ بدپرہیزی وبال جان ہوئی۔ اور ۱۰۴۵ھ / ۱۶۳۵ء میں وفات پائی۔ تاریخ ہوئی ع زمانہ آرام گرفت (۱۰۴۵)

حسب وصیت اس کی لاش کو اس کی معتمد اور وفا شعار راجپوت فوج نے دہلی پہنچایا۔ جہاں وہ شاہ مرداں کے قریب دفن کی گئی ✦

مہابت خان جوتش (نجوم) کا ماہر تھا۔ ایرانیوں کی صحبت بہت پسند کرتا تھا۔ ابتداءً اس کا کوئی مذہب نہ تھا۔ لیکن آخر میں مذہب امامیہ کا پیرو ہو گیا تھا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند نہ تھا جس کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا کچھ بھی ہو جاتا بے رخی نہ کرتا۔ اور اس کی ذلت گوارا نہ کرتا تھا۔ اس درجہ کریم الطبع اور سادہ مزاج تھا کہ باوجود ایک کروڑ روپیہ سالانہ کے سب روپیہ صرف کر ڈالتا اور ساری پوشاک جو خود زیب تن کرتا پانچ روپیہ سے زیادہ کی نہ ہوتی تھی۔ اپنے کاروبار سے بیخبر رہتا۔ لیکن معاملات سرکاری میں سخت اور حزرس تھا۔ شاعر تھا۔ لیکن اظہار شاعری کو معیوب و مکروہ جانتا تھا۔ اسی کا شعر ہے ؎

تنگ دلم بود کہ بہشت آرزو کند دوزخ نصیبِ من بود و آرزو مباد

غرض یہ کہ بہت اچھا، ہر دلعزیز اور جامع کمالات سردار تھا۔ بے عیب و نقص صرف خدا کی ذات ہے۔ یہ کیونکر خالی رہتا کہ انسان تھا۔ ظلم اور درندگی کے دھبوں سے اس کا دامن آلودہ ہے ✦

پانچ بیٹوں میں سے دو (مرزا امان اللہ المتخلص بہ امانی اور لہراسپ مہابت خاں) باپ کے قدم بہ قدم چل کر نام کی زندگی کا باعث ہوئے۔ باقی تین نے کوئی خاص ترقی نہ کی اور گمنام شہرِ خاموشاں میں جا بسے ✦

اپنے کو روکتا ہے۔ تو باپ دادا کی بنی بنائی سلطنت مٹی جاتی ہے۔ آگے قدم بڑھاتا ہے تو خانہ جنگی کا وہ سیلاب عظیم پیش نگاہ ہے۔ جس سے سلطنت ایک حباب نظر آتی ہے غرضیکہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ خود ورطۂ حیرت و استعجاب میں غرق ہے۔ کہ دور اندیشی، تدبیر اور استقلال کے فرشتوں نے فوراً آگے بڑھ کر کان میں کہا "یہ موقع رنج و غم کا نہیں۔ اگر آپ اس صدمے سے اپنا بُرا حال کریں گے تو رعایا جو ودیعت ایزدی ہے۔ پریشان، تباہ اور برباد ہو جائیگی۔ قدرت کو ابھی آپ سے بہت سے کام لینا ہیں۔ ضبط کیجیے اور جلد از جلد دار الخلافہ میں پہنچ کر زمام سلطنت دست حق پرست میں سنبھالئے خدانخواستہ نوع دگر ہوا اور دراندازوں کو موقع ہاتھ آگیا تو کچھ بنائے نہ بن پڑیگی۔ یہاں اور وہاں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ آل تیمور کا نام و نشان مٹ جائیگا" +

نوٹ نمبر ۱ - داور بخش - داور بخش سلطان نام۔ مرزا بلاقی عرف خسرو کا بیٹا، جہانگیر کا پوتا، خان اعظم کوکلتاش خان مرزا عزیز کا نواسہ تھا۔ نورجہاں نے اسے شہریار کے پاس نظر بند کر دیا تھا جہانگیر کی رحلت کے بعد آصف خان نے جو مستقل طور پر شاہجہان کی تخت نشینی کا حامی تھا۔ اس کے حامیوں ارادت خان کی مدد سے عارضی طور پر تخت نشین کر دیا تھا۔ شہریار بھی دعویدار سلطنت تھا اس لئے اس کے اور داور بخش کے مابین جنگ ہوئی۔ شہریار شکست کھا کر گرفتار ہوگیا ۲۵ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۷ء کو شاہجہان کے اشارے سے آصف خان نے داور بخش، اس کے بھائی گشتاسپ پسران دانیال (طہورث، ہوشنگ اور بایسنقر) اور شہریار کو قتل کرا دیا (ظفرنامہ شاہجہان، مآثر الامرا، قاموس المشاہیر) +

نوٹ نمبر ۲ - بنارسی داس - مشرف فیلخانہ شاہی تیز روی و سبکروی میں یکتائے عصر تھا (دیکھو بادشاہنامہ۔ مآثر اور ظفرنامہ) لیکن مولانا آزاد مرحوم نے قصص ہند میں اس کا نام جہتا بنارسی اور اس کو ایک ہرکارہ لکھا ہے۔ اور تحریر کیا ہے کہ ایک اشرفی کوس تو اس کو اسی وقت دیا گیا تھا۔ اور انعام و اکرام کا وعدہ الگ تھا۔ اس نازک موقع پر اس کے بھیجے جانے سے اس کا معتبر ہونا ظاہر ہے اور تیز روی کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ دو مہینے کی منزلیں بیس دن میں اس نے طے کر ڈالی تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ پہلے ایک ہرکارہ ہی ہو۔ مگر اس خدمت اہم کی انجام دہی کے صلہ میں بعہد شاہجہان مشرف فیلخانہ بنایا گیا ہو۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۳ - ظفرنامہ شاہجہان۔ سیر المتاخرین - ۱۲ +

نوٹ نمبر ۴ - مہابت خاں - زمانہ بیگ نام، اس کا باپ غیور بیگ جو باشندہ کابل اور

ہند و جہاں ز روئے عدد ہر دو چوں یکیست (۵۹) (۵۹) شہ را خطاب شاہجہانی مبرہن است

یعنی ہند اور جہاں دونوں لفظوں کے عدد ایک (۵۹) ہیں، اس لئے شاہ ہند کو شاہجہان کہہ سکتے ہیں +

نوٹ نمبر ۱۔ آگرہ :- بقول واحد یار خاں بی اے (صاحبِ "ارض تاج") اس شہر کی وجہ تسمیہ بھی مورخین کے اختلافات کی ایک عجیب وغریب جولانگاہ ہے +

کوئی کہتا ہے "اگر" ظرف نمکسازی کو کہتے ہیں۔ اور چونکہ وہاں نمکسازی ہوتی تھی اس لئے یہ نام پیدا ہوا +

بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ "اگلا" یا "آگرہ" یعنی قدیم سے منسوب ہے +

بعض کا بیان ہے کہ آگرہ کے معنی گھر ہیں۔ بعض اگروال بنیوں کے اس شہر کو بسانے کے باعث اس کا نام آگرہ بتلاتے ہیں۔ مگر تیقن کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ صحیح کیا ہے +

اکبر اور جہانگیر کے عہد حکومت تک یہ شہر اسی نام سے موسوم رہا۔ مگر شاہجہاں نے حسب روایت صاحبِ بادشاہنامہ اس لفظ کو بے معنی سمجھ کر اکبرآباد نام رکھا جو کاغذات شاہی میں تو مدتوں زندہ رہا۔ لیکن عوام کی زبانوں پر نہ چڑھ سکا۔ جب بھی آگرہ تھا اور اب بھی آگرہ ہے۔

نوٹ نمبر ۲۔ ظفر نامہ۔ کارنامہ جہانگیری۔ سیر ۱۲ +

نوٹ نمبر ۳۔ ظفر نامہ و قاموس المشاہیر۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۴۔ لین پول۔ ظفر نامہ۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۵۔ شعر العجم حصہ سویم مصنفہ مولانا شبلی مرحوم۔ نیز دیکھو "حیات صالح" مصنفہ منشی سعید احمد مارہروی (صاحبِ امرائے ہنود) جہاں یہ لطیفہ علامی نواب سعد اللہ خاں چنیوٹی وزیر شاہجہاں (المتوفی ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۶ء) کی طرف قبل عطائے منصب وزارت کے واقعات میں منسوب ہے۔ میں مولانا شبلی مرحوم کی تحقیق سے متفق ہوں۔ کیونکہ مولانا نے جہاں یہ لطیفہ درج کیا ہے وہیں ذیلی حواشی میں اس کا ماخذ کلمات الشعرائے سرخوش کو ظاہر کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے "لیکن سرخوش نے دوسرا مصرع جس طرح نقل کیا ہے دیوان میں نہیں۔ اس لئے میں نے دیوان کے مطابق نقل کیا ہے" جس سے یہ امر بخوبی ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ یہ شعر طالب کلیم ہی کا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کے دیوان میں کیونکر داخل ہو جاتا۔ دیوان طالب کلیم اور تذکرہ سرخوش کے مابین صرف دوسرا مصرعہ مختلف فیہ ہے۔ پہلے میں اختلاف نہیں، اور اصل توجیہہ لقب (ہند و جہاں کا ہم عدد ہونا) پہلے ہی مصرعے میں ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس پورے شعر کو ابوطالب کلیم

مہابت خان نے آگرہ میں جمنا کے کنارے پچاس بیگہ زمین پر ایک عمارت اپنے رہنے کے لئے بنائی تھی جس کے کھنڈر ابھی تک باقی ہیں۔ (ماخوذ از قاموس المشاہیر، اورنٹیل بیا گرفیکل ڈکشنری، مآثر الامرا، بادشاہنامہ، تاریخ ہند مصنفہ ونسنٹ اسمتھ، سوانح جہانگیر مصنفہ بینی پرشاد ایم اے قصص ہند آزاد اور حیات نورجہاں) ۔ ۱۲ +

ہوا پرستانِ سلطنت کا قتل اور شاہجہان کی تاجپوشی

مستقل مزاج، عالی حوصلہ اور جوان ہمت شاہزادے نے ان حقیقی اور سچے غیبی نصیحت کرنے والوں کے پند و نصائح کے سامنے سرِ تسلیم و رضا خم کر دیا اور ظل اللہ کے سایۂ عاطفت کے اٹھ جانے اور واقعات و حالات کے پیچ در پیچ ہو جانے کی وجہ سے ٹوٹتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے ۲۲۔ ربیع الاول ۱۰۳۷ھ کو نجومیوں کی مہورت کے موافق گجرات کی راہ سے آگرہ کا رخ کیا[۱]۔ نربدا کو عبور کر کے اپنا ایک ہراول آصف خاں کے پاس بھیجا۔ رموز و اشارات نے پردے پردے میں کام کیا۔ اور خاندان اکبری کے ہوا پرستانِ سلطنت سیاسیات کا شکار ہو کر مصالح ملکی کے دیوتا کی بھینٹ چڑھ گئے[۲]۔ اب خورم کے لئے میدان صاف تھا۔ اس لئے کہ آصف خاں جیسے زبردست شاطر نے بساط حکمرانی پہلے ہی سے خالی کر رکھی تھی۔ لہذا آگرہ پہنچکر بروز دوشنبہ ۲۷۔ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ ۱۶۲۸ء کو چھتیس سال کی عمر میں "شہاب الدین محمد شاہجہاں" کے لقب سے تخت سلطنت پر جلوس کیا[۴] +

لطیفہ[۵]:۔ شاہجہاں کی تخت نشینی کے تھوڑے ہی دن بعد سلطان روم نے اُسے ایک خط میں لکھا "آپ صرف ہندوستان کے بادشاہ ہیں۔ پھر آپ نے لقب شاہجہاں کیوں اختیار کیا؟" شاہجہاں کو بھی خیال پیدا ہوا کہ یہ غلط بیانی ہے اور یمین الدولہ (آصف خان) سے کہا "کوئی اور لقب اختیار کرنا چاہیئے۔ ملک الشعراء، ابوطالب[۶]، کلیم، ہمدانی کو جو خبر ہوئی تو اس نے اسی وقت قصیدہ لکھکر حضور میں پیش کیا۔ جس میں لقب کی یہ توجیہ کی ~

بلکہ رعایا کی بہبود اور مملکت کی فلاح کا ایک درد اس کے دل میں تھا جس کی جانب وہ متوجہ رہا اور اس کے صلہ میں منعم حقیقی نے اس کو فراوانی آمدنی اور توسیع وسائل آمدنی سے مالا مال کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس سطوت و جبروت، شان و شکوہ، جاہ و جلال اور دبدبہ و قہرمانی کے ساتھ اس نے سلطنت کی اس کی مثال دنیا کے بادشاہوں میں کم ملتی ہے۔ جس کی ایک کیفیت علامہ "آزاد" دہلوی نے جلوس تخت طاؤس کے سلسلہ میں یوں ظاہر کی ہے[1]

"جب جاہ و حشم کے ہجوم کے لئے آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں گنجائش نہ رہی تو دلی میں ایک نیا قلعہ بنوانا شروع کیا کہ قلعۂ آگرہ سے دوچند اور لاہور سے چند درچند زیادہ ہو۔ چنانچہ کروڑ روپیہ کی لاگت سے دس برس میں بنکر تیار ہوا۔ میر عمارت نے عرضی لکھی۔ خود بدولت ہوادار آبی پر سوار ہو کر لب دریا کے دروازے سے قلعے میں داخل ہوئے۔ قلعہ کو ملاحظہ کیا سر سے پاؤں تک سنگ سرخ سے گلرنگ، اس پر سنگِ مرمر کے حاشیہ کا نرالا ڈھنگ، برجیاں، فصیلیں اور مرغولیں خوشنما، عمارتیں اور باغ اور باغوں کی نہریں ایسی دلکشا کہ اگر بے مبالغہ بھی ایک ایک کی تفصیل لکھی جائے تو ایک دفتر آراستہ ہو جائے۔ کل قلعے کا نقشہ دیکھو تو کاغذ پر ایک ہشت پہلو پھول نظر آتا ہے۔ غرض کہ جشن کا سامان شروع ہوا۔ دیوانِ عام کے سامنے وہ شامیانہ کہ جس کا نام دل[2] بادل تھا اور دیوانِ خاص کے میدان میں سہا منڈل خیمہ استادہ ہوا۔ جس کا کلس خیمۂ فلک کے پار نکلا جاتا تھا۔ یہ بھی سات برس کے عرصے میں تیار ہوئے تھے۔ اور ہزاروں گز پشمینے کشمیر کے اور مخمل زربافت گجرات کے ان پر خرچ ہوئے تھے۔ دونوں سونے کے ستونوں اور چاندی کے استادوں پر کھڑے تھے۔ ان کے آگے خوشنما شامیانے زر بفت

کی حاضر جوابی کا ثمرہ نہ سمجھیں یا اس واقعہ کو اس کی طرف منسوب نہ کریں =۲=

نوٹ نمبر۶۔ ابو طالب کلیم۔ ہمدان کا رہنے والا تھا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا، اور شاہ نواز خاں صفوی (عالمگیر کے خسر یعنی شہزادی زیب النسا اور شہزادہ محمد اعظم کے نانا) کے دربار میں رسائی پیدا کی۔ ۱۰۲۸ھ میں وطن کو واپس گیا۔ دو برس بعد پھر آیا، اور میر جملہ شہرستانی کا دامن پکڑا۔ لیکن دربار تک رسائی میسر نہ آئی۔ اس کے رسائی دربار میں ناکام رہنے کے دو وجوہ تھے۔ ایک تو یہ کہ ملک الشعرائے دربار جہانگیری طالب آملی کے سامنے اس کی شاعری فروغ نہیں پاتی تھی۔ دوسرے نورجہاں اس کی شاعری کی معتقد نہ تھی بلکہ الٹے اس پر اعتراض اور کیا کرتی تھی +

لطیفہ۔ ایک دفعہ کلیم نے ایک شعر کہا اور خوب دیکھ بھال لیا کہ کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں ؎

ز شرم آب شدم کاب را شکستے نیست　　بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

اور نورجہاں کی خدمت میں بھیجا۔ وہ فوراً بول اٹھی "یخ بست و پس بشکست" یہ اپنا سا منہ لیکر رہ گیا ۱۰۲۸ھ میں پھر وطن واپس گیا، اور تیسری مرتبہ شاہجہان کے عہد حکومت میں ہندستان پہنچا۔ رفتہ رفتہ اس کے دربار میں رسائی ہوگئی اور اس کو ملک الشعراء کا خطاب عطا ہوا ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی اور لاہور میں مدفون ہوا +

بعض لوگوں نے اسے اور سعیدائے گیلانی المخاطب بہ بے بدل خان کو ایک سمجھا ہے۔ ہم نے بے بدل خان کے حالات میں حاشیہ ۴ حواشی ص۸ پر رفع اشتباہ کیا ہے +

طالب کلیم کے کلام میں حسن تعلیل اعلے پیمانہ پر موجود ہے۔ مثالیہ مضمون کی بنیاد جسے صائب (المتوفی ۱۰۸۰ھ) نے حد کمال پر پہنچایا اسی کی ڈالی ہوئی ہے۔ صاحب دیوان ہے کلام کا اندازہ ان دو شعروں سے کرو ؎

وضع جہاں قابل دیدن دوبارہ نیست　　رو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

کے بہر ناصحرے چاک جگر خواہم نمود　　من کہ زخمش را نہاں از زخم سوزن داشتم

(ماخوذ از شعر العجم، قاموس المشاہیر)

شاہجہان کا طور وطریقہ

ابتدائی زمانہ میں بمقابلہ اور مغل سلاطین کے شاہجہاں کو خاندانی مخالفین کے صاف کرنے کے علاوہ بیرونی دشمنوں کے الجھاؤ میں کسی خاص انتظام و انصرام کے ساتھ زیادہ عرصے تک پڑے رہنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اور وہ توسیع سلطنت کا حریص بھی نہ تھا۔

ہوا مگر اقبال کا رعب و داب دیکھ کر قدرت خدا یاد آتی تھی۔ چنانچہ کٹہرے کے باہر اوّل یمین و یسار شہزادے والا تبار، بعد ان کے راجہ مہاراجہ، ملک ملک کے حاکم، امیر و وزیر اپنے اپنے عہدے سے لئے کھڑے مگر تمام فرمانبرداروں کی آنکھیں زمین پر اور گوشِ دل فرمانروا کے حکم پر لگے تھے۔ ہر ایک در میں دو دو خاص بردار مخمل کی غلاف دار بندوقیں کندھوں پر بادلے کی جھنڈیاں ہاتھوں میں لئے بت بنے ہوئے قائم تھے۔ باہر کے دالان میں اور عہدیدار، منصب دار حکم کے منتظر حاضر تھے۔ اس کے آگے کے دروں میں تین تین حبشی جیسے کالے کالے پہاڑ آنکھیں لال لال زربفت کی وردیاں پہنے ہتھیاروں میں اوچی پنے اگرزہاے فولادی کندھوں پر، بادلے کی بیرقیں ہاتھوں میں۔ تیسرے درجے میں اہلکار اور ہر کارخانے کے کاردار منشی متصدی قلمدان بغل میں، بستے آگے رکھے موجود تھے۔ اور دروں میں سپاہی ننگی تلواریں علم کئے، قدآدم چاندی کے کٹہرے سے لگے خاموش کھڑے تھے۔ باہر تیس تیس گز کا فاصلہ دے کر پھر چاندی کا کٹہرا کھڑا کیا تھا۔ اور اس کے برابر سپاہی جن میں دائیں پر ترک، بائیں پر افغانی، سامنے راجپوت اپنی اپنی وردیاں پہنے، روپہلی بیرقیں ہاتھوں میں لئے جمے تھے۔ یہاں سے دروازے تک سواروں کے پہرے دو دستہ، پابستہ آراستہ تھے۔ جو درباری لوگ آتے، پہرے پہرے پر اپنے اپنے نام و نشان بتاتے اور آگے چلے جاتے۔ مگر دبدبے کا یہ عالم تھا کہ ہوش و حواس کے قدم تھراتے تھے۔ دربار میں پہنچکر تین تسلیم گاہوں پر تسلیم بجا لاتے تھے۔ جب نقیب آواز دیتا تھا "آداب بجالاؤ! جہاں پناہ بادشاہ سلامت عالم پناہ بادشاہ سلامت!" تو دل سینوں میں دہل جاتے تھے۔ کٹہرے کے پاس کورنش کا آداب ادا کرتے تھے۔ غرض اوّل شاہزادوں کی نذریں گذرنی شروع ہوئیں

وزربافی، سنہری روپہلی جوتوں پر تانے گئے۔ ایوان عالی جس طرح طلائی چھت کی میناکاری سے گوناگوں تھا۔ ویسے ہی ایرانی قالینوں اور بنارسی کمخوابوں سے بوقلموں تھا۔ صدر سے لے کر پا انداز کے ایک ایک مکان تک در و دیوار کو مخمل زربافت، بادلہ کمخواب پردہ ہائے فرنگی، دیبائے رومی، اطلس چینی سے نگارخانۂ چین کر دیا۔ صدر میں تخت طاؤس سجایا +

تخت طاؤس نمونہ عجائبات دنیا کا تھا۔ کروڑ روپیہ کہنے کو تو دو لفظ اور ایک بات ہے۔ مگر خیال کرنا چاہیئے کہ آج اس قدر سونے اور جواہرات کے لئے کس قدر دریا اور پہاڑ الٹنے پڑتے ہیں +

بارہ(۱۲) مرصع ستونوں پر مغرق محرابیں اور جڑاؤ میناکاری کی چھت دھری تھی۔ چھت سے پلئے تک خالص کندن اور آبدار جواہر سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور تین سیڑھی اوپر بلند چبوترے پر یہ عالم تھا گویا ایک ستارے کا نگینہ ہے۔ کہ انگوٹھی پر دھرا ہے۔ اس کی روکار کی محراب پر ایک درخت طلائی بھاری دھرا تھا۔ جسے سبزۂ الماس سے سرسبز اور لعل و یاقوت سے گلرنگ کیا تھا ادھر ادھر اس کے دو مور رنگا رنگ کے جواہرات سے مرصع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لئے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچنے لگتے ہیں۔ چاروں طرف چار چتر زرنگار جن میں موتیوں کی جھالر جھلملاتی تھی۔ آگے ایک شامیانہ کہ جواہرات اور موتیوں کی آبداری سے دریائے نور کی طرح لہراتا تھا۔ اور ایک لاکھ روپیہ کی لاگت میں تیار ہوا تھا۔ سونے روپے کی چوبوں پر استادہ تھا۔ گرد اس کے کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے مرتبے سے سجی ہوئی تھیں۔ تخت کے گرد پاس ادب کے لئے کئی کئی گز تک حاشیہ چھوڑ کر چاندی کا کٹہرا ایسا خوشنما لگا تھا کہ جس کی میناکار جالیاں مرغ نظر کو شکار کرتی تھیں۔ غرض دربار آراستہ

میں عالمگیر کے سفر کشمیر کے دوران خیمہ ہائے معروف بہ خاص و عام کی کیفیت لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے "اس میں ۳-۴ انچ موٹے روئی کے گدیلوں کا فرش ہوتا ہے اور ان پر سکلف قالین اور زربفت کی مربع سندیں آرام سے تکیہ لگا کر بیٹھنے کے لئے بچھی ہوتی ہیں +

اس رسم دیرینہ کی یادگار باوجود تغیر تمدن و ترقی تہذیب کے دیسی ریاستوں میں کہیں کہیں اب بھی باقی ہے۔ اور وہاں بڑے بڑے حکام اور خود والی ریاست عموماً یا خاص خاص موقعوں پر اب تک مسند تکئے ہی پر اجلاس کرتے ہیں +

درحقیقت سلاطین مغلیہ کے دربار کا آئین یہ تھا کہ بادشاہ کے سوا دربار میں کوئی بیٹھ نہ سکتا تھا۔ امراء وزراء، اہل خاندان اور شاہزادے یہ سب کے سب دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔ برنیر نے اپنا چشمدید آئین دربار جو لکھا ہے یہ ہے "اس دیوار کے وسط میں جو محلسرا سے اس (یعنی عمارت خاص و عام) کو جدا کرتی ہے۔ قدآدم سے کچھ اونچی ایک وسیع شہ نشین بنا ہوا ہے۔ جہاں ہر روز بادشاہ دوپہر کے قریب آن کر تخت پر بیٹھتا ہے۔ اور دائیں بائیں شاہزادے کھڑے ہوتے اور خواجہ سرا مورچھل ہلاتے اور بڑے بڑے پنکھے جھلتے یا اوائے خدمات کیلئے نہایت ادب کے ساتھ دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ اور تخت کے نیچے کے مقام میں چاندی کا جنگلہ لگا ہوا ہے۔ جس میں تمام امراء اور راجہ غیر ملکوں کے سفیر آنکھیں نیچی کئے ہوئے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اور تخت سے کسی قدر فاصلہ پر اسی طور سے منصب دار یعنی چھوٹے امراء کھڑے رہتے ہیں۔ اور ان سے جو جگہ خالی رہتی ہے وہ اور بلکہ تمام صحن سب قسم کے لوگوں اعلےٰ اور ادنےٰ مفلس و غنی سے بھرا رہتا ہے" صاحب آثار الصنادید نے دیوان عام کے حالات میں لکھا ہے "یہ والان امراء اور وزراء اور وکلاء کے حسب مرتبہ کھڑے رہنے کا ہے"۔ اور عالمگیر نامہ و مآثر عالمگیری سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑے بڑے امراء کو اعزازاً ایک ایک مرصع چھڑی (عصا) اس غرض سے عطا ہوتی تھی کہ وہ اس کے سہارے سے دربار میں کھڑے رہا کریں" +

جیسا کہ پرانے زمانہ کی تصویروں اور درباری مرقعوں میں بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اور یہ تمام باتیں آئین مذکور کی دلیلیں ہیں +

شاہان مغلیہ کے درباروں یا ان کی مخصوص صحبتوں میں اگر کسی کو بیٹھنے کی اجازت مل جاتی تھی تو یہ صد درجہ کی شاہی عنایت اور بے انتہا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ صاحب دربار اکبری اکبر کے حالات و آئین کے ذیل میں تحریر کرتے ہیں "بندگان خاص کو جس خلوت میں بار ملتے تھے۔ بیٹھنے کی اجازت پاتے تو سجدۂ نیاز کرتے تھے"۔ جہانگیر نے (جیسا کہ ہم متن میں کہیں لکھ چکے ہیں) جب فتح دکن کے صلہ میں شاہزادہ خورم کو "شاہجہان" کا خطاب اور تخت کے قریب مسند پر بیٹھنے کا اعزاز مرحمت کیا تھا۔ اس موقع پر وہ جہانگیر نامہ میں خود اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے "عنایتے است نمایاں و لطفے است بے پایاں کہ نسبت بآں فرزند سعادتمند

ہر ایک کو خلعت اور ترقی منصب کے احکام سنائے گئے۔ علامہ سعد اللہ خان وزیر اعظم کو ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب عنایت ہوا +

عبرت۔ دربار میں یہ شان پروردگار آشکار تھی کہ دفعتاً بادشاہ آبدیدہ ہوئے اور دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے، ساتھ ہی سب اہل دربار نے ہاتھ اٹھائے مگر پاس ادب سے کوئی شخص جرأت سوال نہ کرسکا۔ بعد فاتحہ کے خود بادشاہ نے کہا: "اے بندگان با اخلاص! جو خیال اس وقت میرے دل میں گزرا، اس کا اظہار تم پر بھی واجب سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ فرعون نے ایک آبنوس اور ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھ کر دعویٰ خدائی کا کیا۔ گواہ اور آگاہ ہو!!! کہ جس نخوت و تکبر سے اس نے وہ دعویٰ کیا تھا۔ میں اس سے لاکھ مرتبہ عجز و نیاز کے ساتھ عبودیت الٰہی کا اقرار کرتا ہوں"۔ یہ کہکر اٹھا اور دوگانہ شکرانے کا بجا لاکر دیر تک پیشانی کو زمین نیاز پہ ملتا رہا۔ وقت کی تاثیر سے دربار میں سناٹے کا عالم ہوگیا۔ سب کے دل آب ہوگئے اور سینوں کے ولولوں نے دم گرم سے اس ایوان میں ایک گونج پیدا کی۔ بادشاہ سجدے سے اٹھ کر دوبارہ مسند پہ بیٹھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر خدا پرست تھا +

نوٹ نمبر ۱۔ منقول از "قصص ہند" آزاد مرحوم۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲ لغایت ۴ کے لئے دیکھو حواشی صـ۱۲۸-۱۲۹ حمـ۱۲-۱۳-۱۴

نوٹ نمبر ۵۔ گو مولانا مرحوم نے تھوڑی ہی دور چل کر یہ فرما دیا ہے "اوّل یمین و الیسار شاہزادے .... راجہ مہاراجہ .... حاکم امیر و وزیر اپنے اپنے عہدے لئے کھڑے" لیکن بعض حضرات کو کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے مرتبے سے سجی تھیں" یہ فقرہ اس مغالطہ میں ضرور ڈال دیگا۔ کہ دربار مغلیہ میں بعض امراء کو کرسی نشینی کا شرف حاصل تھا۔ اس لئے اس امر پر تبصرہ کرنا ضرور ہے۔ ورنہ اس زمانہ کی رسم کے خلاف ایک غلط رائے قائم ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ دراصل ہندوستان میں مغلوں کے عہد تک کرسیاں عام نہ ہوئی تھیں۔ اور ان کے دربار و دفاتر میں یہ شے نادر تھی نہ صرف اہلکار وغیرہ بلکہ بادشاہ بھی بعض مواقع پر مسند تکیہ لگا کر کاروبار سلطنت انجام دیتا تھا۔ چنانچہ برنیر اپنے وقائع سیاحت

از لوازم آرائش این قسم بزدهائے دولت آئین است برکرسی ہائے زرین و سیمین چیدہ شدہ" +
متبعین تہذیب حاضرہ کرسیوں پر چیزوں کے چننے اور سجائے جانے کا مضحکہ اڑانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ لیکن نہیں اسلاف کے مراسم کو ہمیں نگاہ ادب آمیز سے دیکھنا چاہیئے۔ جس طرح ہر ملکے وہر رسمے مشہور ہے۔ اسی طرح ہر عہدے وہر رسمے مسلم زمانہ و تہذیب زمانہ ہر روز تغیر میں ہے۔ کیا عجب کہ ہمارے مستقبل میں ہماری طور و طریق قابل مضحکہ سمجھے جائیں +

اس زمانہ میں خود کرسیاں عجائبات میں شمار ہوتی تھیں۔ اور حق یہ ہے کہ خوب خوب بنتی تھیں۔ پس اگر ان سے یہ کام لیا جاتا تھا تو کیا برائی تھی۔ اور چکیوں کا تو مال مجھے معلوم نہیں۔ البتہ آگرہ میں میں نے عشرہ اولے محرم الحرام میں دیکھا ہے۔ کہ ورزشی اور کرتبی اکھاڑوں کے مرکزوں میں خنجر، بچھوا، تلوار، سیف اور کرتب، اور ورزش کے دوسرے سامان و آلات کرسیوں اور چوکیوں ہی پر چنے رہتے ہیں۔ جو گویا کہ سلاطین مغلیہ کے آئین دیرینہ کی یادگار ہے +

یہاں یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہمارے یہاں کے نہ صرف مترجمین و مصنفین بلکہ جامعین لغات کو بھی "صندلی" اور "کرسی" کے مفہوم میں بہت کچھ اشتباہ ہوا ہے چنانچہ صاحبانِ غیاث، برہان و منتخب دونوں کو ہم معنی بمعنی "تخت کوچک (چوکی)" لکھتے ہیں صاحب منتخب و صاحب برہان نے "سندلی" بالسین لکھا ہے اور محمد عبدالواحد صاحب مرحوم مہتمم مطبع مصطفائی دہلی نے "کلمات طیبات عالمگیری المعروف بہ رقعات عالمگیری" نے حواشی کتاب سطور الصدر میں "صندلی" کی اصل بلا تذکرۂ توجیہ "سنگدلی" تحریر کی ہے۔ مگر چونکہ صاحبان برہان و نفائس کے بیان کے موافق "صندل" "چندل" کا معرب ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ ہم بالصاد لکھنے والوں کا اتباع کریں۔ رہے معنی میری رائے میں "صندلی" سے حسب بیان صاحب برہان اور جامع رائل ڈکشنری اسٹول اور چھوٹی سی چوکی (جس پر لالٹین، لیمپ یا جونہ اور لکھڑاؤں وغیرہ رکھتے ہیں) سمجھنا چاہیئے۔ اور اسٹول کے خیال کے ساتھ ہی ساتھ اگر ہم چھوٹی سی تپائی اور آرائشی میز بھی اس کا مفہوم سمجھیں تو کوئی مضائقہ نہیں کرسی کا مفہوم میری نظر میں ماضی وحال میں یکساں ہے۔ اس تصریح کے بعد اب کوئی وقت نہیں رہتی۔ اور قرین قیاس یہ امر طے ہوتا ہے کہ صندلیاں مشک و اگر وغیرہ جلانے ظروف قیمتی ظروف اور عجائبات عالم و نوادر روزگار اشیا کے سجانے کے کام میں آتی ہونگی اور کرسیاں بوجہ تکیہ دار ہونے کے اسلحہ وغیرہ آراستہ کرنے کے کام میں مگر اشتباہ معنوی نے ایک خاص مغالطہ میں ڈالدیا۔ یہ بیان کرنے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ "صندلی" زمانہ پیشین میں صندل کی لکڑی سے بنائی جاتی ہوگی۔ اسی بنا پر اس نام سے موسوم ہوئی۔ کہ عیاں را چہ بیاں - ۲۱ +

ظہور یافت چہ از زمانِ حضرتِ صاحبقران تا حال، ہیچ پادشاہے ازیں سلسلہ عالیہ ایں گونہ عنایت سرشار بہ فرزند شائستہ خود ننمودہ"۔ یا حسبِ روایت صاحب سیر المتاخرین "جب شاہجہان نے ۱۰۶۴ھ میں جشنِ وزنِ قمری کے موقع پر شاہزادہ داراشکوہ کو "شاہ بلند اقبال" کا خطاب، خلعت خاصہ اور طلائی کرسی پر جو تخت شاہی مرصع کے برابر لگائی گئی تھی، بیٹھنے کا اعزاز بخشا ہے۔ تو تمام امرائے دربار کو حکم دیا تھا کہ وہ لوگ شاہزادے کے محل میں جاکر اس کو اس عزت افزائی کی مبارکباد دیں" اور صاحب "جہاں آرا" (مولوی محبوب الرحمٰن صاحب کلیم بی اے وکیل) کی تحقیق کے موافق شاہزادی جہاں آرا بیگم المعروف بہ بیگم صاحب کے جشنِ حصولِ صحت کے موقع پر جبکہ شاہجہان بیحد خوش تھا اس نے ان تمام شاہزادوں کو جو تخت شاہی کے گرداگرد کھڑے تھے جوشِ مسرت میں بیٹھنے کا حکم دے دیا۔ غرض یہ کہ خاص ہی خاص موقعوں پر مغلوں کے دربار میں معززین کو یہ موقع ملا ہے۔ کہ وہ دربار شاہی میں مسند یا کرسی پر بیٹھ سکیں۔ عموماً شاہزادے اپنے ذاتی دربار تک مسند ہی پر کرتے تھے۔ چنانچہ خلیفہ محمد حسین صاحب نے وقایع سیاحتِ برنیر مترجمہ خود کے حواشی میں اس موقع پر کہ جب عالمگیر اورنگ زیب اپنے باپ شاہجہاں سے قطعی بدگمان ہو کر قلعہ کو ملازمین شاہجہانی سے خالی کرا چکا ہے۔ اور عملۂ و فعلۂ شاہی اس کے حضور میں پہنچ چکا ہے لیکن ابھی تک وہ اپنے بھائی سلطان مراد بخش کو بظاہر بادشاہ بنائے ہوئے خود اس کی جانب سے کام کر رہا ہے اس صورت میں جو اس نے پہلا دربار آگرہ میں کیا ہے اس کے متعلق بحوالہ عاقل خاں، عالمگیرنامہ عمل صالح اور سیر المتاخرین تحریر کیا ہے۔

"اب اس نے ایک نہایت شاندار دربار عام (مگر شاہزادوں کے دستور کے موافق بہ نشست مسند) منعقد کر کے سب امرائے منصب داروں کی نذریں (شاہانہ طور پر) لیں"

اب کہنے والا کہے گا کہ جب کرسیوں پر بیٹھنے کا دستور نہ تھا۔ تو دربار شاہی میں کرسیاں جابجا لگائی کیوں جاتی تھیں؟ اصل یہ ہے کہ ان چوکیوں، صندلیوں اور کرسیوں پر "قور خاصہ (جواہر طراز اسلحۂ شاہی)، نوادر و نفائسِ عالم، بیش قیمت نقرئی و طلائی ظروف اور اگردان وغیرہ چنے جاتے تھے۔ چنانچہ صاحب جہاں آرا نے جشن حصولِ صحت مسطور الصدر کے سلسلہ میں آراستگی و پیراستگی دربار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "زرین کرسیوں پہ جابجا مشک واز فرجلتا تھا" اور صاحب سیر المتاخرین نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے جلوس ثانی کی آرائش و زیبائش دربار کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں یہ بھی تحریر کیا ہے "عقب تخت صندلی ہائے طلا نہادند و قور خاصہ را کہ مشتمل است بر شمشیر ہاے مرصع سازباپہر دلہائے جواہر طراز و سپر ہا و برچھا ہاے مرصع کار جواہر نگار کہ ترصیع آں انواع جواہر ثمینہ گراں بہا بکار رفتہ بر روئے صندلی ہا گزاشتند . . . . در ایوانہا دانے طلا و ظروف نقرہ کہ

(۱۰) فرعون ہوفرا جو زدیکیا کا اتحادی تھا۔ (کتاب یرمی باب ۴۴۔ آیت ۳۰) کہا جاتا ہے کہ اس کا نام (Afries) تھا اور اس کو ۵۷۰ قبل مسیح میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا (کتاب سلاطین) منقول از ڈکشنری فریزا اینڈ فیبل) یہاں متن میں اوّل الذکر فرعون مراد ہے۔ جس نے خدائی کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ ۲۱ +

شاہجہان کے عہد میں دولتِ مغلیہ کا وقار اور بادشاہ کی سلیم الطبعی

جس وقت شاہجہان نے عنان حکومت ہاتھ میں لی ہے دولت چغتائیہ کے مہرِ اقبال کا عروج قریب قریب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا، رعب و دبدبہ اور جاہ اقتدار کی یہ کیفیت تھی کہ ایک خفیف سی چشم نمائی کے بعد دور دست ریاستوں کا سر نیاز خم کر دینا ایک معمولی سی بات ہو گئی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ کانیں اور برآوردگی جواہرات کی جو سہولتیں اور آسانیاں شاہجہان کو نصیب ہوئیں اور بادشاہوں کو میسّر نہ آئیں۔ گو ایشیا و یورپ کے سفراء اور سیاحوں سے اس کا دربار کھچا کھچ بھرا رہتا تھا اور بڑے بڑے راجپوت سورما، کسی کی اطاعت نہ کرنے والے بہادر ترک و افغان تاج گورگانیہ کے آگے سر اطاعت وانقیاد خم کیے بیک اشارۂ چشم دہکتی ہوئی آگ اور بہتے ہوئے ذخار دریاؤں میں پھاند پڑنے، رستم و اسفندیار صفت ہستیوں سے ہم نبرد ہو جانے اور ہمت شکن و دشوار گزار قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے لئے ہر وقت آمادہ و مستعد نظر آتے تھے۔ مگر یہ شاہجہانی سلیم الطبعی تھی کہ بجائے خونریزی اور توسیع سلطنت کے اس نے اندرونی انتظامات اور ملکی ترقی کو مدنظر رکھنا بہتر خیال کیا +

بیشمار دولت اور لاانتہا جواہرات سے ایک تو پہلے ہی سے خزائن پُر تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس فیروز بخت بادشاہ کے تختِ سلطنت پر قدم رکھتے ہی کوہ و دریا نے حاصلِ کان و

نوٹ نمبر ۶ - یہ فعل بھی خالی از ندبر و رعایا نوازی نہ تھا۔ گویا جتلانا مقصود تھا۔ کہ اگر ترک دست راست اور افغانی دستِ چپ سلطنت ہیں نوراجپوت قلب دولت - ۲۱ +

نوٹ نمبر ۷ - **علامہ سعداللہ خان** - چنیوٹ علاقہ جھنگ (پنجاب) کے رہنے والے اور ایک غریب گمنام کے بیٹے تھے۔ لاہور میں تحصیل علم کی اور فقط علم کی برکت نے اس مرتبہ تک پہنچایا کہ شہنشاہ ہند کے وزیر اعظم ہو گئے۔ ۱۰۵۰ھ میں ملازم ہو کر ۱۰۵۵ھ میں دیوان خالصہ اور ۱۰۵۶ھ میں وزیر اعظم ہوئے۔ ان کی بنائی ہوئی مسجد چنیوٹ میں اب تک موجود ہے۔ جس کے دو مینار سنگ لرزاں کے ہیں جو ہلانے سے حرکت کرتے ہیں۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۸ - **فرعون** - معرب ہے۔ مصری زبان کے لفظ "فر (pra یا phra) سے اس کو فرانسیسی میں "pharaoh"۔ یونانی میں "Pharoo" عبرانی میں "paraoh" اور انگریزی میں "pharaoh" کہتے ہیں۔ مصری زبان کے لفظ "فر" کے معنی "آفتاب" کے ہیں۔ یہ مصر قدیم کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ (از انسائیکلوپیڈک ڈکشنری جلد سوم وپنجم مطبوعہ کیسل کمپنی) +

عربوں کا مقولہ ہے کہ مصر کے اٹھارہویں حکمران خاندان کے بادشاہوں نے سب سے پہلے اس لقب کو اختیار کیا +

تمام انجیل میں دس فراعنہ کا ذکر ہے -

(۱) وہ فرعون جو بحر قلزم میں غرقاب ہوا تھا۔

اور غالباً یہ وہی ہے جو موسیٰؑ کے عہد میں تھا۔ اور جس کا تذکرہ قرآن مجید میں بھی ہے اس کا نام مینوفتش (Menopthes) بن ریمزیس دوم (Ramses II) بتایا جاتا ہے +

(۲) وہ فرعون جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں تھا (کتاب پیدائش باب ۱۲ - آیتہ ۲۵) +

(۳) فرعون نیک کردار جس نے حضرت یوسفؑ کی اعانت کی تھی (کتاب پیدائش باب ۱۲) +

(۴) وہ فرعون جس نے حدادکو بچایا تھا (کتاب سلاطین ۱ - باب ۱۱ - آیتہ ۱۹) +

(۶) وہ فرعون جس کی لڑکی کے ساتھ حضرت سلیمانؑ کی شادی ہوئی تھی (کتاب سلاطین ۱-۳-۱ باب ۹ - آیتہ ۱۶) +

(۷) فرعون شیشک جس نے ری ہوبوم (Rehoboom) کے ساتھ جنگ کی تھی (کتاب سلاطین ۱ - باب ۱۴ - آیت ۲۵) +

(۸) وہ فرعون جس نے ہیزکیا کے ساتھ سنقرب کے مقابلہ میں عہد نامہ کیا تھا +

(۹) فرعون نیکو جس نے یوشع کے ساتھ جنگ کی تھی (۲ - کتاب سلاطین باب ۲۲ آیت ۱۹ وغیرہ) +

دولت اور اس کا مصرف

تختِ طاؤس کی ساخت کے متعلق ہم کو شاہجہان کا مطمحِ نظر اور اس کی مصالحِ مملکت سمجھنے کے لئے امورِ ذیل کو پیشِ نگاہ رکھنا چاہیئے یعنی یہ کہ دولت کا مصرف، اس کے اقسام اور ان کے طریقِ حصول، جو امور کہ ہمارے سلسلہ بیان میں آتے ہیں انہیں ہم سپردِ قلم اور بقیہ مسائل کو نظر انداز کر دیں گے +

دولت کیا ہے ؟ اس کا جواب ایک فقرے میں نہیں دیا جا سکتا۔ اشخاص، حالات، ازمنہ، ماحول یا ان سبھوں کی مجموعی کیفیت سے جو نتائج مترتب ہوتے ہیں اور مختلف اجناس کی قدر و قیمت کا اندازہ جس طرح کیا جاتا ہے اسی کا نام "دولت" ہے +

دنیا کی حالت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہم کو کہیں معاون نظر آتے ہیں اور ان کا نام "دولت" قرار پاتا ہے۔ کہیں نفت کے چشمے اپنے فوائد انسان کے پیشِ نگاہ کر کے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتے ہیں۔ کہیں لکڑیوں کے جنگل معیارِ دولت قرار پاتے ہیں کسی مقام پر آبی رو کے اِحتکاک سے جو انقلاب ہیئت ہوتا ہے اور اس سے جو برقی قوت انسان کے قبضۂ قدرت میں آتی ہے اور اس طرح بطنِ ارض سے اس کے مکتوم خزائن کا نکالنا اس کے لئے سہل ہو جاتا ہے دولت کہلاتی ہے۔ کہیں حبشیؔ اللون حطبِ متحجّر اپنی گوناگوں قوتوں کی وجہ سے ساری دنیا کے ذخائر کو اپنے مقام پر جذب کر کے سرمایۂ دولت بنتا ہے۔ اسی طرح ریشم اور اشجار گوناگوں وازہارِ بوقلموں کے متعلق جتنی چیزیں ہیں اپنی اپنی جگہ سب دولت کے لقب سے ملقب ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں ان سب سے علیحدہ محض انسانی صنعت و دستکاری ذریعہ کسب مال و حصول معیشت یعنی "دولت" کے نام سے موسوم ہوتی ہے +

ان مدارج کے طے ہونے کے بعد یہ مسئلہ ہماری سمجھ میں نہایت آسانی سے آجاتا ہے کہ ایک ہی چیز جو ایک وقت میں ایک مقام پر ایک شخص کے لئے مخصوص ماحول میں خواہ وہ کتنی

دیجر کو قدوم میمنت لزدم پر اور رلا لاکر نچھاور کرنا شروع کر دیا تھا۔ بنا برین نفاست پسند شاہجہان نے جو کہ اکبری جلال اور جہانگیری شوکت و اجلال کے شاندار مناظر کی سیر میں اپنی عمر کی چھتیس منزلیں طے کر چکا تھا۔ علم و فن کی سرپرستی، دربار اور ساز و سامان دربار کی آراستگی و پیراستگی کے یہ بھی صنعت و حرفت کی تربیت بھی شروع کر دی۔ لہذا سب سے پہلے وہ اورنگ سلطنت (تخت طاؤس) کے بنوانے پر آمادہ ہوا۔ کہ بادشاہ کی ابتدائی اور انتہائی شان تاج و تخت پر ہی منحصر ہے۔ ادھر کروڑہا روپے کے جواہرات جو خزانوں اور جواہر خانوں میں قدیم راجاؤں اور پٹھانوں کی لوٹ مار، شاہانِ ممالک خارجہ کے تحفے و ہدایا، امراء و شاہزادگان کے نذرانوں کے سلسلہ میں جمع ہو گئے تھے اور بیکار پڑے تھے۔ ان سے زیب و زینت کے سوا دوسرا کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ اور مذاق زمانہ کے مطابق اگر صحیح مصرف ہو سکتا تھا تو صرف یہ کہ یہ ایک ایسی شکل میں منتقل کئے جائیں کہ خواص و عوام کو ان کی سیر کا موقع ملجائے سلطنت کے وقار اور ساتھ ہی ملکی سنگکاری و کاریگری میں نمایاں ترقی ہو جائے +

نوٹ نمبر ۱۔ رستم۔ فارس کے مشہور پہلوان کا نام ہے۔ یہ نام فارسی ادب میں بکثرت آیا ہے۔ شاہنامہ فردوسی اس کے کارناموں سے بھرا ہوا ہے۔ جس میں اس کو رستم داستان کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کو رستم زابلی بھی کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ زابلستان کا حاکم بھی تھا اس کے باپ کا نام زال کہا جاتا ہے اور دادا کا نام نریمان تھا۔ بہمن کے مقابلے میں جو خاندان کیانی کا ساتواں بادشاہ تھا مارا گیا +

رستم کے متعلق ایشیائی قدیم شاعرانہ طرز یعنی مبالغہ گوئی سے بہت کام لیا گیا ہے۔ خود اس کا ممدوح فردوسی کہتا ہے ؎

منش کردہ ام رستم پہلوان   وگرنہ یلے بود در سیستان

(ماخوذ از قاموس المشاہیر اور بنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری، شعر العجم)۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲۔ اسفندیار۔ بن گشتاسپ شاہ فارس کا سپہ سالار تھا جس کو رستم نے قتل کیا تھا۔ اس کا تذکرہ شاہنامہ فردوسی میں ہے (قاموس المشاہیر) +

سفارتخانہ شایانِ شانِ سلطنت نہیں۔ اس سطوت و اقتدار قائم کرنے کے ساتھ ہی دول کو ہمیشہ شہرت دوام حاصل کرنے کا خیال بھی رہا ہے چنانچہ انگلستان میں بگ بین (Big Ben) نامی گھڑی اور ممالک متحدہ امریکہ کی اکثر عمارتیں اسی خیال کا ایک مجسم نمونہ ہیں۔ اس لئے کسی بادشاہ وقت کو یہ خیال پیدا ہو کہ خزانہ عامرہ میں بیش بہا جواہرات کے بیکار پڑے ہوئے خزینہ کو پیکر رعب سلطانی کی شکل میں منتقل کیا جائے، ایک امر عجیب نہیں۔ تخت طاؤس اسی خیال کی جیتی جاگتی تصویر تھا +

نوٹ نمبر ا۔ لارڈ کرزن (دیکھو صفحہ ۹۴ کا حاشیہ ۱)

تختِ طاؤس کی فرمائش

شاہجہان نے ۱۰۴۴ھ = سنہ ۸ جلوس میں اس اعجوبۂ روزگار اور نادر زمانہ تخت کی تیاری کا حکم دیتے ہوئے باستثنائے جواہر خاصہ (قیمتی دو کروڑ روپیہ) کہ محل معلیٰ میں محفوظ تھے، تمام ان جواہرات کے پیش کرنے کا فرمان صادر کیا[۱] جو "بیرونی خزانچیوں" کی تحویل میں رہتے تھے +

نوٹ نمبر ا۔ مآثر الامراء، حواشی سفرنامہ۔ برنیر نوشتہ خلیفہ محمد حسین صاحب بحوالہ ملا عبد الحمید لاہوری

ایک تاریخی مغالطہ کا ازالہ

لفظ "بیرونی خزانچی" میں نے لکھا ہے۔ جو بظاہر صاحب "ظفر نامۂ[۱] شاہجہان" کے بیان کے خلاف ہے۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں :-

بادشاہ نے حکم دیا جواہر خاصہ کے سوا جو جواہر خانۂ محل معلیٰ میں از قسم لعل، یاقوت، الماس، مروارید زبرجد قیمتی دو کروڑ روپے کے ہیں اور جواہر کہ "خان زمان" کی تحویل سے باہر ہیں۔ ہمارے سامنے لائے جائیں ،، +

اس عبارت سے ایک تاریخی مغالطہ ہوتا ہے کہ خان زمان کسی داروغہ جواہر خانہ یا خزانچی

ہی قلیل المقدار و دنی المقدرت کیوں نہ ہو مگر ممکن ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی قدر و قیمت کی شے قرار پا جائے مثلاً ایک تشنہ کام جاں بلب کے لئے ایک قطرۂ آب۔ اسی طرح سے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی گراں بہا چیزیں یکساں طریقے سے ہر شخص کے لئے قدر و قیمت نہیں رکھتیں۔ ایک لعل شب تاب ایک والی ملک کے جواہر طرف کلہ کے ساتھ اوج قسمت لعل و گہر کا معیار قرار پا سکتا ہے مگر گدڑی کا لعل ہو کر بے قدر رہ جاتا ہے۔ اسی سے ہم دنیا کی تمام چیزوں کی حالت کا اندازہ لگا سکتے اور سمجھ سکتے ہیں کہ ہر چیز کی قدر و قیمت اور اس قدر و قیمت کی نوعیت ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اسی حیثیت کے ساتھ اس کے صحیح مصرف کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگر جواہرات کی مکلّف تھیلیاں توشہ خانہ کے کسی گوشہ میں صندوقچوں میں پوشیدہ رہیں اور موقع بہ موقع نظارگیاں عالم کو محو دید کر کے سلطانی ہیبت و جبروت کا ایک ناپائدار اثر پیدا کریں تو ان کا یہ مصرف ہرگز اسقدر صحیح نہیں ہو سکتا ہے جس قدر کہ یہ طریقۂ استعمال کہ ان کو حسن و خوبی سے مرتب کر کے ہیبت و دبدبۂ سلطانی، شان و شکوہ و ارائی عظمت و جلالتِ جہانداری کی جیتی جاگتی تصویر قرار دیکر اُن سے روزانہ ایک مستقل و پائدار اثر سلطانی ہیبت و دبدبہ کا پیدا کیا جائے۔

سلاطینِ عالم کا مذاق

سلاطین عالم رعایا و برایا پر اپنا رعب قائم کرنے کے لئے ہمیشہ سے مختلف طریقے کام میں لاتے رہے ہیں۔ وقتاً فوقتاً فوجوں کے متحرک ہونے، عجیب و غریب اعزازوں کے قیام اور دربار کے مختلف طریقوں سے آراستگی و پیراستگی وغیرہ وغیرہ کا مقصد سطوت سلطانی کے ساتھ ساتھ جبروت و قہرمانی پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ حتیٰ کہ سفراے دول جو ممالک خارجہ میں جاتے ہیں تو اپنے سفارتخانوں تک کو ابتر حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ مثلاً لارڈ کرزن آنجہانی نے اپنے زمانہ سفارت ایران میں دولت برطانیہ کو اس امر کی طرف توجہ دلائی تھی کہ برطانی

ان میں سے اکثر شعبے "کارخانہ" کے نام سے موسوم تھے۔ اور مجموعی طور پر یہ تمام شعبہ جات "کارخانجات" کہلاتے تھے چنانچہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے بیٹے محمد اعظم المخاطب بہ عالیجاہ کو ایک خط میں لکھا ہے۔

ما کہ پان نمی خوریم ایں کارخانہ ہم رنگے دیگر گرفت و آبدارخانہ ہم آب و تاب نیست۔ ہوشیاری و خبر رسی داروغہا آنست کہ ہمہ وقت ہمہ جا کارخانجات عہدۂ خود بہ تزک آراستہ دارند تا وقت کار مجرائے آنہا ظاہر شود و نفاست مزاج و پاکیزگی آنہا بر ما ہویدا گردد و ہمہ مردم بینندگان شان دولت خداداد ما معلوم کنند و شکوہ او معائنہ نمودہ ناتوان بیناں پست گردند۔

مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نے بھی دربار اکبری میں "سفر میں بارگاہ کا کیا نقشہ تھا" کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔

"..... پھر ذرا بڑھ کر توشہ خانہ، آبدارخانہ، خوشبو خانہ وغیرہ تمام کارخانے ہر گوشہ پر چوک ....

یہاں "خازنان بیروں" سے "زرگرخانہ" کے منتظمین، کارکن اور تحویلدار مراد ہیں جن کا بیرونِ محل ہونا لازم جیسا کہ صاحب ماثر الامراء کے بیان سے واضح ہوتا ہے موصوف تحریر فرماتے ہیں۔

"سوائے جواہر خاصہ کہ اندرون محل می باشد (و دو کروڑ روپیہ قیمت آنست) از جواہر یکہ در کارخانہ (مراد کارخانۂ زرگری۔ کشتہ قادری) بود و قریب سہ کرو ر روپیہ ازیں جملہ بہ بہائے مبلغ ہشتاد و شش لک روپیہ انتخاب نمودہ ...."

نوٹ نمبر ۱۔ صاحب ظفر نامہ شاہجہاں مراد از شمس العلما، خان بہادر مولوی ذکاء اللہ خاں بن حافظ ثناء اللہ یہ یکم اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی کوچہ بلاقی بیگم میں پیدا ہوئے۔ اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بارہ برس کی عمر میں دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ بعد فراغ تعلیم اسی کالج کے مدرس ریاضیات مقرر ہوگئے، بعدۂ آگرہ کالج میں ادب

کا نام یا خطاب ہے۔ اور اس کی تحویل میں رہنے والے جواہرات کو بھی بادشاہ نے پیشی سے مستثنٰی کر دیا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ کیونکہ میری ذاتی تحقیقات کے مطابق سلاطین تیموریہ ہند کے عہد میں جتنے امراء یا ملازمین شاہی اس نام کے گزرے ہیں۔ یا جو اس خطاب سے مخاطب ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی خزینہ داری کی خدمت یا داروغۂ جواہر خانہ کے عہدے پر کبھی مامور نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ کسی انتظام کے سلسلہ میں بھی کسی ایک سے عارضی طور پر یہ خدمت کبھی نہیں لی گئی۔ خود شاہجہاں کے زمانۂ فرمانروائی میں میر خلیل برادر جعفر خان دامادِ نواب آصف خان وزیر اعظم اور امان اللہ خان امانی بن مہابت خاں یہ دو امراء اس خطاب سے مخاطب ہوئے۔ مگر ان کے حالات و سوانح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کبھی اس قسم کی خدمات انجام نہیں دیں[2]۔ اس کے علاوہ ملا عبد الحمید لاہوری، مورخ شاہجہانی "بادشاہنامہ" میں لکھتے ہیں

حکم شد کہ سوائے جواہر خاصہ کہ در جواہر خانۂ مشکوے بینو مثال می باشد ...... کہ دو صد لک روپیہ قیمت آنست ہر چہ در تحویلِ خازنان بیرونست از نظر اطہر بگذرانند +

جس سے میرے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ ظفر نامہ میں بجائے "خازنان" کے "خان زمان" استعمال کیا گیا ہے۔ در اصل مصنف علیہ الرحمتہ نے تحریر فرمایا ہوگا۔

"...... اور جواہر کہ خازنان کی تحویل میں باہر ہیں ......"

لیکن کاتب صاحب کی عنایت اور مصحح کی مراعات نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سلاطین چغتائیہ کے عہد میں خود ان کے اور ان کے امراء کے یہاں بھی ہر کام اور ہر ضرورت کے لئے ایک جداگانہ منظم شعبہ قائم تھا۔ مثلاً توشہ خانہ، آبدارخانہ، باورچیخانہ اور زرگرخانہ وغیرہ اور ہر شعبہ ایک خوش سلیقہ داروغہ (مہتمم) کے زیر اہتمام رہتا تھا

یہ تصانیف بہتر ہیں"۔ یہ قطعی صحیح ہے کہ انہوں نے جس کی طرفداری پر کمر باندھی اپنی تاریخ میں اصلی رنگ ظاہر نہ کرتے ہوئے ملمع سازی سے کام لیا۔ جو ایک مورخ کی شان کے خلاف ہے (ماخوذ از سیر المصنفین تنہا بی۔ اے اور گلدستہ ادب مولفہ منوہر لال زتشی ایم اے)

نوٹ نمبر ۲۔ قاموس المشاہیر۔ ۱۲-+

نوٹ نمبر ۳۔ ملا عبدالحمید لاہوری۔ شاہجہان کا مورخ خاص تھا۔ اس نے بست سالہ حالات شاہجہان قلمبند کئے ہیں۔ جو "بادشاہنامہ" کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ تاریخ شاہجہان کے عہد سلطنت کی بیس سال کی معتبر تاریخ ہے۔ اور چھپ چکی ہے۔ ملا ے موصوف نے ۱۰۶۵ھ شاہجہانی میں انتقال کیا۔ (آب حیات و تاریخ سیاحت بیرنیر) ۱۲+

نوٹ نمبر ۴۔ محمد اعظم شاہ نام، عالیجاہ خطاب، اورنگ زیب کا تیسرا بیٹا تھا۔ جو ۲۵۔ شعبان ۱۰۶۳ھ = ۱۱۔ جولائی ۱۶۵۳ء کو دلرس بانو بیگم المخاطب بہ شاہ بانو بیگم بنت شاہنواز کے بطن سے پیدا ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت چونکہ اس کا بڑا بیٹا محمد معظم شاہ المخاطب بہ بہادر شاہ گجرات میں تھا۔ لہذا یہ ۱۰۔ ذالحجہ ۱۱۱۸ھ میں بادشاہ بنایا گیا۔ تھوڑے دنوں بعد دونوں بھائیوں میں کشمکش پیدا ہو گئی۔ اور نوبت تا بہ جدال و قتال پہنچی۔ اور یہ بروز یکشنبہ ۱۸۔ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ = ۸۔ جون ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب کی وفات کے ۳ ماہ ۱۸۔ دن بعد بمقام جاجئو (مابین آگرہ اور دھولپور) نہایت بہادری کے ساتھ اپنے بھائی کے خلاف لڑکر اپنے دو بیٹوں بیدار بخت و والاتبار سمیت بمیدان مارا گیا۔ اور مقبرہ ہمایون دہلی میں دفن ہوا۔ عالی تبار اور بیدار دل دو بیٹے اپنی یادگار چھوڑ گیا۔ اورنگ زیب اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور اکثر اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ یہ شاہزادہ حافظ قرآن۔ علوم ادبیہ سے بہرہ یاب۔ ترکی و فارسی زبان کا ماہر اور اقسام انشاپردازی پر حاوی اور بید بہادر تھا۔ اورنگ زیب نے جو تقسیم نامۂ مملکت بیٹوں کے نام لکھا تھا اس پر اس کے بیٹے رضامند نہ ہوئے اور آپس میں ٹکرا گئے۔ نتیجہ عالیجاہ کی موت اور بہادر شاہ کی بادشاہت ہوا۔ (تاریخ ہند مولوی ذکاءاللہ اور نٹیل بیل اور قاموس المشاہیر) ۱۲+

نوٹ نمبر ۵۔ کلمات طیبات المعروف بہ رقعات عالمگیری = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۶۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی۔ بن مولوی محمد باقر جنہوں نے "اردو اخبار" کے نام سے پہلا اخبار ۱۸۵۶ء میں دلی سے نکالا۔ شرفائے دہلی سے تھے۔ آزاد باختلاف مورخین ۱۸۳۱ء یا ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حضرت ذوق دہلوی کے سایۂ عاطفت میں پاکر دہلی کالج میں داخل ہوئے اور علوم مروجہ میں اچھی استعداد پیدا کی۔ ذوق کی بدولت اکثر نامی گرامی شاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد حکیم آغا جان عیش سے استفادہ کیا۔ ہنگامہ غدر ۱۸۵۷ء میں

اردو کی تعلیم پر مامور ہوئے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی آسامی پر مقرر ہو کر اضلاع بلند شہر
اور مراد آباد میں رہے۔ ۱۸۶۹ء میں دہلی نارمل اسکول کی صدر مدرسی اختیار کر لی۔ ۱۸۶۹ء میں
"اورینٹیل کالج" لاہور میں لیکچراری کی خدمت پیش کی گئی۔ لیکن اس ملازمت پر جانے سے پہلے
آپ میور کالج الٰہ آباد کے پروفیسر مقرر کر دئے گئے۔ اور ایم۔ اے تک عربی فارسی پڑھاتے رہے
اسی کالج سے پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے۔ اور ۴۲ سال تک تصنیف و تالیف میں اپنا وقت
صرف کیا۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات کی جامع فہرست ایک اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ جو یہ ہے

مضمون	کتب مطبوعہ	غیر مطبوعہ	کل
ریاضیات	۸۱	۶	۸۷
تاریخ و جغرافیہ	۱۷	۱	۱۸
ادب	۱۶	۰	۱۶
اخلاق	۶	۰	۶
طبعیات و ہیئت	۷	۲	۹
سیاست و مدن	۲	۵	۷
میزان	۱۲۹	۱۴	۱۴۳

یہ ۱۴۳ کتابیں ۱۸۵۵ء سے ۱۹۱۰ء تک کی کمائی ہیں۔ امام غزالی کا روزانہ اوسط
تصانیف ۴ صفحہ ہوتا ہے۔ اور یہی اوسط قریب قریب مولانا ذکاء اللہ صاحب کا ہے۔
آپ نے ۷۔ نومبر ۱۹۱۰ء کو بمقام دہلی انتقال کیا۔ مختلف اصناف میں آپ کے زور قلم
نے ایک حد تک اردو کی ضرب المثل مفلسی کو دور کیا۔ آپ ارکین خمسہ اردو (نذیر احمد۔
ذکاء اللہ۔ سرسید۔ شبلی و حالی) میں سے ہیں۔ آپ نے یوں تو تاریخ، فلسفہ، سائنس
کیمیا، طرز معاشرت، علم المعیشت اور سیاسیات وغیرہ جملہ مضامین پر خامہ فرسائی فرمائی
لیکن فلسفہ ریاضی اور تاریخ سے آپ کو ایک خاص دلچسپی تھی۔ ترجمہ کاری کے آپ استاد تھے
اور انگریزی میں جس کو از خود شوقیہ پڑھا تھا اعلےٰ قابلیت رکھتے تھے۔ بہت سی انگریزی کتابوں
کا آپ نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کے طرز بیان میں یہ خوبی ہے کہ ترجمہ ترجمہ اور مضمون ماخوذ
ماخوذ نہیں معلوم ہوتا۔ بلکہ ان کا ذاتی خیال نظر آتا ہے +

آپ کی تاریخ ہندوستان" کے اٹھارہ حصے تیرہ جلدوں میں مجلد اور سات ہزار ایک سو
اُنہتر صفحات پر مشتمل ہیں۔ ہر جلد ایک جداگانہ نام سے موسوم ہے" شاہجہان کے واقعات
جس جلد میں مرقوم ہیں "ظفرنامۂ شاہجہان" کے نام سے معروف ہے +

آپ کی تاریخوں کے متعلق پنڈت برج نرائن چکبست کا قول ہے انکی تاریخوں میں اس نقادانہ
لیاقت سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ جو کہ فن تاریخ کی شان میں داخل ہے۔ مگر نہ ہونے سے

یوں تو مولانا کی تصنیفات و تالیفات بیشمار ہیں۔ مگر آبحیات، نیرنگ خیال، سخندان فارس اور دربار اکبری خاص طور پر قابل ذکر ہیں +

نیرنگ خیال :۔ جہاں اخلاقی و تمدنی اصلاح کا دستور العمل اور پند و نصائح کا ایک دفتر ہے وہاں رنگین بیانی کا دلفریب مرقع۔ استعارے و تمثیل کے پردے میں وہ وہ جوہر نمایاں کئے ہیں کہ باید و شاید اور پھر اپنی روش خاص کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ آمد کا دریا ہے کہ موجیں مار رہا ہے۔ یہ کتاب انگریزی روش انگیوریکل (نثر تمثیلی) کا اردو میں شاہکار اور اہل نظر کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے +

سخندان فارس :۔ علم فلسفۃ السان کی اردو میں پہلی کتاب، مولانا کے طرز بیان کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ جس میں فارسی و سنسکرت کے رشتے کھولے ہیں +

مولانا نے اردو میں تذکرہ نویسی اور خصوصاً تاریخ نگاری کی ایک نئی وضع قائم کی یعنی تاریخ نویسی کی روش قدیم کو ترک کر کے کہ وہ صرف واقعات کی فہرستیں ہوتی تھیں سوسائٹی کا رنگ بھی دکھلایا ہے اور اردو کے لئے تاریخ نگاری کا ایک مکمل نمونہ چھوڑ گئے لیکن ان کی تاریخی کتابیں دنیا بھر کی خوبیوں کے ساتھ ایک خاص عیب بھی لئے ہوئے ہیں وہ یہ کہ ان کا قلم جنبہ داری کا پہلو لئے ہوئے ہوتا ہے۔ جیسا کہ دہلوی ہونے کے باعث انھوں نے "آبحیات" میں کہ باعث احیائے قدماؤ قدامت اور اپنی طرز کا تذکرہ فرد ہے۔ لکھنؤ کے بعض باکمال اور لازمی طور پر قابل ذکر شعراء کو نظر انداز کر دیا ہے وہ جابجا اپنی آراء اور اپنے جذبات کو نمایاں کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے جس کا مظہر ان کی بہترین تصنیف دربار اکبری ہے اور یہ امور اصول فن تاریخ نویسی کے خلاف ہیں۔ لیکن مولانا مرحوم انسان تھے۔ فرشتہ نہ تھے کہ معصوم ہوتے۔ مورخین اکثر اس دام میں پھنس ہی جاتے ہیں۔ گو دربار اکبری پیرانہ سالی اور ایسی حالت میں لکھی گئی ہے کہ وہ بعض امراض میں مبتلا تھے اور ان کی دماغی حالت خراب ہو چکی تھی۔ تاہم کتاب دلاویز اور "آزادیت" کا نمونہ اعلےٰ ہے۔ ان کے طرز تاریخ نویسی کو لارڈ میکالے کی روش تاریخ نگاری سے مانا کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جس قدر اس کی انگریزی پر لطف ہوتی ہے اسی قدر ان کی اردو اور جیسی اس کی تاریخ انگلستان ساقط الاعتبار ہے ایک حد تک ویسی ہی ان کی دربار اکبری +

وہ مذہب امامیہ کے پیرو تھے۔ مگر بہت سے مواقع پر اسم بامسمیٰ ان کا یہ احسان بھی ہمیں نہ بھولنا چاہئے کہ انھوں نے ہمیں زندہ فارسی سکھائی اور روزمرۂ ایران کی تعلیم دی۔ فارسی کا ایک سلسلہ ان کی اس احسان عظیم کی یادگار رہے (ماخوذ از سیر المصنفین مؤلفہ جناب پنڈت منوہر لال زتشی ایم اے پرنسپل ٹریننگ کالج لکھنؤ)

نوٹ نمبر ۷۔ صاحب مآثر الامراء۔ عبدالرزاق نام نواب صمصام الدولہ،

اپنے باپ کے شہادت پانے کے بعد اودھ کی طرف بھاگے۔ اور ایک مدت تک صحرانوردی کرنے کے بعد لاہور پہنچے اور وہاں دفتر سررشتۂ تعلیم میں ماسٹر پیارے لال آشوب امرتسری کی سفارش سے ملازم ہو گئے۔ ماسٹر صاحب کی سفارشیں خود ان کی علمی قابلیتیں اور میجر فلر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیمات پنجاب کی قدر دانیاں ان کی ترقیوں کا باعث ہوئیں۔ اور یہ "سرکاری اخبار" کے معین مدیر اور یونیورسٹی کالج کے پروفیسر بنا دئے گئے۔ حکومت پنجاب کے میر منشی پنڈت من پھول آنجہانی کے ساتھ ۶۶-۱۸۶۵ء میں آپ نے کابل بدخشاں کا سفر کیا۔ اور ۱۸۸۶ء میں ایران گئے۔ ان کو سرکاری خدمات کے صلہ میں ۱۰۰ روپیہ پنشن ملتی تھی۔ مگر اپنی تصانیف کی بدولت انہوں نے خاصہ سرمایہ جمع کر لیا تھا۔ ان کا کتب خانہ قابل قدر تھا۔ جس کی عمارت انہوں نے اپنے حین حیات میں بنوائی تھی۔ اگست ۱۸۸۹ء میں آثار جنون پیدا ہوئے۔ اور ۱۹۱۰ء میں اسی عالم میں ۲۱۔ سال بسر کر کے بمقام لاہور راہی ملک بقا ہوئے۔ مولانا مرحوم نے جو کچھ شہرت حاصل کی محض اپنے علمی کارناموں کی بدولت اور جو عزت پیدا کی اپنے قوت بازو کے بھروسے پر۔ وہ فلک اُردو کے آفتاب ہیں۔ اُردو زبان پر ان کے احسانات عظیم ہیں۔ انہوں نے اُردو کا ایک بہترین سلسلۂ ادب و قواعد لکھکر نہ صرف اہل پنجاب کو اُردو کی سلیم المذاقی کا درس دیا بلکہ باشندگانِ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کے لئے ادبی صراط مستقیم قائم کر گئے۔ ان کی جدّت طبعی نے اُردو کی شاعری قدیم کی کساد بازاری السنۂ مغربیہ کی روز افزوں ترقی کے وجوہات پر نظر ڈالکر اُردو میں نیچرل شاعری کی بنیاد ڈالی اور اس پر بہترین و قابل تقلید عمارتیں تعمیر کیں۔ جو تاریخ اُردو کا جزو لاینفک ہیں +

آزاد کی سب سے بڑی شہرت کا باعث ان کے کارنامہ ہائے نثر ہیں اور ان کا طرز تحریر تنا و صفت سے مستغنی ہے۔ بیان کی لطافت، زبان کی سلاست، بندش کی چستی، محاورے کی دلاویزی جس قدر اور جس اسلوب سے آزاد کے یہاں ہے کسی دوسرے نثار اردو کے یہاں نہیں اور ظرافت کی چاشنی ان سب پر طرہ ہے۔ بقول منشی بالمکند صاحب گپت ان کا ایک مخصوص امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ جس قلم سے اعلےٰ اعلےٰ درجہ کی کتابیں لکھکر علماؤ فضلا کو محو حیرت بنا سکتے ہیں۔ اسی قلم سے پہیلیاں اور لوریاں لکھ کر بچّوں کو بہلا سکتے ہیں۔ اور یہ ایسا وصف ہے جو دنیا کے بہت ہی کم مصنفین کے حصّہ میں آیا ہے ان کا مذاق سلیم ایجاد و اختراع کے ہر موقع پر بتلا دیتا ہے۔ کہ کون سی اختراع قابل پذیرائی ہے اور کون سی ایجاد مزاج زبان کے خلاف اور یہ وہ نکتہ ہے جس کو نئی روشنی کے دلدادہ مغربی ادب کی تقلید کی دھن میں اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اور جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ثقل الفاظ و گرانباری تراکیب کے باعث زبان اصلی لطافت کو کھو بیٹھتی ہے اور اہل زبان کو ایک تلخوش مرکب سے دوچار ہو کر ترقی زبان سے مایوسی ہو جاتی ہے +

دوست میر غلام علی صاحب آزاد بلگرامی صاحب تذکرہ سرد آزاد و خزانہ عامرہ وغیرہ (المتوفی سنہ ۱۲۰۰ھ ۱۷۸۶ء) نے اوراق گمشدہ کی ایک بہت بڑی تعداد کو جمع کیا اور کچھ اضافہ کے ساتھ جس میں مصنف کی سوانح عمری بھی شامل ہے اسے از سرِ نو مرتب کیا۔ اس کے بعد شاہنواز خان کے بیٹے میر عبدالحی خان نے جنہیں ان کے والد کے انتقال کے بعد صمصام الدولہ صمصام جنگ کا خطاب ملا اس کتاب کو اصلی موجودہ شکل میں ۱۷۷۹ء میں مکمل کیا۔ انکی وفات ۲۸۔ اپریل ۱۷۸۲ء = ۱۵۔ جمادی الاول ۱۱۹۶ھ میں واقع ہوئی (از بیاگرفیکل ڈکشنری مصنفہ ٹامس ولیم بیل)

مآثر الامراء ایک نہایت جامع و مانع کتاب ہے۔ اور کوئی کتاب اس کا اس امر میں مقابلہ نہیں کر سکتی کہ اس سے امرائے تیموری کے حالات، اس زمانہ کے واقعات، اندرونی و بیرونی کوائف بخوبی معلوم ہو سکیں۔ اپنی نوعیت میں یہ کتاب فرد ہے۔ آج جتنی تاریخیں یا تاریخی نعتیں وغیرہ مرتب کی گئی ہیں ان کا ماخذ یہی ہے اسکے مصنف نے کسی شخص کے عیب و ہنر کو کسی وجہ سے بھی چھپایا نہیں۔ غرض یہ ایک نادر اور بے بہا مجموعہ ہے ۔

تختِ طاؤس کی وضع اور اسکے لئے سونے اور جواہرات کا عطیہ

اِن جواہرات میں سے چھیاسی لاکھ (۸۶۰۰۰۰۰ روپے) روپے کے بیش قیمت جواہرات جن کا وزن پچاس ہزار مثقال ۲۵۰ من ۔ سیر چھٹانک ۔ تولہ ۔ ماشہ تھا منتخب ہو کر حکم ہوا کہ "یہ سب جواہرات ۱۳۱½ من (ایک لاکھ تولہ) طلائے خالص (قیمتی چودہ لاکھ (۱۴۰۰۰۰۰) روپیہ) کے (اس وضع کے) تخت پر جڑوائے جائیں" اور بے بدل خان مہتمم زرگر خانۂ شاہی اس کے بنوانے پر مامور ہوا ۔

تختِ طاؤس کی وضع قطع، جواہرات کا موزونیت کے ساتھ تعبیہ ہونا ترتیب لون کا خیال پیش نگاہ رکھنا۔ تاکہ جواہرات کی کرنوں کی چھوٹ سے ایک رنگا رنگ کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس کے علاوہ فن عمارت میں بادشاہ کی وسعت نظر، عطائے خطابات میں اس کی جدت اور اشیاء کے نام رکھنے میں اسکی موزونیت پہ نظر کرتے ہوئے خود بخود یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاہجہان نے یقیناً

شاہنواز خان خطاب تھا۔ خراسان کے سادات خواف کی نسل سے تھے۔ ان کے پردادا امیر کمال الدین اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آئے۔ اور آگرہ پہنچ کر امراء کے زمرہ میں داخل ہوئے۔ امیر کمال الدین کے بیٹے میرک حسین نے شہنشاہ جہانگیر کی ملازمت میں جگہ پائی ان کے بیٹے میرک معین الدین المخاطب بہ امانت خان کو شاہجہان کے عہد حکومت میں بڑا عروج تھا اور وہ اول درجے کے امراء میں تھے۔ عالمگیر کے زمانہ میں بھی ان کا اقتدار بدستور رہا اور وہ لاہور، ملتان، کابل اور کشمیر وغیرہ جیسے مقامات پر سلطنت کی اہم خدمات پر مامور رہے۔ عالمگیر کی سلطنت میں امانت خان لائق ترین شخص سمجھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے بادشاہ انہیں بہت مانتا تھا۔ ۱۰۸۱ھ میں جب خانجہان بہادر کوکلتاش دکن کی صوبہ داری پر مقرر ہوا ہے۔ تو دکن کی دیوانی اور وقائع نگاری کی خدمت پر امانت خان مامور کئے گئے تھے +

ان کے چار بیٹے تھے۔ (۱) عبدالقادر المخاطب بہ دیانت خاں تحویلدار صرف خاص۔ (۲) میر حسین المخاطب بہ امانت خان تحویلدار خزانہ عامرہ و صوبیدار سورت۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا منصب ان کے بڑے بھائی کو دیا گیا تھا۔ (۳) عبدالرحمن المخاطب بہ وزارت خان دیوان بیجاپور (مالوہ) یہ اچھے شعراء میں اور صاحب دیوان تھے۔ (۴) قاسم خان۔ دیوان ملتان +

قاسم خان کے بیٹے کا نام میر حسن علی تھا۔ جو نواب صمصام الدولہ شہنواز خان کے باپ تھے شہنواز خان ۱۱۱۱ھ میں بمقام لاہور پیدا ہوئے۔ صغر سنی ہی میں اورنگ آباد چلے گئے۔ اور اپنے اعزاء کے ساتھ جو پہلے سے جا چکے تھے رہنے سہنے لگے۔ پہلی ملازمت ان کی نظام الملک آصف جاہ کے دربار میں ہوئی۔ اور آصف جاہ اور اس کے بیٹے ناصر جنگ کے عہد حکومت میں کئی سال تک انہوں نے برار کی دیوانی کی خدمت انجام دی۔ صلابت جنگ کے عہد میں ہفت ہزاری کے منصب پر سرفراز ہوئے۔ اور صمصام الدولہ کا خطاب پایا۔ ۱۲ مئی ۱۷۵۸ء = ۳۔ رمضان ۱۱۷۱ھ کو عبدالرحمن حیدر جنگ کو جو فرانسیسی جرنیل بسی کے مشیر تھے نظام علی برادر صلابت جنگ کے اغوا سے لوگوں نے قتل کر ڈالا اور اسی گڑبڑ میں صمصام الدولہ اور ان کے چھوٹے بیٹا عبدالنبی خان بھی مارے گئے۔ لیکن ان کے دو اور بیٹے میر عبدالسلام و میر عبدالحی بچ کر نکل گئے۔ دونوں باپ بیٹوں کی لاشیں ان کے آبائی قبرستان میں جو شہر اورنگ آباد کے جنوبی حصے میں واقع ہے دفن ہوئیں +

شہنواز خان نے ایک کتاب لکھنا شروع کی تھی۔ جس کا نام "مآثر الامرائے تیموریہ" ہے اور اس کتاب میں ان امراء کے حالات زندگی درج کئے تھے جنہوں نے خاندان تیموریہ کے عہد حکومت میں ہندوستان اور دکن میں خدمات انجام دی تھیں۔ لیکن اس کے ختم ہونیکی نوبت نہیں آئی تھی کہ مصنف کا انتقال ہوگیا۔ اور اس یورش میں اس کے مسودے کے اکثر حصے کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ خیال تو یہ کیا جاتا تھا کہ کتاب تلف ہوگئی لیکن ان کے ایک

بیدل خان اعلےٰ درجہ کا شاعر، حکاک اور خوشنویس تھا۔ اس نے تختِ طاؤس کی خیالی وضع کو جسے شاہجہان کی موزونیتِ دماغ نے مرتب کیا تھا، سات سال کی مدت میں عملی جامہ پہنا کر قدرداں اور مبصر بادشاہ کے حضور سے اپنے ہموزن طلائے خالص انعام پایا +

تاریخ گوئی میں اسے خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ ۱۰۴۴ھ میں کشمیر سے واپس ہو کر جب شاہجہان نے "تختِ طاؤس" پر پہلا جلوس کیا ہے۔ تو اس نے ایک سو چونتیس (۱۳۴) بیت کا قصیدہ کہکر حضورِ شاہی میں پیش کیا۔ جس کی ابتدائی بارہ (۱۲) ابیات کے ہر مصرعہ سے تاریخ ولادتِ بادشاہ، ان کے بعد والے بتیس (۳۲) بیتوں کے ہر مصرعے سے تاریخِ جلوس شاہجہانی اور بقیہ نوّے (۹۰) کے ہر مصرعے سے "تاریخ نہضت کشمیر از آگرہ" و "معاودت آگرہ" و "جلوس بر تختِ طاؤس" نکلتی تھی +

افسوس! امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں یہ جواہر ریزے صفحۂ دنیا سے نیست و نابود ہوگئے اور اب صرف ان کا تذکرہ ہی تذکرہ باقی رہ گیا۔ دستیابی قصیدہ کی ہم نے بہت کوشش کی مگر وہ کہاں۔ ع

ورق بر ورق ہر سوئے برد باد

صاحبِ مآثر الامراء نے اس کے نتائجِ قلم سے یہ رباعی حوالۂ قلم کی ہے ؎

آنی کہ سریرت آسماں پایہ بود | بر ملکِ جہاں عدلِ تو پیرایہ بود
تا ہست خدا تو نیز خواہی بودن | زیرا کہ ہمیشہ ذات با سایہ بود

نوٹ نمبر ا۔ صاحب "ظفر نامۂ شاہجہان" (جلد ہفتم تاریخ ہندوستان مصنفہ مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم) نے لکھا ہے۔ یہ جواہرات اسی لاکھ (۸۰۰۰۰۰۰) روپیہ کے تھے۔ اور ملا عبدالحمید لاہوری "مورخ شاہجہانی" بادشاہ نامہ میں لکھتے ہیں۔ مبلغ ہشتاد و شش لک روپیہ بہائے آں شدہ بود" ایک تو یوں ہی صاحب ظفر نامہ ملا صاحب کے مقابلہ میں غیر معتبر ہیں۔ دوسرے اگر صاحب ظفر نامہ کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو خود ان کے اور مورخین قدیم کے بیان کے مطابق تخت مذکور کی قیمت ایک کروڑ روپیہ تک پہنچنے میں چھ لاکھ (۶۰۰۰۰۰) روپیہ کی کمی رہتی ہے۔ اس کے برعکس ملا صاحب کے بیان کے موافق حساب

اس تخت کی وضع قطع خود اختراع کی ہوگی۔ اور بے بدل خان کا انتخاب بھی بجائے خود بادشاہ کی نکتہ سنج و نکتہ نواز طبیعت کے لئے داد طلب ہے۔ بے موقع نہ ہوگا اگر بے بدل خان کے حالات بالاختصار بیان کر دئے جائیں *

ہفتم تختِ طاؤس، اس کے نام کی صحت اس کی قابلیت اور ہمیں اس کا راہم کی انجام دہی کی اہلیت

بے بدل خان۔ سعیدا نام، بے بدل خان (جو حقیقتاً خطاب ہے) مشہور گیلان کا رہنے والا تھا۔ بابو ایشری پرشاد صاحب ایم۔ اے نے اپنی "تاریخ ہندوستان" میں حرف "A" سے امداد فتحی حاصل کرنے کی بجائے اس کو "الف" کا قائم مقام سمجھ کر "بے بادل خان" لکھ دیا ہے۔ انگریزی میں "بے بدل (Bay Badal)" اور "بے بادل (Bay Bádal)" دونوں کا املا یکساں ہے۔ صرف کھینچکر پڑھے جانے والے حروف پر ایسٹرس (اعراب یعنی ایک ترچھی لکیر) بنا دیتے ہیں۔ غالباً بابو صاحب موصوف نے انگریزی تاریخوں سے حالات اخذ کئے ہونگے اور کوئی ایسی کتاب نظر سے گزری ہوگی جس میں Badal کے "A" (مابعد "B") پر غلط ایسٹرس ہوگا یا نہ ہوگا اور جلدی میں مطالعہ کرتے ہوئے مغالطہ میں پڑ گئے۔ یا جس مصنف کی تاریخ اس ضمن میں دیکھی وہ انگریز ہوگا۔ جو ناآشنائی زبان فارسی کے باعث "بے بادل" کی معنوی غلطی کو نہ سمجھکر ایسا لکھ گیا ہوگا *

سعیدائے گیلانی، جہانگیر کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آکر سلسلۂ شعراء میں منسلک ہوا کچھ دن بعد اپنے وطن کو واپس گیا۔ اور دوسری مرتبہ پھر آیا۔ شاہجہان نے اپنے زمانۂ سلطنت میں اسے "بے بدل خان" کے خطاب سے مخاطب کر کے "منتہی زرگر خانۂ شاہی" کی خدمت پر مامور کیا۔ یہ عہدہ اس زمانہ میں بہت ہی وقیع تھا۔ اور اس پر معتمد علیہ بندگان شاہی متعین ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر شاہی جواہرات اسی عہدہ دار کی تحویل میں رہتے تھے۔

"تختِ طاؤس کی کوئی تصویر نظر سے نہیں گذری۔ لفظی تصویر آثار الامراء سے نقل کر کے بھیجتا ہوں" +

عرصہ ہوا کہ بہادر شاہ یا اکبر شاہ ثانی کے بنوائے ہوئے "تختِ طاؤسی کی ایک قلمی تصویر قلعہ معلےٰ دہلی میں موجود تھی جس کو لوگ غلطی سے شاہجہانی تختِ طاؤس کی شبیہ سمجھا کئے۔ اور اب وہ بھی معدوم ہے۔ البتہ اسی کی عکسی تصویر "لون اگزبیشن آف اینٹی کوئٹیز کارونیشن دربار ۱۹۱۱ء" نامی کتاب کے صفحہ ۱۵۲ پر ضرور موجود ہے +

نوٹ نمبر ۱۔ سعید احمد۔ آپ مارہرہ کے رہنے والے ہیں۔ کلکٹری آگرہ کے اہلمد اور اپنے زرین کارناموں کے باعث سرسید ثانی ہیں۔ اتفاق سے آپ کے نام نامی اور سید مرحوم کے اسم گرامی میں تجنیس زائد کا علاقہ بھی ہے۔

آپ نے آگرہ میں انجمن محمدیہ کی بنا ڈالی ہے جو رجسٹرڈ باڈی اور بہت سے رفاہ عام کے کاموں پر حاوی ہے۔ اس انجمن کے تحت میں صغیر فاطمہ نسواں اسکول، شعیب محمدیہ ہائی اسکول، مدرسہ محمدیہ اور کئی ایک مشنری مدارس ہیں۔ یہ مدرسے یو پی کے مدارس اسلامیہ میں بہت ممتاز ہیں +

آپ کو فن تاریخ سے خاص طور پر دلچسپی ہے۔ اور اس میں کئی مستند اور مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کی معرکتہ آلارا تصنیف "امرائے ہنود" ہے جس میں عہد اسلامی خصوصاً دولت تیموریہ کے ہندو امراء کا تذکرہ ہے۔ آپ انجمن محمدیہ کی اعزازی نظامت اور شعیب ہائی اسکول کی منیجری کی خدمات اپنی ملازمتی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ بہت ایمانداری و بیدار مغزی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ خدا کرے کہ عرصہ تک زندہ رہیں اُردو فارسی کے ماہرین سے ہیں +

نوٹ نمبر ۲۔ *Lawn Exhibition of antiguities, coronation Durbar 1911 A.D.*

ایک غلط تصویر

بک آف نالج (کتاب المعارف) میں جہاں چند سطور میں اس کے حالات پر روشنی ڈالی ہے وہاں اس کی تصویر بھی دی ہے۔ جو یہ ہے +

پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لیئے بھی ملا صاحب ہی کا بیان زیادہ مستند اور قابل تسلیم ہے ماثر الامراء سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲۔ ایک مثقال برابر ہے ۵ ماشہ کے (دیکھو طامس روکی تاریخ)۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۳۔ ظفرنامہ میں ایک لاکھ تولہ سونا۔ اور بادشاہنامہ میں "یک لک تولہ طلائے ناب کہ دوصد پنجاہ ہزار مثقال است" لکھا ہے۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۴۔ اورنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری میں بے بدل خان کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے "بے بدل خاں۔ "ابوطالب کلیم"، کا پرانا خطاب معلوم ہوتا ہے" بظاہر مرتب کو لغت مذکور مندرجہ ذیل متحدہ امور سے یہ دھوکا ہوا +

(۱) دونوں عہد جہانگیری میں اپنے وطن گئے۔ اور شاہجہان کے عہد میں واپس آئے +

(۲) دونوں نے اپنے اپنے ہموزن سونا انعام پایا +

(۳) دونوں نے قطعہ تاریخ "تخت طاؤس" اور قصیدہ تہنیت جشن جلوس تخت مذکور پیش کیا مگر امور ذیل شبہات مذکورہ بالا کو رفع کرکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ "ابوطالب کلیم" اور "بے بدل خان" دو علیحدہ علیحدہ شخصیتیں تھیں۔

(۱) بے بدل خان عام شعراء میں تھا۔ اور ابوطالب کلیم ملک الشعرائے دربار۔

(۲) بے بدل خان صرف ایک مرتبہ وطن جاکر واپس آیا۔ لیکن کلیم تین مرتبہ گیا اور واپس آیا۔

(۳) بے بدل خان "گیلان" کا اور ابوطالب کلیم "ہمدان" کا رہنے والا تھا +

(ماخوذ از مضمون "معتم تخت طاؤس" نوشتہ برادر ریحان برابر منشی منظور لطیف خان صاحب رسالہ "فانوس" جھانسی بابتہ جنوری ۱۹۲۷ء) ۔ ۱۲ +

تختِ طاؤس کی تصویر

میں نے باستثنائے کلکتہ قریب قریب ہندوستان کے تمام مشہور عجائب خانوں کی سیر کی ہے اور برابر تخت طاؤس کی تصویر کا جویا رہا لیکن میری متلاشی نظریں ناکام ہی رہیں۔ اور دریافت سے معلوم ہوا کہ کلکتہ میں بھی کوئی تصویر موجود نہیں +

اس زمانہ میں کہ میں اس کے حالات قلمبند کر رہا ہوں میں نے دورِ حاضرہ کے مشہور مورخ منشی سعید احمد صاحب مارہروی (صاحبِ "امرائے ہنود" وغیرہ) سے اس معاملہ میں دریافت کیا۔ موصوف نے تحریر فرمایا +

وہ مستعفی ہو کر ولایت چلے گئے۔ اور ۱۹۲۵ء میں وفات پائی +

لارڈ کرزن آکسفورڈ یونیورسٹی کے تعلیمیافتہ، بیدار مغز، لائق، ادیب، انگریزی کے اعلے انشا پرداز۔ اور انگلستان کے ان مایۂ ناز فرزندوں میں تھے جنہیں مشرق وسطے کی سیاسیات میں ید طولی حاصل تھا۔ وہ مشرق کی سیاسیات کے متعلق ایک معرکۃ الآرا تصنیف چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوئے +

مہد نشین ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند نے انہی کے زمانہ وائسرائلٹی میں ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا، ۱۹۰۲ء کا جشن دربار تاجپوشی فردوس آرامگاہ ایڈورڈ ہفتم انہیں کے عہد میں ہوا جس کا تزک و احتشام آج تک ضرب المثل ہے۔ تقسیم بنگال انہی کے زمانہ میں ہوئی۔ اور ایکٹ انتقال اراضی انہی کی یادگار ہے +

انہیں تاریخ اور تاریخی عمارات سے علی الخصوص جید دلچسپی تھی۔ محکمۂ آثار قدیمہ جس نے مغلوں کی صدہا عمارات کو دستبرد زمانہ سے بچا کر ان کی یاد کو تازہ کر رکھا ہے انکے وائسرائلٹی کے زمانہ کی ایک نمایاں یادگار ہے +

تاریخی حلقہ میں ان کی تصنیف "پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن" جو ان کا سفرنامۂ ایران ہے موقر نظر سے دیکھی جاتی ہے +

بہت حسین آدمی تھے۔ ڈاڑھی مونچھ منڈاتے تھے۔ ہندوستانیوں میں یہ طرز انکی یادگار خاص اور "کرزن فیشن" کے نام سے آج تک موسوم ہے + (بامداد تاریخ ہند ایشری پرشاد) +

نوٹ نمبر ۲۔ پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن ۔۱۲ +

ایک معاونِ تصورِ تصویر

ڈاکٹر ایشوری پرشاد نے اپنی "تاریخ ہند" میں جو صوبۂ یو۔پی کے انگریزی مدارس کے نصاب میں داخل ہے "شاہجہان بر تختِ طاؤس" کے عنوان سے ایک تصویر دی ہے۔ اور جس کو ہم بھی شروع میں ختم کر آئے ہیں۔ یہ تصویر بھی ہماری نظر میں مشکوک ہے۔ کیونکہ مورخین قدیم بارہ ستون بیان کرتے ہیں۔ اور اس میں صرف چار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تصویر کہاں سے لی؟ نہ اس کا کہیں تذکرہ اور نہ ہمارے استفسار کے جواب میں موصوف نے بتلایا کہ اس کی صحت یا غلطی کے متعلق ہم کسی خاص فیصلہ تک پہنچتے تاہم "تختِ طاؤس" کے تخیل میں یہ تصویر بہت معاونت کر سکتی ہے +

ایک مرصع ہشت پہل تخت، اس کے چاروں طرف بطور حاشیہ چند تختے لگے ہوئے مگر سامنے کے رُخ کا درمیانی حصہ تختوں سے عاری، پشت کی طرف رسمی تکیہ گاہ جس پر ادھر اُدھر دو چڑیاں بنی ہوئیں۔ چھت وغیرہ کچھ نہیں۔ چڑھنے کے لئے تین جڑاؤ سیڑھیاں"۔

بظاہر تو یہ تصویر اصول فروغ تجارت کو مدنظر رکھ کر کتاب میں دی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جس طرح سے کہ اسی کتاب میں ایک خیالی تصویر پیغمبر آخر الزمان حضرت سرورِ کائنات محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بھی ہے۔ اور جس کی بدولت اواخر ۱۹۲۵ء میں اخبارات و رسائل کتاب مذکور پر بہت کچھ لعن طعن کر چکے ہیں۔ کیونکہ تختِ طاؤس کی شبیہ جو مورخین نے اپنی سندی قلموں سے صفحۂ تاریخ پر کھینچی ہے۔ اس سے یہ بالکل مختلف ہے۔ مگر تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ دراصل ایسا نہیں بلکہ تختِ طاؤسی ساختہ ایران (جس کا حال ہم آگے چل کر بیان کرینگے) کا عکس ہے جس کی صاحبِ کتاب نے تشریح نہیں کی۔ کیونکہ لارڈ کرزن آنجہانی کا بیان میری رائے کا مؤید ہے موصوف فرماتے ہیں۔

"آجکل اس تخت کے صرف بعض حصص باقی رہ گئے ہیں۔ جو ٹیورنیر کے نوشتہ (مذکورہ بالا) مفصل حالات کا جزو ہیں۔ چھتری کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ نہ یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ چھت موجودہ تخت پر کس طرح قائم ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ طاؤس بھی نہیں۔ اور ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ خیال پایہ یقین کو پہنچتا ہے کہ موجودہ تختِ طاؤس کا دہلی کے لیے ہوئے اصلی تخت طاؤس سے اگر کوئی تعلق ہے تو صرف علاقۂ ہمنامی۔

نوٹ نمبر ۱۔ لارڈ کرزن۔ ۱۸۹۹ء میں جبکہ ان کی عمر ۴۰ سال سے کچھ کم تھی وائسرائے ہند مقرر ہوئے۔ اور بڑی قابلیت سے وائسرائلٹی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ وہ خیالات اور اور طرز حکومت میں لارڈ ڈلہوزی سے مشابہ تھے۔ ان کی حکمت عملی ہندوستانیوں میں مقبول نہ ہوئی ۱۹۰۵ء میں سپہ سالار ہند کے محکمہ کا جو نظام تجویز ہوا تھا اس کی بابت ان میں اور لارڈ کچنر (سپہ سالار ہند) میں کچھ اختلاف رائے ہوا۔ وزیر ہند نے لارڈ کچنر کی رائے کو ترجیح دی۔ اسی بنا پر

پایوں کے متعلق ایک خاص بیان

ہندوستانی مورخین قدیم نے تو پایوں کا بیان قطعی نظر انداز کیا ہے۔ مگر ڈاکٹر برنیر[۱] اور ٹیورنیر[۲] نے ان کا ذکر کیا ہے۔ برنیر لکھتا ہے :۔

"یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے۔ جن کے متعلق کہتے ہیں کہ بالکل ٹھوس ہیں۔ ان میں یاقوت، زمرد اور ہیرے جڑے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی تعداد اور قیمت بیان نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کسی کو اس قدر نزدیک جانے کی اجازت نہیں۔ کہ ان کا شمار اور آب و تاب کا اندازہ کر سکے۔ لیکن یقین کیجئے کہ ہیرے اور جواہرات بہت ہی ہیں" +

اور لین پول صاحب "سوانح اورنگ زیب" کے حواشی میں ٹیورنیر کا بیان لکھتے ہیں:۔

"تخت ہذا چار پایوں کی بڑی چوکی کی وضع کا تھا اس میں چھ پائے نہ تھے"

بخلاف اس کے اسی سیّاح کا قول جو لارڈ کرزن نے اپنی کتاب موسومہ پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن میں نقل کیا ہے اس میں سات پائے بیان کئے گئے ہیں۔ بہر حال میں ان لوگوں سے متفق ہوں جو چھ پائے کہتے ہیں۔ کیونکہ ایک مثمن تخت کا توازن نہ بغیر چھ پایوں کے کسی طرح قائم رہ سکتا ہے اور نہ اس میں کسی خاص کمی بیشی کی ضرورت +

نوٹ نمبرا۔ برنیر۔ فرانسس برنیر نام، ملک فرانس کے شہر انجرس میں پیدا ہوا۔ سال پیدائش محقق نہیں۔ ڈاکٹر ردول ٹیر ۱۶۲۵ء سنہ ولادت بتلاتے ہیں۔ صاحب جیمبرس بیاگرفیکل ڈکشنری نے ۱۶۵۴ء لکھا ہے ۔ لیکن وقائع سیاحت ڈاکٹر برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب کے دیباچہ سے جہاں اس نامور سیاح کے حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس سنہ میں اس نے ملک شام کا سفر کیا تھا۔ اس کی وسعت سیاحت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر ردول ٹیر کا ہی قول صحیح معلوم ہوتا ہے۔ برنیر نے مونٹ پیریس علم طب کو تحصیل کر کے علاوہ طبعیات (ڈاکٹر آف فزیک) کا فاضلانہ مرتبہ (ڈگری) حاصل کیا۔ وہ طبعاً سیر و سیاحت کا ہمیشہ سے شائق تھا۔ تحصیل علم سے فارغ ہوتے ہی وہ اس طرف مائل

تختِ طاؤس کی ہئیت

مورخین میں عام طور پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس لئے حیران ہوں کہ کس طرح تخت مذکور کا نقشہ اپنے ناظرین کے ذہن نشین کروں؟ بہر حال قدیم باکمال اور مسلم الثبوت مصوروں کی صفحۂ تاریخ پر کھینچی ہوئی لفظی تصاویر سامنے رکھکر جو تصویر میں نے اپنے دماغی عکس گیر (کیمرے) میں تیار کی ہے۔ اس کو نذرِ ناظرین کرتا ہوں۔ یہ تصویر زیادہ تر تو صاحبِ ظفرنامۂ شاہجہان، صاحبِ بادشاہنامہ اور صاحبِ مآثر الامراء جیسی مستند شخصیتوں کی کشیدہ شبیہ قلمی سے ماخوذ ہے لیکن کہیں کہیں دوسرے مصورانِ حالاتِ پاستانیاں کے خیال سے بھی رنگ و روغن لیکر آرائش و زیبائش کی گئی ہے +

طول، عرض اور بلندی

یہ تخت ۳ ½ گز[نوٹ۱] (حسب بیان ٹیورنیر ۶ فٹ) طویل[نوٹ۲]، ۲ ½ گز (حسب بیان ٹیورنیر ۴ فٹ) عریض[نوٹ۳]، ۵ گز (حسب بیان ٹیورنیر ۸ فٹ) بلند[نوٹ۴] اور مثمن[نوٹ۵] تھا۔ جس میں ایک سو آٹھ لعل (سوا سو[۱۲۵] رتی سے ڈھائی سو[۲۵۰] رتی تک کے وزنی)، اور ایک سو ساٹھ (۱۶۰) زمرد (۳۶ سے ۷۲ رتی وزن تک کے) جڑے ہوئے تھے[نوٹ۶]۔ اور دو۔ دو فٹ اونچے چھ طلائی مرصع پایوں پر قائم تھا +

نوٹ نمبر ۱۔ سرکاری عمارتی گز بقول ابوالفضل ۳۲ طسوج کے برابر اور درزی کا گز ۱۶ گرہ کا ہوتا تھا۔ ہمارے یہاں کا عمارتی گز اب بھی وہی ہے۔ جو شاہجہان کے عہدِ حکومت میں تھا۔ (کشتہ قادری)۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲ - ۵ ۔ ڈیولی انڈیا مصنفہ لین پول ۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۶ ۔ تاریخ ہندوستان قسطِ سوم۔ شائع کردہ مالکان بڑی جنتری۔ بڑی جنتری بابتہ سال ۱۹۴۶ء ۔ ۱۲ +

صاحب سلیقہ و پسندیدہ عادات، خوش تقریر اور بلیغ آدمی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سینٹ ایورمانٹ جو ابتدائے سن تمیز میں ایک پادری، حدیدالطبع، عجیب و غریب قابلیتوں کا جامع، نامور فاضل اور سپاہی تھا۔ اور کچھ ہی ہو کسی کی ہجو کر دینے اور کسی پر پھبتی کس دینے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ برنیر کو "خوبصورت فلسفی" کہا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی ان تمام قابلیتوں کے ساتھ ہی اپنے فلسفیانہ خیالات میں جن کو فلسفہ کہ کر اس لفظ کی مٹی خراب کرتا ہے۔ حکیم اپی کیورس یونانی کا پیرو تھا۔ وہ اپنے استاد گیسینڈی کا (جس سے اس نے فلسفہ کی تعلیم پائی تھی) نہایت معتقد تھا۔ اور مذہب عیسوی کے مسلمہ مسائل الہامیہ کا منکر اور بیدین فلسفیوں کے ملحدانہ تخیلات کا قائل +

وہ تحقیقات کا شیدا تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں فلسفہ الٰہیات وغیرہ پر لکھیں جو نامقبول ہیں۔ وہ فن وقایع نگاری و تاریخ نویسی میں اہل یورپ کے نزدیک مسلّم وعدیم النظیر ہے۔ اقوام مغرب اُسے اس فن میں استاد مانتی ہیں۔ وہ جس چیز کا ذکر کرتا ہے اس کی تصویر نظر کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ اس کا سفرنامہ بہت ہی مقبول ہوا۔ جس سے اس زمانہ کی تہذیب، آئین سلاطین، طریق دربار و سزا و جزا، وضع قطع، تراش خراش اور ہر ہر چیز پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر برنیر اور اس کے سفرنامے کے متعلق مسٹر سرکار نے جو رائے قائم کی ہے وہ مختلف صورتوں سے اسی کتاب کے متن و حواشی میں جابجا درج کی جا چکی ہے۔ جس سے موصوف کی نظر میں اس کی بے اعتباری ظاہر ہے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اس کا طرز بیان بہت ہی دلچسپ اور اس کی تحقیقات بیحد قابل داد اور پرمنفعت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے تعصب نے اس کو اتنا موقر نہ رکھا۔ جتنا کہ اس کو ہونا چاہئے تھا۔ اس کی عادت ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب پر تو نکتہ چینی کرتا ہے۔ لیکن اپنے اور اپنی قوم کے انہیں عیوب کو نظرانداز کر جاتا ہے۔ اور کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ چنانچہ اس نے ۱۰۔ جون ۱۶۶۸ء کے ایک خط موسومہ مسٹر چیپ لین میں جو شیراز سے لکھا گیا تھا۔ ہندوؤں کے عقائد سے بحث کرتے ہوئے ان کے طریق عبادت و بت پرستی پر اعتراض کیا ہے۔ حالانکہ وہ خود جس مذہب کا متبع تھا اس میں حضرت مسیح علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام کی شبیہیں اور پطرس حواری کے جوتے کی نقل رکھی جاتی مقدس جان کران کی پرستش کی جاتی اور ہندوؤں کی طرح دوپ دیپ دے کر گھنٹے بجائے جاتے ہیں۔ یا اس نے سفرائے حبش کا جو دربار مغل میں آئے تھے گھوڑے کا گوشت کھانے پر بہت مذاق اڑایا ہے۔ حالانکہ اس کی قوم خود ایک زمانہ میں بہ شوق اس کو کھاتی رہی ہے۔ تعصب نے اسے عیب پر اہنر بایہ کے حکیمانہ مقولے پر بھی عمل نہ کرنے دیا۔ اس نے سلاطین، شاہزادگان اور بیگمات تیموری کے متہم کرنے کو اپنا نصب العین بنایا۔ چنانچہ قلم کی روانی میں شاہجہان، جہاں آرا اور روشن آرا وغیرہ پر

ہوگیا۔ ۱۶۵۴ء میں وہ ملک شام کو گیا۔ وہاں سے وہ ملک مصر پہنچا۔ ایک سال سے زائد قاہرہ پایہ تخت مصر میں قیام پذیر رہا۔ پھر ہندوستان آیا اور بندرگاہ سورت پر اترا۔ جس زمانہ میں یہ ہندوستان پہونچا ہے۔ عالمگیر اور اس کے بھائیوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ داراشکوہ جب اجمیر سے احمد آباد کی طرف بھاگا ہے۔ تو چونکہ اس کے ساتھ کوئی طبیب نہ تھا۔ اور ایک بیگم کے پیر میں خطرناک زخم تھا۔ لہذا اس نے برنیر کو جبراً اپنے ساتھ لے لیا۔ داراشکوہ راجہ کچھ سے مشکوک ہو کر ٹھٹھہ کی طرف گیا تو برنیر کولیوں کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ جنہوں نے بڑی مشکل سے ۸ دن اس کو نظربند رکھ کر رہا کیا۔ اور احمد آباد کے قریب پہنچا دیا۔ وہاں اس کی ایک امیر سے ملاقات ہوگئی۔ اور اس امیر نے اس کو دہلی تک پہنچا دیا۔ برنیر ہندوستان میں بارہ برس تک رہا۔ جس میں سے ۸ سال تک اس نے عالمگیر کے طبیب خاص کی خدمات انجام دیں۔ اور بقیہ زمانہ ملاشفیعائے یزدی المخاطب بہ نواب دانشمند خاں کی ملازمت میں بسر کیا +

نواب دانشمند خاں عہد عالمگیر اور عہد شاہجہان کے باکمال لوگوں میں سے تھا۔ یہ شخص فلسفہ، ہیئت اور ہندسہ میں بالتخصیص مشہور و معروف تھا۔ اور ایسا زبردست عالم تھا کہ نعمت خاں عالی جیسا فاضل اس کا شاگرد تھا۔ شاہجہان نے محض اس کے علم و فضل کی شہرت سن کر جبکہ وہ اپنے وطن کو تجارت کے کاروبار سے فارغ ہو کر واپس جا رہا تھا۔ بندر سورت سے واپس بلا کر امرائے دربار میں داخل کر لیا تھا۔ عالمگیر کے عہد میں یہ سوار فوج کے میر بخشی کے عہدے سے ترقی کر کے وزیر خارجہ کے عہدے پر ممتاز ہوگیا تھا۔ صرف ایک یہی ایسا امیر تھا کہ جس کو اس کے شغف علمی کی وجہ سے شام کے دربار غسلخانہ کی حاضری سے جس میں ہر امیر کا حاضر ہونا لازمی تھا مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ یہ صرف چہارشنبہ کو کہ اس کی چوکی کا دن تھا۔ دربار مذکور میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ اس فاضل اجل نے ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی +

میں برنیر کا ذکر کرتے کرتے نواب دانشمند خاں کا تذکرہ کرنے لگا۔ خیر غرض یہ کہ برنیر دربار شاہی میں تین سو روپیہ ماہانہ پاتا تھا (جو اس زمانہ میں ایک بڑی تنخواہ تھی) اور ذی عزت عہدہ داروں کے زمرہ میں شمار ہوتا تھا۔ وہ ۱۶۶۷ء میں فرانس واپس گیا۔ اور اس نے ۱۶۷۱ء میں اپنا مشہور و معروف سفرنامہ شائع کیا۔ اس سفرنامہ کا انگریزی ترجمہ جو کانسٹبل (المتوفی ۲۱۔ جولائی ۱۸۲۷ء) کے بیان سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا بہترین ہے۔ (کانسٹبل ایک وہ ہستی تھی جس کے دنیائے علم پر صدہا احسانات ہیں اسی معزز کتب فروش نے ۱۸۰۲ء میں انسائیکلوپیڈیا برٹانکا کا حق تصنیف ۱۳۔ ہزار (۱۳۰۰۰) پونڈ میں خریدا تھا) ۱۶۸۸ء میں برنیر نے اس قلم سے انتقال کیا کہ ڈی ہرے اولین صدر جمہوریہ فرانس نے جلسہ عام میں اس کی نسبت سخت لعن طعن کی تھی۔ برنیر ایک خوشرو، موزوں قد، خلیق،

ممالکِ خارجہ کو (خواہ وہ سفیر ہوں، تاجر ہوں یا سیّاح ہوں) ملکی آدمیوں کی طرح معلومات بہم نہیں پہنچ سکتی ہے برنیر یا ٹیورنیر کے بیانات کو ہمیں نظرانداز کرنا چاہیئے۔ ہاں جس جگہ کسی وجہ سے یہاں کے ملکی مورخین خاموش ہوں اس جگہ ان لوگوں کی تصانیف دیکھ کر اور کھرے کھوٹے کا امتیاز کرکے خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کرلینا چاہیئے۔۱۲

نوٹ نمبر۳۔ وقائع سیاحت ڈاکٹر برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب۔ ۱۲ +

حاشیہ

تخت کے گرداگرد گیارہ تختے مرصع و مغرق بجواہر ٹکنے کے لئے بطور حاشئے کے لگے ہوئے تھے[۱]۔ اور صرف بیچ کا تختہ جو صدر میں بادشاہ کے تکیہ لگانے کے لئے بنایا گیا تھا دس لاکھ (۱۰۰۰۰۰۰) روپے میں تیار ہُوا تھا۔ اور کثرتِ جواہر سے مجموعۂ جواہرات بنا ہُوا تھا[۲] +

نوٹ نمبر ۱ و ۲۔ بادشاہنامہ، ظفرنامہ شاہجہاں، سیر المتاخرین، سفرنامہ برنیر اور مآثر الامراء۔۱۲+

ایک تاریخی لعل

اس تختے میں یوں تو بڑے بڑے بیش قیمت، بے نظیر اور عدیم المثال جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ لیکن ایک بیش بہا، نادر، نایاب اور تاریخی لعل خصوصیّت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ اس خصوصیّتِ ذکر کی وجہ یہ کہ عام طور پر حصولِ جواہر میں جو دقتیں پیش آتی ہیں اُن کو لوگ نظرانداز کردیتے ہیں۔ بخوفِ تکرار یہاں وضاحت نہیں کی جاتی، پھر بھی اس کنائے کے بغیر چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ کہ لفظ "تعبیہ" کی تفہیم کے ساتھ جواہر تراشی کی دقتوں کی جانب بھی اشارہ کیا جائے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے، ناری الاصل صخور نہایت ہی سخت اور صلد ہوتے ہیں۔ ان کا کاٹنا ایک نہایت اہم امر ہے۔ اور اس وقت میں اُس وقت اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے جبکہ اِن جواہرات کو کسی خاص ہندسی شکل کے موافق تراشنا

صدہا بیجا ناممکن اور بدنما الزام لگا دیئے۔ اور اس سے اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ کہ مغلوں کے خلاف اپنی قوم کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کرے فن سیاسیات کے ماہر ہی اس نکتہ کو خوب سمجھ سکتے ہیں۔ کیا پانڈیچری پر فرانسیسی جماؤ اور فرانسیسیوں کا گھور گھور کر ہندوستان کی طرف دیکھنا اس پروپیگنڈے کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو یوں کہئے کہ اقبال برطانیہ کے آگے فرانسیسیوں کا چراغ گل ہوگیا ورنہ آج ہندوستان انہیں کے زیر نگیں ہوتا +

نوٹ نمبر۲۔ ٹیورنیر۔ جین بیپٹسٹ ٹیورنیر نام، بیرن ڈی آبان لقب، اینٹورپ کے ایک لکڑی پر نقش ونگار کرنے والے کا بیٹا تھا۔ ۱۶۰۵ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ جواہرات کا بہت بڑا مبصر اور تاجر تھا۔ اس نے ایک جوہری کی حیثیت سے مغربی یورپ اور ایشیا کے بیشتر حصوں اور ملکوں کی سیاحت کی۔ اس نے بہ تفصیل ذیل چھ سفر کئے :۔

(۱) ۱۶۳۱ء سے ۱۶۳۳ء تک اس سفر میں وہ قسطنطنیہ کے راستے سے ایران گیا۔ اور وہاں سے ماٹا ہوتا ہوا اٹلی پہنچا +

(۲) ۱۶۳۸ء سے ۱۶۴۳ء تک اس سفر میں ملک شام طے کر کے اصفہان اور آگرہ ہوتا ہوا گولکنڈہ پہنچا +

(۳) ۱۶۴۳ء سے ۱۶۴۹ء میں اس سفر میں اصفہان ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ اور وہاں سے بٹیویا (جاوہ) ہوتا ہوا انٹیٹم کو گیا۔ اور وہاں سے راس امید کی راہ سے ہالینڈ +

(۴) ۱۶۵۱ء سے ۱۶۵۵ء تک (۵) ۱۶۵۷ء سے ۱۶۶۲ء تک (۶) ۱۶۶۳ء سے ۱۶۶۸ء تک۔ ان آخری تین سفروں میں اس نے زیادہ تر ہندوستان اور ایران کی سیاحت کی۔ ۱۶۶۹ء میں لوئس چہاردہم نے اسے خاص خطوط وفرامین عنایت کئے اور اگلے سال اس نے جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کے قریب آبان کا تعلقہ خریدا۔ ۱۶۸۴ء میں وہ الکٹر آف برینڈن برگ کی مشرقی تجارتی تجاویز میں مشورہ دینے کے لئے برلن گیا ۱۶۸۹ء میں اس نے بمقام ماسکو انتقال کیا۔ اس کے مشہور ومعروف چھ سفر ۱۶۷۶ء میں چھپے اور ان کا تتمہ ۱۶۷۹ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۱۰ء اور ۱۸۸۲ء میں اس کے سفرنامے کے دوسرے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں (از چیمبرس بیاگرفیکل ڈکشنری) ٹیورنیر کا ماخذ بہت کچھ برنیر کا سفرنامہ اور سنی سنائی باتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر سرکار نے اسکو بھی کچھ زیادہ معتبر نہیں سمجھا ہے۔ اس کے بیانات برنیر کے مقابلہ میں زیادہ وقیع نہیں کیونکہ وہ دربار شاہی سے ایک خاص تعلق رکھتا تھا۔ اور یہ محض ایک جوہری کی حیثیت سے دربارہ درباریوں میں آتا جاتا تھا۔ چونکہ ٹیورنیر برنیر کا ہم قوم، ہم مذہب، سیاحت میں ہمخیال تھا اور بہت کچھ اسی کے بیانات سے اخذ کرتا تھا اس لئے وہ ہر حیثیت سے اس کا مقلد ثابت ہوا۔ یہ بھی سخت متعصب اور آل تیمور کا بدنام کنندہ تھا۔ میرے خیال میں باشندگان

کے قبضے میں تھے متصرف ہوکر ان کا بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔ اس نے ۴۲-۴۳ سال تک حکمرانی کی۔ اور ۲۵- ذوالحجہ ۸۵۰ھ = ۱۲- مارچ ۱۴۴۷ء کو فارسی نوروز (انوار) کے دن جبکہ بحساب شمسی اس کی عمر ۷۰ سال کے قریب تھی بمقام فشاورد (علاقہ رئے) وفات پائی۔ پانچ بیٹے، مرزا الغ بیگ، ابراہیم مرزا، مرزا بایسنقر، مرزا سیرغمش اور محمد جوگی یادگار چھوڑے۔ بہت ہی خشک مزاج، بہادر اور صلح پسند بادشاہ تھا۔ باوجودیکہ ۴۲ ۴۳ سال حکمرانی کی۔ لیکن سوائے قبیلہ ترکمان کے (جو ایشیائے کوچک میں آباد تھا اور جسے امیر تیمور نے مسخر کر لیا تھا۔ لیکن اچھی طرح قابو میں نہ آیا تھا) اور کسی سے نہ لڑا باوجود خشک مزاجی کے لالچی نہ تھا۔ (اورنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری۔ تاریخ ہند مولوی ذکاء اللہ)

نوٹ نمبر ۲۔ مرزا الغ بیگ - الغ بیغ بھی مشہور ہے۔ مرزا شاہرخ کا بیٹا اور امیر تیمور کا پوتا تھا۔ اپنے باپ کے زمانۂ حیات میں ۴۰ سال تک سمرقند کا حاکم رہا باپ کی وفات پر ۸۵۱ھ ۱۴۴۷ء میں تخت حکومت پر جلوس کیا۔ وہ ایک بہت ہی بدقسمت آدمی تھا۔ کہ خانہ جنگی کا شکار ہوکر قید کرلیا گیا۔ اور اس کے بیٹے مرزا عبداللطیف نے ۲۷- اکتوبر ۱۴۴۹ء = ۸۵۳ھ میں اس کو قتل کر ڈالا۔ یہ تاریخی نکتہ ہے۔ کہ پدرکش سلاطین خود بھی زیادہ دنوں زندہ نہ رہ پائے۔ اور ان کو چین سے سلطنت کرنا میسر نہ آیا۔ چنانچہ اس شہزادے نے اتنے بڑے جرم کا مرتکب ہوکر سلطنت حاصل کی اور صرف ۶ مہینے سلطنت کرنے کے بعد اپنی فوج کے ہاتھوں قتل کردیا گیا اور خسرالدنیا والاخرہ کا مصداق بنا +

مرزا الغ بیگ علوم وفنون کا شیدا اور تعلیم وتعلم کا عاشق زار تھا۔ اس نے خود بھی بہت زیادہ تعلیم حاصل کی تھی۔ اور ساری عمر تعلیم وتربیت پر زور دینے میں گزاری وہ لڑائی سے ہمیشہ بالکل الگ تھلگ رہا۔ فن نجوم میں اس کو مہارت تامہ حاصل تھی اور اس سے اس کو بہت زیادہ دلچسپی بھی تھی۔ اس نے اپنے ممالک محروسہ کے تمام نجومیوں اور اس زمانہ کے تمام آلات کو پایۂ تخت میں جمع کرکے دلچسپ تحقیقاتیں کیں۔ اور مفید معلومات بہم پہنچائیں۔ زیچ الغ بیگ اسی زمانہ کی تحقیق وتفتیش کا نتیجہ ہے یہ علم ہیئت ونجوم کی ایک مشہور ومعروف کتاب ہے۔ اس نے ایک رصدگاہ بنوائی تھی۔ جس کی بلندی سینٹ اباصوفیہ (قسطنطنیہ کا مشہور ومعروف گرجا۔ جس کو ترکوں نے مسجد بنا لیا ہے۔ اور اب مسجد اباصوفیہ کہلاتا ہے) کے برابر یعنی ۱۸۰ (رومن) فٹ ہے +

مرزا نے مسطورنے ۱۴۳۷ء کے ثوابت (قائم رہنے والے ستاروں) کی ایک فہرست تیار کی تھی۔ جس کو ۱۶۶۵ء میں ہائیڈ پریس آکسفورڈ نے حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ (ملخوذ از اورنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری۔ مولفہ ہنری جارج کین) - ۱۲ +

نوٹ نمبر ۳۔ شاہ عباس صفوی اوّل - صفوی خاندان کا ساتواں بادشاہ جس کو

مقصود ہو۔ جس میں زاویوں اور ضلعوں کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ ایک ضلع پر دوسرے ضلع اور ایک زاویہ پر دوسرے زاویہ کا اس طرح سے پیوست ہونا کہ دو جواہرات مل کر ایک چیز معلوم ہوں۔ حقیقتاً صنعت کی ایک عجوبہ کاری ہے۔ کہ جس کی مثالیں اب ناپید ہو رہی ہیں۔ سننے میں تو لفظ "تعبیۂ" سے ایک معمولی کام کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس عرق ریزیٔ جگر خراشی اور جانفشانی کی داد ہم اس وقت دے سکتے ہیں جب پورے طریقے سے ان دقتوں کو محسوس کریں۔ جو فن جواہر تراشی میں صنعت کاروں کو پیش آتی ہیں۔ اس لعل پر ہر اس شخص نے جس کے بھی وہ قبضہ میں رہ چکا تھا اپنا اپنا نام کندہ کرایا تھا۔ اور سب سے زیادہ عجیب و سخت ترین درجہ اس لعل کے تعبیہ کرنے میں یہی تھا۔ کہ جن لوگوں کے نام کندہ تھے وہ اپنی پوری حیثیت سے اس میں قائم رہ جائیں اور تعبیہ ہونے میں لعل کی خوشنمائی میں بھی کوئی فرق نہ آئے۔ چنانچہ امیر تیمورؒ صاحبقران اول، مرزا شاہرخ[۱]، مرزا الغ بیگ[۲] اور شاہ عباس[۳] صفوی اوّل بادشاہ ایران کے اسمائے گرامی اس پر پہلے سے کندہ تھے۔ اور جب شاہ عباس موصوف الصدر نے ۱۶۲۰ء میں اپنے سفیر زنبیل بیگ کے توسط سے بہت سی بیش بہا اور نادر اشیاء کے ساتھ یہ لعل جہانگیر کو تحفتاً بھیجا ہے[۴]۔ تو جہانگیر نے اپنے باپ اکبر کے نام کے ساتھ اپنا نام کندہ کرا کے علامی[۵] افضل خاں کے ذریعہ سے شاہجہان کو فتح دکن کے صلہ میں مرحمت فرمایا تھا[۶]۔ شاہجہان نے اس پر اپنا نام منقوش کرا کے تخت طاؤس کی تکیہ گاہ میں جڑوا دیا۔ اس عجوبۂ روزگار لعل کی قیمت ایک لاکھ (۱۰۰۰۰۰) روپیہ تھی[۷]۔

نوٹ نمبر ۱۔ مرزا شاہرخ۔ امیر تیمور صاحبقران کا چوتھا بیٹا ۱۴۔ ربیع الاوّل ۷۷۹ھ مطابق ۲۱۔ جولائی ۱۳۷۷ء کو پیدا ہوا۔ باپ کے ساتھ بہت سی لڑائیوں میں شریک رہا۔ چنانچہ فتوحات ہندوستان اسی کی قوت بازو کا نتیجہ تھیں۔ باپ کے انتقال پر ۱۴۰۹ء میں خراسان کا حاکم تھا۔ وہیں کا مستقل فرمانروا ہو گیا۔ ۸۱۱ھ/۱۴۰۸ء میں جبکہ اس کا برادر زادہ سلطان خلیل مرزا فرمانروائے سمرقند قید ہو گیا۔ تو یہ فوجیں لے کر بڑھا۔ اور اس کے ممالک پر قبضہ کرنے کے علاوہ ایران، توران اور قریب قریب ان تمام ممالک پر جو امیر تیمور

کھڑے ہونے کا مستحق نہیں رہتا۔ رفع کردوں +

کوئی صاحب ہشام میرٹھی ہیں۔ جو اس تخت ولعل پر ۱۱-۱۲ سطروں میں روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں "یہ بیش بہا جواہر شاہ عباس بادشاہ ایران نے اپنے ایلچی کے ذریعے سے جنت مکانی جہانگیر بادشاہ کو ہدیتاً بھیجا تھا۔ جب شاہجہان نے دکن فتح کیا تو جہانگیر نے خوش ہو کر اس فتح کے صلہ میں اپنے غلام افضل خان کے ہاتھوں شاہجہان کو عنایت کیا تھا" +

کیا اس عبارت کو پڑھ کر کوئی سمجھ سکیگا۔ کہ افضل خان وہی افضل خان ہیں جو علامی ابوالفضل کے بعد خطاب علامی کے مستحق ٹھیرے تھے۔ جن کے علم وفضل کی ہر چہار جانب دھوم تھی۔ جو دارالعلم شیراز کے مایۂ ناز فرزند اور شاہجہان کے دیوان کل (وزیر اعظم) تھے نہیں اور ہرگز نہیں۔ پڑھنے والا صرف یہ سمجھے گا کہ وہ شخص شاہی غلام تھا۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ خیال کریگا۔ کہ بڑا معتمد غلام تھا۔ جب ہی تو لاکھ روپیہ کا لعل بادشاہ نے اسکے ہاتھوں بھجوایا۔ معزز مضمون نگار نے کسی فارسی تاریخ سے ترجمہ کیا ہے۔ اور اس میں کوئی ایسا ہی عجزی لفظ ہوگا۔ جیسا کہ پرانے انشا پرداز ملازمین و وابستگان دامن کے لئے لکھا کرتے تھے۔ مثلاً فدوی درگاہ۔ بندۂ درگاہ وغیرہ وغیرہ جس کا ترجمہ آزادی سے کردیا گیا۔ اصل میں ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ ترجمہ کرتے وقت وہ امتیازی خصوصیات ضرور مدنظر رکھی جائیں جن سے کسی آدمی کی حیثیت پر اثر پڑتا ہو۔ خصوصاً تاریخی اور کسی خاص فن کے متعلق تراجم میں۔ تاریخ ایک ایسا راستہ ہے۔ جس کے دونوں طرف بڑے بڑے خوفناک غار اور کھنڈ ہوتے ہیں۔ قدم چوکا پاؤں کو لغزش ہوئی اور آدمی کہیں سے کہیں پہنچا۔ سرسری نظر ڈالنے سے بھی تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ کہ اس زمانہ میں جبکہ آئین وآداب کی پابندی بڑی لازمی تھی اور تحت وعطایا مرسل الیہ کی حیثیت و وقعت کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک حیثیت دار آدمی کے ہاتھ بھیجے جایا کرتے تھے۔ وہ باپ جو شہنشاہ ہند ہے اس بیٹے کو جس کے متعلق دادا نے رودر روسفارشیں کی ہیں۔ مسند پہ تخت کے برابر بٹھالا جاتا ہے۔ لائق ہے، فائق ہے، جس کی شمشیر خارا شگاف کا لوہا سارا دکن مانے ہوئے ہے ایک غلام کے ہاتھ صلہ بھیجتا۔ معطی جہانگیر، عطیہ ایک قابل قدر نادر روزگار لعل ولیعہد سلطنت شاہجہان کو اور حامل دبندہ ایسی معمولی شخصیت۔ شاید لائق مضمون نگار نے آبحیات میں وہ واقعہ نہیں پڑھا جو میرتقی میر اور نواب سعادت علیخان فرمانروائے اودھ (المتوفی ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۸۱۴ء) کے مابین گزرا۔ وہو ہذا +

جب نواب آصف الدولہ (المتوفی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۷ء) کی وفات ہوئی۔ اور نواب سعادت علیخاں کا دور ہوا۔ تو میر صاحب دربار جانا چھوڑ چکے تھے۔ وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی۔ یہ تحسین کی مسجد پہ سرراہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے آئی سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشا خواصی میں تھے۔ نواب نے

پرانے زمانہ کی تاریخوں میں "عباس ماضی" لکھا گیا ہے +
بروز دوشنبہ ۲۹ - جنوری ۱۵۷۱ء مطابق یکم رمضان ۹۷۸ھ پیدا ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں اس کو امرائے خراسان نے ۱۵۸۶ء میں تخت نشین کیا۔ اکبر و جہانگیر کا ہمعصر تھا حدود سلطنت کے بڑھانے میں اس نے بہت سعی کی۔ ۱۶۲۲ء میں مغربی اقوام سے آرموس (جزیرہ آئی لینڈ) چھین لیا۔ یہ جزیرہ ایک سو بائیس سال سے پرتگالیوں کے قبضے میں تھا۔ عراق عرب کو مسخر کیا۔ ترکوں سے برابر کی صلح کی۔ ازبکوں سے خراسان چھینا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک سارے ایران کو اپنے زیر نگین کر لیا۔ یہ سب سے پہلا بادشاہ ہے جس نے اصفہان کو پایۂ تخت بنایا۔ ۴۴ سال حکومت کرنے کے بعد ساٹھ سال کی عمر میں ۲۴ - جمادی الاول ۱۰۳۸ھ مطابق ۱۶۲۹ء میں انتقال کیا +
شاہ عباس بہت ہی چالاک، خوش مزاج، بہادر، علم دوست - ہنر شناس اور بیدار مغز بادشاہ تھا۔ اس کا دربار بھی مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا مرکز تھا۔ یہ شیعی المذہب تھا اور تشیع میں اسے بہت غلو تھا۔ وہ وسعت حکومت اور انتظامات ملکی میں دوسرا اکبر یا شاہجہان تھا۔ اس نے ملک کے امن و امان، آبادی و سرسبزی کے لئے جو کام کئے ہندوستان کا تیموری خاندان بھی نہ کر سکا۔ اس نے اس سرے سے اُس سرے تک کاروان سرائیں بنوائی تھیں - جن میں مسافروں کے لئے سلطنت کی طرف سے تمام چیزیں مہیا رہتی تھیں +
اس میں اور اکبر میں علے ہذا اس کے اہلکاروں، امراؤ اعیان سلطنت اور اکبر کے متوسلین و امرائے دولت میں اکثر معاصرانہ چوٹیں چلا کرتی تھیں +
لطیفہ - ایک مرتبہ شاہ عباس نے ملا وحید طاہر کی یہ رباعی اکبر کے دربار میں بھیجی۔ جس میں در پردہ اپنی تعریف اور اکبر پر چوٹ تھی + ے

زنگی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد | رومی بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پر از زر نازد | عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

فیضی نے فی البدیہہ یہ رباعی نذر پیش کی۔ جو جواباً دربار ایران میں بھیجی گئی ے

فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد | دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد | کونین بذاتِ پاکِ اکبر نازد

(ماخوذ از شعر العجم - حیات صالح - اورنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری مولفہ مسٹر جارج کین ۱۲)
نوٹ نمبر ۴ - ہسٹری آف جہانگیر - بادشاہنامہ - مآثر الامراء - ۱۲ +
نوٹ نمبر ۵ - علامہ افضل خان - قبل اس کے کہ اس علامۂ روزگار ہستی کے حالات پر روشنی ڈالوں - مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس اشتباہ کو دور کروں جو "پیمانہ" آگرہ بابتہ ستمبر ۲۵ء کے صفحہ ۶۲ کے مطالعہ سے اس لائق و فائق شخصیت کے متعلق ہوتا ہے اور جس سے بساطِ سلطنت مغلیہ کا ایک مورد تحسین و تعریف وزیر فرزانہ پیادوں کی صف میں بھی

علم وفضل کے باعث شہرت وعزت پائی۔ سلطنت مغلیہ میں صرف تین امرا کو علامی کا خطاب حاصل ہوا۔ (۱) علامی ابوالفضل (المتوفی ۱۰۱۱ھ) وزیر اکبر۔ (۲) یہی ملا شکر اللہ علامی افضل خان اور (۳) علامی سعد اللہ خان (المتوفی ۱۰۶۶ھ مطابق ۱۶۵۶ء) وزیر شاہجہان۔ لطف یہ ہے کہ تینوں کی سوانح زندگی اٹھا کے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر ایک نے اپنی علمی قابلیت اور ذاتی لیاقت کی وجہ سے سب کچھ حاصل کیا +

علامی افضل خان شیراز سے اول بندر سورت میں آئے اور خانخانان عبدالرحیم خان کی مصاحبت میں داخل ہوئے۔ بعدہٗ شہزادہ خورم (شاہجہان) کی ملازمت میں منسلک ہو کر میر عدل لشکر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد دربار جہانگیری سے افضل خان کا خطاب عطا ہوا۔ شاہجہان کے عہد میں پہلے میر سامان پھر علامی ہو کر دیوان کل (وزیر اعظم) ہوئے۔ "شد فلاطوں وزیر اسکندر" تاریخ وزارت ہوئی۔ ۱۰۴۵ھ میں شاہجہان نے ان کو ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب عنایت فرمایا۔ ۱۲ رمضان ۱۰۴۸ھ کو ۷۰ سال کی عمر میں بمقام لاہور انتقال کیا۔ کسی نے تاریخ کہی ؎

زخوبی برد گوئے نیک نامی

نعش آگرہ لاکر دفن کی گئی۔ ان کا مقبرہ "چینی کا روضہ" کہلاتا ہے۔ اور خوب عمارت ہے۔ گویا بیٹے (شاہجہان) کا وزیر باپ (جہانگیر) کے وزیر (اعتماد الدولہ) سے کچھ ہی دور ہٹ کر جمنا کے اس پار خواب عدم کے مزے لے رہا ہے +

علامۂ موصوف جامع معقول ومنقول، خوشنویس، خوشگو، خوش فہم، اعلےٰ درجے کے شاعر اور انشا پرداز تھے۔ لیکن علم حساب سے انہیں فطری تنفر تھا۔ اور بہت الجھتے تھے +

لطیفہ۔ علامہ افضل خان چونکہ حساب کتاب سے بہت گھبراتے تھے۔ اس لئے اس کے متعلق انہوں نے تمام اختیارات اپنے پیشکار لالہ دیانت رائے ناگر گجراتی کے سپرد کر رکھے تھے۔ ہر بات کے لئے اسی سے دریافت کر لیا کرتے تھے۔ اگر کوئی ان سے کچھ پوچھ بیٹھتا تو کہہ دیتے "دیانت رائے سے پوچھو" ان کے انتقال پر کسی نے ان کا مرثیہ کہا اور اس میں اس دلفقے کی طرف اشارہ کر کے لکھا۔ کہ فرشتوں نے قبر میں سوال کئے تو خان موصوف نے کہا "از دیانت رائے بہ پرسید۔ جواب شما خواہد داد" افسوس ہے کہ میں نے اس مرثیہ کو بہت تلاش کیا لیکن دستیاب نہ ہوا۔ ورنہ ناظرین کے سامنے اصل اشعار پیش کرتا)

علامہ موصوف کی عالی ظرفی و وسیع الاخلاقی اس سے ظاہر ہے۔ کہ باوجود ۲۸ سال ملازمت کرنے اور صاحب اقتدار رہنے کے شاہجہان کا بیان ہے۔ کہ "افضل خان کی زبان سے کبھی

پوچھا "انشا! یہ کون شخص ہے؟ جس کی تمکنت نے اُسے اُٹھنے بھی نہ دیا" عرض کی "جناب عالی یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر اکثر حضور میں آیا ہے۔ گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا" سعادت علیخاں نے آکر خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھجوایا۔ جب چوبدار لے کر گیا۔ میر صاحب نے واپس کر دیا۔ اور کہا "مسجد میں بھجوائیے یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں"۔ سعادت علیخاں جواب سن کر متعجب ہوئے۔ مصاحبوں نے پھر سمجھایا۔ غرض نواب کے حکم سے سید انشا (المتوفی ۱۲۳۳ھ) خلعت لے کر گئے اور اپنے طرز پر سمجھایا کہ "نہ اپنے حال پر بلکہ عیال پر رحم کیجئے۔ اور بادشاہ وقت کا ہدیہ ہے۔ اسے قبول فرمائیے"۔ میر صاحب نے کہا "صاحب! وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا۔ تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف۔ میرے حال سے واقف۔ اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپیہ کے خدمتگار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔ مجھے اپنا فقر و فاقہ قبول ہے مگر یہ ذلت نہیں اٹھائی جاتی +

دور کیوں جائیے مرزا نوشہ غالب (المتوفی ۱۸۶۹ء) کو لیجیے جنہوں نے مغلوں کا بگڑا ہوا دربار چند روز دیکھا تھا۔ ان کی آن بان کی یہ کیفیت ہے کہ یہ جس وقت ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کی فارسی مدرسی کی ملازمت کرنے کے سلسلہ میں ٹامسن صاحب سے ملنے گئے ہیں۔ تو پالکی سے اتر کر اس انتظار میں کچھ دیر کھڑے رہے کہ صاحب سکرتر استقبال کو تشریف لائیں۔ تو اندر جائیں۔ انہیں پہنچنے میں دیر ہوئی۔ اور صاحب کو وجہ بتلائی گئی۔ خیر وہ تشریف لائے اور کہا "مرزا صاحب! جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت ریاست تشریف لائینگے تو آپ کی حسب دستور تعظیم ہوگی۔ لیکن اس وقت جبکہ آپ نوکری کے لئے تشریف لائے ہیں اس تعظیم کے مستحق نہیں"۔ مرزا صاحب نے فرمایا "سرکاری ملازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں۔ نہ یہ کہ بزرگوں کا اعزاز بھی گنواں بیٹھوں"۔ صاحب نے کہا "ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہوکر چلے آئے کہ آن بان سے معذور تھے۔ (آبحیات و یادگار غالب) +

جب ان لوگوں کی کہ مغل تہذیب کے پیرو تھے یہ کیفیت ہو تو ان ہستیوں کا جو واضعین تہذیب و آئین تھیں کیا کچھ عالم نہ ہوگا۔ سلطنت و معاملات سلطنت میں باپ ہو یا بیٹا۔ بھائی ہو یا بھتیجہ۔ جورو ہو یا بیٹی۔ سب کے ساتھ پابندی قواعد مقررہ برتی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں ملا عبدالحمید مورخ شاہجہانی نے تو علامی کا لفظ بڑھا کر شک و شبہ کی گنجائش رکھی ہی نہیں +

اب ملاحظہ ہوں حالات " علامی افضل خاںؒ ":-

علامی افضل خاں۔ ملا شکر اللہ نام۔ افضل خاں اور علامہ خطاب، علامی تخلص، باپ کا نام عبدالحق۔ شیراز وطن تھا۔ سلطنت مغلیہ کے ان چند امرا میں سے ہیں جنہوں نے محض اپنے

سپر وغیرہ کے آویزاں رہتے تھے۔ درمیان میں ایک بہت بڑا صاف وشفاف بیش قیمت پتھر جس سے نظر وار پار ہو سکے، ۲۰۰ گرین کے وزن کا لعل ونیلم سے گھرا ہوا اس طرح آویزاں تھا کہ تخت پر جلوس کرنے والے کی نظر کے سامنے رہے۔ بارہ زمرد جڑے ستونوں اور جڑاؤ محرابوں پر قائم تھی۔ درمیانی محراب پر ایک طلائی درخت تعبیہ تھا۔ جس میں نادرہ کار صناعوں نے لعل، یاقوت، زمرد وغیرہ جواہرات کے پھل، پھول اور پتے بنا کر دادِ صنعت و دستکاری دی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ یہ درخت انسانی خوشگانی و دقیقہ رسی کا جیتا جاگتا معجزہ تھا۔ اس درخت کے اِدھر اُدھر دو نظیری مرصع طاؤس دم پھیلائے کھڑے تھے۔

نوٹ نمبر ۱۔ بادشاہنامہ وظفرنامۂ شاہجہاں - ۱۲

نوٹ نمبر ۲۔ بڑی جنتری بابتہ ۱۸۹۴ء قسط سوم تاریخ ہند - ۱۲

نوٹ نمبر ۳ - ۵ - حواشی سوانح اورنگ زیب مصنفہ لین پول مترجمہ لطیف احمد بی۔اے۔

نوٹ نمبر ۴ - پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن - ۱۲

نوٹ نمبر ۶ - "لارڈ کرزن" نے "پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن" میں ٹیورنیر کی سند پر ستونوں کی تعداد چار لکھی ہے۔ اور بابو ایشری پرشاد صاحب کی تاریخ ہند میں دی ہوئی تصویر "شاہجہان بر تخت طاؤس" سے بھی (جس کو ہم بھی کہیں دے آئے ہیں) اسی کی تائید ہوتی ہے۔ مگر صاحب بادشاہنامہ اور مورخین قدیم نے ۱۲ ستون لکھے ہیں۔ ٹیورنیر کے بیان کے مطابق ستون ملبوس دُرر تھے اور ان میں تعبیہ شدہ موتیوں میں سے ہر ایک کا وزن ۲۴ سے ۴۰ گرین تک تھا۔

نوٹ نمبر ۷ - ۸ "قصص ہند" آزاد مرحوم

موروں کی تعداد اور اختلافِ مورخین

ان موروں کی تعداد اور محل وقوع کے متعلق مورخین میں بہت اختلاف ہے تاریخ ہندوستان منشورہ مالکان بڑی جنتری، سوانح اورنگ زیب مصنفہ لین پول صاحب چیمبرس انسائیکلوپیڈیا (مطبوعہ "لندن") اور ٹیورنیر کے بیانات سے ایک مور ثابت ہوتا ہے

کسی کے حق میں برائی نہ سُنی" ان کا ماہر سیاسیات ہونا اسی سے ظاہر ہے کہ شاہجہان جیسے دانشمند اور مردم شناس بادشاہ نے ان کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا تھا۔ دکن کے صدہا عقدے ان ہی کے ناخن تدبیر کے کھولے ہوئے تھے۔ علامہ موصوف لاولد تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے چھوٹے بھتیجے عنایت اللہ خاں کو متبنے کر لیا تھا۔ علم دوست، شریف نواز اور قدر دان بادشاہ نے ان کی وفات کے بعد اس کو ایک عقلمند کی نشانی سمجھکر عاقل خاں کے خطاب سے معزز و ممتاز کیا تھا + (قاموس المشاہیر۔ ماثر الامرا اور سیر المتاخرین)۔۱۲ +

نوٹ نمبر ۶ ۔ سیر و بادشاہنامہ ۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۷ ۔ تاریخ ہند اسمتھ ۔ بادشاہنامہ ۔ سیر ۔ ماثر الامراء +

نوٹ نمبر ۸ ۔ ماثر ۔ بادشاہنامہ ۔ تاریخ ہند اسمتھ ۔ ۱۲ +

ایک خاص ستارہ

تکیہ گاہ کے درمیانی اُبھرے ہوئے حصے کے عین وسط میں ایک ہیرے کا ستارہ لگا ہوا تھا جس کی شعاعیں چاروں طرف پھیل کر عالم برق پیدا کرتی اور تماشائی[۱] کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھیں۔ یہ ستارہ ایسی ترکیب کے ساتھ بنایا گیا تھا کہ اس کو گھمایا بھی جا سکتا تھا +

نوٹ نمبر ۱ ۔ پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن ۔ ۱۲ +

چھت

گنبد نما چھت (خالص کندن کی اندر سے بیشتر میناکار اور کہیں کہیں موزونیت کے ساتھ مرصع، خصوصاً باہر کی طرف لعل، یاقوت، الماس اور مختلف الاقسام رنگارنگ جواہرات سے مُغرق[۱]، جابجا گوہر ناسفتہ (جن میں سے ہر ایک کا وزن ۹ سے ۱۲ رتی[۲] تک تھا۔) تاباں و درخشاں، حاشیہ میں پر تکلف مدور صراحی دار مروارید کی جھالر لٹکی ہوئی۔ موقع بموقع موتیوں کی لڑیوں کے حلقے بنے ہوئے جن میں اسلحۂ سلطانی مثل گرز، شمشیر، تیر، کمان اور

کوئی مذہبی یا سیاسی مسئلہ بھی نہیں ہے جو اس نے بادشاہ کے خوف یا اپنے خیالات سے اس میں تغیر و حذف سے کام لیا ہو۔ مورخ مذکور ہی کے بیان سے اخذ کر کے یا خود دیکھکر خافی خان اور ڈاکٹر برنیر وغیرہم نے دو مور لکھے ہیں اور یہی صحیح ہے اس کے علاوہ نقل کو عقل پر فضیلت بھی ہے +

نوٹ نمبر ا ۔ سوانح اورنگ زیب مصنفہ لین پول و مترجمہ لطیف احمد بی ۔ اے ۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲ ۔ ماثر الامراء ۔ سفر نامہ ڈاکٹر برنیر ۔ ۱۲ +

محلِ وقوعِ طواویس

یہ بحث تو تھی تعدادِ طواویس کے متعلق، اب رہا مسئلہ محل وقوع طواویس ۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ تکیہ گاہ پر تھے ۔ مگر خافی خاں، ملا عبد الحمید لاہوری اور برنیر چھت کے بیان کرتے ہیں ۔ اور یہی قرین قیاس ہے ۔ ہم مولانا آزاد دہلوی کی رائے کے موئد ہیں ۔ جو ان سے ماخوذ اور یہ ہے ۔

رو کار کی محراب پر ایک درخت طلائی بھاری دھرا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اِدھر اُدھر اس کے دو مور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کھڑے تھے +

نوٹ نمبر ا ۔ بک آف نالج ۔ ۱۲ + نوٹ نمبر ۲ ۔ قصص ہند ۔ ۱۲ +

کیفیت طواویس

صناع نے ان ہر دو طاؤس ہائے طلائی کو ایسی خوبصورتی سے دم پھیلائے ہوئے بنایا تھا ۔ کہ آمادہ رقص معلوم ہوتے تھے ۔ اور ان کی دموں میں اس خوش اسلوبی و حسن ترتیب سے نیلم، زمرد، فیروزے اور دوسرے جواہرات تعبیہ کئے تھے ۔ کہ دم طاؤس کا اصلی مذاق نمایاں تھا ۔ ہر ایک کی چونچ میں سڈول اور یکساں موتیوں کی تسبیح پڑی ہوئی ۔ سینے پر

اور "دو گلدستے" لیکن مرتب انسائیکلوپیڈیا آف برٹانکا، مورخ شاہجہانی، مولوی ذکاء اللہ، صاحب ماثر الامراء، اور ڈاکٹر برنیر وغیرہم "دو۔ دو مور اور ایک ایک درخت" بیان کرتے ہیں۔ اور یہی قول مستند معلوم ہوتا ہے +

شاہجہان کی طبیعت کا اندازہ کرتے ہوئے بھی ایک مور کا ہونا ناممکن کیونکہ اسے ہر چیز میں جواب کا التزام تھا۔ چنانچہ اس کی بنوائی ہوئی کوئی عمارت اس شان سے خالی نہیں۔ حتیٰ کہ تاج محل آگرہ میں اس نے ایک مسجد بنوائی۔ تو دوسری جانب اس کے مثل ایک مسجد بے سمت بنوا کر تسبیح خانہ کے نام سے موسوم کی +

ہماری اس رائے پر ایک اعتراض ہو سکتا ہے۔ کہ ٹیورنیر کے بیان کے موافق "چتر کے اوپر ایک طلائی طاؤس دم پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی دم فیروزوں اور جواہرات سے جڑی ہوئی تھی۔ طاؤس کے دونوں طرف طلائی پھولوں کے گلدستے تھے اُن میں بھی قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے[1]" بھی ذوق شاہجہانی کو صدمہ نہیں پہنچتا کیونکہ اِدھر اُدھر گلدستے اور بیچ میں مور +

اس اعتراض کا جواب ایک تو عقلی ہے۔ وہ یہ کہ کیا عجب ہے کہ ٹیورنیر لکھنا چاہتا ہو "دو مور اور ایک گلدستہ" مگر سہواً لکھ گیا ہو اس کے برعکس۔ اور دوسرے اس کے بیان کو اپنا ماخذ قرار دیکر غلط فہمی میں پڑ گئے ہوں۔ دوسرا نقلی کہ صاحب بادشاہنامہ جو مورخ شاہجہانی تھا لکھا ہے:۔

> "و مقرر شد کہ سقف آں را از درون بیشتر میناکار و لختے مرصع و از بیرون بہ لعل و یاقوت و جز آں مرصع مغرق ساختہ بر زمردیں اساطینِ دوازدہ گانہ برافرازد و بالاے آں دو پیکر طاؤس مکلل بہ جواہر زواہر و درمیان ہر دو طاؤس درختے مرصع بہ لعل و الماس و زمرد و مروارید تعبیہ کند" +

اس کا بیان سب سے زیادہ موثق ہے۔ کیونکہ اس کا کام ہی شاہی تاریخ نویسی تھا۔ یہ

(۳) مور اسی فرانسیسی ہی کے بنائے ہوئے تھے۔ اور اسی وجہ سے وہ بجید خوبصورت تھے +

(۴) ہندوستانی وایشیائی صنعت وقیع نہیں +

پہلے امر کے متعلق تو ہم یہ کہیں گے کہ قطعی غلط بقول ڈاکٹر ایشری پرشاد (جو عہدِ حاضرہ کے مشہور ومسلم الثبوت مورّخ صاحب تصانیف کثیرہ اور جامعۂ (یونیورسٹی) الہ آباد کے شعبۂ تاریخ کے ایک نمایاں وسر بر آوردہ رکن ہیں) اس تخت کی تعریف عہدِ مغلیہ کے سفرائے اروپا (یورپ) نے بڑے شدّ ومد کے ساتھ کی ہے۔ اگر وہ ایشیائی مذاق سے ناآشنائی کی بنا پر یا اپنی عادت کے موافق کہ ایشیائیوں اور خصوصاً ہندوستانیوں اور ان کی ہر ہر شئے کا مذاق اڑانے کے لئے ہر وقت اور ہر موقع پر اُدھار کھائے ہوئے ہے۔ ایسا کہتا ہے۔ تو تعجب نہیں۔ حیرت تو اس وقت ہوتی جب وہ ایسا نہ کرتا۔ کیونکہ یہ اسکی عادت کے خلاف ہوتا۔ پھر اس کے زمانہ کا یورپ آجکل کا سا صنّاع ودستکار اور ہر خطہ دنیا کے مذاق کا واقف ونبّاض نہ تھا۔ اور جواہر تراشی میں خصوصاً فرانس۔ اس لئے بھی بیچارا ڈاکٹر قابلِ عفو اور اس کی تحریر لائق چشم پوشی ہے +

دوسرے اور تیسرے امر کی مخالفت ہم علی الاعلان کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ محض ڈاکٹر مذکور کا جذبۂ وطن پرستی ہے۔ جو ایسا لکھوا رہا ہے۔ ورنہ اسکی کوئی حقیقت نہیں اس موقع پر پہلے اپنے یہاں کی تواریخ پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ ع

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

ہمارے یہاں کے مورخین نے جو عادتاً کبھی کسی کی صنعت ودست کاری پر خاک نہیں ڈالتے۔ اس طرف اشارہ وکنایہ سے بھی کام نہیں لیا ہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ بڑی شدومد کے ساتھ لکھتے۔ کیونکہ جب کبھی کسی غیر ملک یا غیر مذہب کے آدمی نے کوئی معمولی سا کام بھی کیا ہے۔ تو انہوں نے بالتصریح لکھا ہے۔ مثلاً کوہ نور کو ایک وینس کے باشندے

ایک ایک بیش قیمت لعل جڑا ہوا جس کے گرداگرد دو دو سو گرین کے وزنی موتی جمے ہوئے
گلے میں ۶۳-۶۳-۶۳ رتی موتیوں کا ہار ایک نورانی ہیرے سمیت (جس کا وزن ۱۱۷ رتی تھا)
آب و تاب کے ساتھ آویزاں تھا +

نوٹ نمبرا - قصص ہند - ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲ - پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن - ۱۲ +

ڈاکٹر برنیر کے ایک قول کی تنقید

اس موقع پر ڈاکٹر برنیر کے ایک قول کی تنقید کرنی بے محل اور خالی از دلچسپی نہ
نہ ہوگی - وہ تخت مذکور کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"مگر اس کی ساخت اور کاریگری ان جواہرات کے ہم پلہ نہیں ہے - البتہ
دو مورجو موتیوں اور جواہرات سے بالکل ڈھکے ہوئے ہیں - بہت ہی عمدہ
نقشے پر بنے ہیں - اور ان کو ایک صناع نے جس کی کاریگری اور ہنرمندی حیرت
کے لائق تھی - اور جو اصل میں فرانس کا رہنے والا تھا (اور جس نے یورپ کے
بہت سے رئیسوں کو جھوٹے جواہرات دے دیکر جن کو وہ ایک خاص حکمت
سے تیار کرتا تھا - خوب الٹا تھا اور پھر بھاگ کر شہنشاہ مغل کے یہاں پناہ
آن لی تھی - اور یہاں بھی خوب دولت کمائی تھی) بنایا تھا"

ڈاکٹر مذکور کے مسطورہ بالا بیان سے امور ذیل مستنبط ہوتے ہیں

(۱) تخت طاؤس بذاتِ خود کچھ زیادہ خوبصورت نہ تھا - اور نہ اس کی صنعت لائقِ داد
تھی - بلکہ صرف اس کے جواہرات قابل قدر تھے +

(۲) اس تخت کو محض ایشیائیوں نے نہیں بنایا تھا - بلکہ ایک فرانسیسی بھی اسکے بنانے
میں شریک تھا +

سے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہم اسلام کی تصاویر عام ہو چکی ہوں، اور دیوان عام کے شہ نشین والی تصویر کے متعلق بھی یہ امر آسانی سے واضح ہو جاتا ہے۔ کہ یورپ کے سلاطین سلاطین مغلیہ کو عام طور پر تحف و ہدایا بھیجتے رہتے تھے۔ ان کی قدر دانی اور مصوری کی خوش مذاقی سے آگاہ ہو کر کسی بادشاہ نے اپنے ملک کی پسندیدہ و مقبول عام تصویر "مرقع سرودِ آرفیوس" بھی بھیجی ہوگی۔ بادشاہوں میں سے کسی نے بہت پسند کی ہوگی یا اس نے پسند عام کا خلعت پہنا ہوگا۔ اور خود بادشاہ کے اشارے یا کاریگروں کی مزاج شناسی و نظربازی نے سر دربار لاکر لگا دی ہوگی۔

پس یہ کیسے ممکن تھا کہ اس تخت اور خصوصاً ان اعجوبۂ روزگار طاوسیں کے بنانے میں کوئی یورپین کاریگر شریک ہوتا یا قطعی وہی بناتا اور وہ نہ لکھتے۔ جس طرح بقول صاحب ارضِ تاج (واحد یار خاں بی اے اکبرآبادی، مدیر "نئی روشنی") یورپین قومیں تاج محل کی خوبی سے متاثر ہو کر روایتیں گڑھ گڑھ کر چاہتی ہیں کہ اس کے معمار ہی بننے کی عزت حاصل کرلیں" اسی طرح ڈاکٹر برنیر بھی یہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح تخت طاؤس کی ساخت و خوبصورتی کو ممنون صنعت فرانسہ بنا کر حب الوطنی کی داد دے۔ ہمارے خیال میں تخت طاؤس۔ کیکئی پنتر (केकयी पंत्र) نامی قصص الاصنامی خیالی یا واقعی تخت کے تخیل کی ویسی ہی حقیقی شکل تھا جیسی بقول واحد یار خاں صاحب "تاج" مقبرۂ ہمایوں کے ابتدائی خیال کی حد و انتہا ہے +

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ اگر کوئی مغربی تخت طاؤس کے بنانے میں شریک ہوتا۔ تو ٹیورنیر جو بقولِ سرکار ڈاکٹر مذکور کا خوشہ چیں اور ہماری رائے میں اسی کی طرح جذبۂ وطن پرستی سے مملو تھا۔ وہ اس امر کی توضیح کرنے میں دریغ نہ کرتا۔ ہمیں سرکار ممدوح کی رائے پر کہ "خاص امرائے دربار نے جو لکھا وہ زیادہ قابل تسلیم ہے" عمل کرنا اور اس امر کو بدیں وجہ کہ خود مورّخ شاہی نے ایسا نہیں لکھا غلط سمجھنا چاہئے +

ہارٹینلٹو بارگس نے تراشا ہے۔ وہ بے تکلف لکھ رہے ہیں۔ معماران تاج محل کے ذیل میں ملکی ہندو مسلمانوں کے ساتھ ایک رومی کا نام بھی بیدریغ تحریر کر رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض مقامات پر تو خواہ مخواہ یورپ کے ساتھ کہیں بطور شک اور کہیں بطور یقین اپنی خوش عقیدگی کا اظہار کر گئے ہیں۔ اور اپنی ملکی صناعی کو ان کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا ہے۔ جیسا کہ سرسید مرحوم نے تزوک جہانگیری مطبوعہ علیگڈھ میں جہاں جہانگیر نے ایک مسلمان ایشیائی کی ساختہ ہاتھی دانت کی ان چار نادر و نایاب تصاویر کا تذکرہ کیا ہے جو ایک پستہ کے چھلکے میں سما جاتی تھیں۔ اور جن میں سے ہر ایک بطور خود ایک مرقع تھی۔ اس تصویر کا بیان پڑھ کر جس میں ایک درخت ہے۔ درخت کے نیچے حضرت عیسےٰ بیٹھے ہیں۔ ایک آدمی آنحضرتؑ کے پاؤں چوم رہا ہے۔ وہ ایک پیر مرد سے باتیں کر رہے ہیں۔ چار شخص اور آس پاس کھڑے ہیں تحریر کیا ہے۔

ساختن تصویر حضرت عیسےٰ را وجہے معلوم نمی شود۔ غالباً ایں کارنامہ از کارنامہائے کاریگران فرنگ بودہ و بدستش افتادہ آں را از کارنامہ خود نذر گزرانید۔

یا سید صاحب مرحوم ہی نے شاہ نشین دیوان عام قلعہ دہلی میں بنی ہوئی تصاویر کا بیان آثار الصنادید میں کرتے ہوئے مرقع سرود آرفیوس کا ذکر کیا اور تحریر فرمایا ہے:۔

جو کہ اس مرقع کا فرنگستان کے سوا اور کہیں رواج نہیں تھا اس لئے یقین پڑتا ہے کہ اس قلعہ کے بنانے میں کوئی نہ کوئی اٹلی کا رہنے والا فرنگی شریک تھا۔

حالانکہ بقول علامہ شبلی نعمانی مرحوم "اس زمانہ میں یورپ یہ یورپ نہ تھا مسلمان انبیائے بنی اسرائیل سے ناآشنا نہ تھے۔ کہ ان کے لئے (اس اوّل الذکر مرقع میں) حضرت عیسےٰ کی تصویر بنانا دشوار و تعجب انگیز ہوتا خصوصاً جبکہ اکبر کے دربار میں عیسائیوں کے دخل پانے

نوٹ نمبر ۳ ۔ تاریخ ہند ڈاکٹر ایشوری پرشاد ۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۴ ۔ کوہ نور ۔ بلا اضافت یعنے " نور کا پہاڑ " ۔ گولکنڈہ (دکن) سے برآمد شدہ ایک مشہور و معروف ہیرا جس کی ابتدائی تاریخ پردہ خفا میں ہے ۔ ہندو روایات کے مطابق یہ ہیرا انگ دیش (   ) کے راجہ کے قبضہ میں تھا جس کا عہد سلطنت تین ہزار سال قبل مسیح گزرا ہے ۔ یہ راجہ "جنگ مہا بھارت" میں شریک تھا ۔ ایرانی روایات بتلاتی ہیں کہ وہ توران کے بادشاہ افراسیاب کے پاس تھا ۔ لیکن منظر عام پر ۱۳۰۴ء سے آیا ہے ۔ جبکہ راجۂ مالوہ کی شکست کے بعد علاؤ الدین خلجی کے ہاتھ لگا ۔ اور یہیں سے اس کی تاریخ شروع ہوتی ہے ۔ تاہم دو سو بائیس برس تک اس کے تاریخی حال پر اس کے بعد بھی پردہ پڑا رہا ۔ اور ۱۵۲۶ء میں وہ قطعی طور پر بے نقاب ہوگیا ۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ سلطان ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد اس کی ماں نے اسے بابر کی نذر کیا ۔ اور شاہجہان کے دور سے وہ بڑی شد و مد کے ساتھ صفحات تاریخ پر ضوفگن ہے ۔ اور غالباً یہ نام بھی اس نے اسی بامذاق بادشاہ کے حضور سے پایا ہے ۔ شاہجہان نے ہارٹینسلو بارگس نامی ایک جواہر تراش سے جو وینس کا باشندہ تھا اس کو ترشوایا اور اس کی غلطی سے اس کا بہت سا حصہ ضائع ہوکر اس کا وزن ۱۸۶ ½ قیراط رہگیا ۔ جس کے تاوان میں شاہجہان نے اس سے دس ہزار روپیہ وصول کیا +

کوہ نور وضع قطع میں گلاب کے پھول کے مشابہ تھا ۔ اس پر مسلسل سطوح بغیر کسی ابھار کے نمایاں تھیں ۔ اس کو بالکل مرغی کے نصف توکدار انڈے کی مانند تصوّر کرنا چاہئے ۱۷۳۹ء تک یعنی دو سو تیرہ سال یہ مغلوں کے قبضہ میں رہا ۔ اور بعدہٗ اسی سنہ میں نادرشاہ بادشاہ ایران اسے لوٹ کر ایران لے گیا ۔ نادر کے قتل کے بعد ۱۷۴۷ء میں وہ اس کے بھتیجہ علی عادل شاہ کے قبضہ میں پہنچا اور اس کی معزولی کے بعد نادر کے پوتے شاہرخ مرزا کے تصرّف میں آگیا ۔ جس نے ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ ابدالی کے سپرد کردیا ۔ رفتہ رفتہ وہ ۱۸۰۰ء میں شاہ شجاع والی کابل کے پاس پہنچا ۔ اور جب شاہ شجاع کابل سے بھاگ کر راجہ رنجیت سنگھ والی پنجاب کے یہاں پناہ گزین ہوا ۔ تو راجہ موصوف نے یکم جون ۱۸۱۳ء میں اس کو مجبور کر کے اس ہیرے کو اپنے قبضہ میں کرلیا ۔ اور ۱۸۴۹ء تک یہ اس خاندان کے حیطۂ تصرف میں رہا ۔ اور رانی چاند کنور کے حکومت برطانیہ سے برسر معرکہ ہونے اور شکست پانے پر لارڈ ڈلہوزی کے مقررہ کردہ بورڈ کے قبضہ میں پہنچا ۔ اس بورڈ نے اس ہیرے کو لارڈ لارنس کے حوالہ کیا جو اس زمانہ میں سرجان اور ینس کے نام سے ناظم ملکی پنجاب تھے ۔ اور انہوں نے پھر لارڈ ڈلہوزی ہی کے ہاتھ اسے بمبئی بھیجا ۔ لارڈ ڈلہوزی نے بہ نفس نفیس خود بمبئی پہنچ کر مجلس منتظمہ سرکار کمپنی کے حوالہ کیا اور ۲ ۔ جولائی ۱۸۵۰ء کو اسے ڈائرکٹران کمپنی کے وائس چیرمین نے ہدیتاً ملکہ معظمہ وکٹوریا قیصرۂ ہند مرحومہ کے

چوتھا امر بھی قطعی خلاف واقعہ ہے۔ اہل ایشیا خصوصاً ہندوستانیوں کی صنعت و دستکاری زمانہ قدیم سے ضرب المثل رہی ہے۔ اور انہوں نے اپنے حیرت انگیز صنعتی کارناموں سے دنیا کو انگشت بدندان بنا دیا ہے۔ جو اس دعوے کی دلیل قطعی ہے۔ خود ڈاکٹر موصوف کا یہ قول "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کا مصداق ہے +

"دہلی میں ہنرمند کاریگروں کے کارخانے بالکل نہیں ہیں۔ مگر اس کا یہ سبب نہیں کہ ہندوستانی لوگ صناعی اور کاریگری کی قابلیت نہیں رکھتے کیونکہ ہندوستان کے ہر ایک حصے میں بہت سے ہوشیار اور ذہین لوگ پائے جاتے ہیں۔ اور بیشمار خوبصورت چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جن کو لوگ بغیر کلوں کے بناتے ہیں اور جنہوں نے شاید کسی استاد سے تعلیم نہیں پائی ہوتی۔ بعض اوقات تو یہ لوگ یورپ کی چیزوں کی ایسے کامل طور سے تقلید کرتے ہیں کہ اصل اور نقل میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ منجملہ اس قسم کی اور اشیاء کے نہایت عمدہ شکاری بندوقیں ہیں۔ اور سونے کے زیورات تو ایسے عمدہ بناتے ہیں کہ کوئی یورومین سناران سے بڑھ کر شاید ہی بنا سکے۔ مصوری و نقاشی کا بھی ایسا نازک اور باریک کام تیار کرتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر میں اکثر حیرت میں آ گیا ہوں جلال الدین محمد اکبر کی بڑی مہموں کی ایک شبیہ جو ایک مشہور اور نامی مصور نے ایک ڈھال پر سات برس کے عرصہ میں تیار کی تھی۔ اس نے تو بالتخصیص مجھ کو حیران کر دیا اور میں نے اس کو ایک عجیب کام خیال کیا" [۱۲]

نوٹ نمبر ا ۔ وقائع سیاحت برنیر۔ ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲ ۔ ڈاکٹر ایشری پرشاد صاحب = ایم۔ اے یہ صاحب الہ آباد یونیورسٹی کالج میں شعبۂ تاریخ کے ہسٹری ریڈر ہیں۔ بہت ہی قابل آدمی ہیں۔ انہوں نے اردو ہندی میں ایک سلسلہ تاریخ لکھا ہے۔ جو انگریزی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ ان کی مشہور تاریخی تصنیف "مڈیول انڈیا" ہے۔ یہ ایک محقق مورخ ہیں +

مشاہیر دہلی کے حالات پر مشتمل ہے طرز تحریر پرانے ڈھنگ کا ہے۔ مگر معتبر تاریخ ہے۔ سرسید نے ۲۷۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو بمقام علیگڈھ وفات پائی اور کالج کے احاطہ میں مدفون ہوئے۔ ان کی بعد کی تصنیفات کی زبان بہت شستہ ہے۔ ان کے اخلاق کے متعلق مسٹر بک کا قول نقل کر دینا کافی ہوگا۔ انہوں نے موصوف کے انتقال کے بعد لکھا ”گو ان کی لیاقتیں بہت بڑی تھیں۔ مگر اخلاق ان سے بھی بڑھے چڑھے تھے“ (گلدستہ ادب اور سیر المصنفین) +

نوٹ نمبر ۷ ۔ یہ تصویر ملک اٹلی کے رہنے والے ارفیوس نامی ایک کلاونت کی ہے جس کی کہانی یوں مشہور ہے کہ وہ علم موسیقی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ اور ایسا خوش آواز تھا کہ جب گانے بیٹھتا تو چرند پرند اس کی آواز سے مست ہو کر اس کے گرد آن بیٹھتے تھے۔ اور اس کہانی کے موافق اسی ملک کے رہنے والے رفیل نامی ایک مصوّر نے جو اس فن میں بے مثل تھا۔ اپنے خیال سے ارفیوس کے گانے کا ایک مرقع کھینچا تھا یہ مصوّر ۱۵۲۰ء میں مرا۔ مگر اس کا یہ مرقع اور فرنگستانی ملکوں میں بہت مروج اور نہایت مشہور ہے اور اب تک اس کی نقلیں موجود ہیں فلسفۂ تخیلی پر نظر کرتے ہوئے (وقائع ڈپٹی نذیر احمد)

نوٹ نمبر ۸ ۔ **علامہ شبلی** ۔ شبلی نام، نعمانی خود کو امام ابوحنیفہؒ کی جانب منسوب کر کے لکھتے تھے۔ شمس العلماء خطاب تھا۔ موصوف ۱۸۵۷ء میں بندول نامی گاؤں میں جو ضلع اعظم گڈھ میں ہے پیدا ہوئے۔ غازی پور اور سہارنپور وغیرہ میں علوم رسمیہ عربی و فارسی کی تعلیم پائی حج کو گئے۔ واپس آکر وکالت کی۔ یہ پیشہ طبیعت کے خلاف تھا لہذا چھوڑ کر ملازمت کی اور امین ہو گئے۔ اس کو بھی خیرباد کہا۔ اور ۱۸۸۲ء میں علی گڈھ کالج کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ٹرکی، مصر اور شام کا سفر کیا۔ واپسی سفر پر گورنمنٹ نے شمس العلما کا خطاب دیا۔ ۱۶ سالہ ملازمت کالج کے بعد کالج چھوڑ کر خانہ نشین ہو گئے۔ چند روز کے بعد حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون کے عہدے پر مامور ہوئے اور ۴ برس تک وہاں رہنے کے بعد استعفاء دیا اور عرصہ تک لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۸۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ حیدرآباد سے جو منصب مقرر ہوا تھا آخری وقت تک پاتے رہے۔ مولانا شبلی فارسی و اردو نظم و نثر پر قادر تھے ان کی سب سے بڑی شہرت کا باعث ان کی اردو کتب منثور ہیں آپ کو تاریخی تحقیقات کا بہت ذوق تھا اور عہد حاضرہ کے ترقی یافتہ طرز سیرۃ نگاری کے بانی اور ان مصنفین میں سے تھے جنہوں نے اردو طبقہ کو فن تنقید سے روشناس کرایا اور اردو میں داد تنقید دی آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں:۔

سیرۃ نبوی ۔ شعر العجم ۔ موازنہ انیس و دبیر ۔ الفاروق ۔ المامون ۔ الغزالی ۔ سوانح مولانا روم ۔ سفرنامہ شام و روم ۔ آپ کا طرز تحریر سلیس پر زور اور دلفریب ہے (ماخوذ از سیر المصنفین و گلدستہ ادب)

نذر کر دیا۔ اور اس وقت سے کوہ نور تاج برطانیہ کے جواہرات کی فہرست میں شامل ہو گیا ۱۸۵۱ء میں یہ لندن کی عظیم الشان نمائش میں رکھا گیا۔ اور ۱۸۵۲ء میں امسٹرڈم کے مشہور جواہر تراش میسرز کاسٹر اینڈ کو کے یہاں مکرر ترشوایا گیا۔ جہاں اس کمپنی کے مشہور و معروف نگینہ تراش سنگر نامی نے اس کو ۳۸ دن ۱۲ گھنٹہ میں مختلف پہلوؤں سے تراشکر بیضاوی شکل میں منتقل کر دیا۔ اور اس کا وزن ۱۸۶ قیراط سے ۱۰۶ قیراط رہ گیا۔ اس مرتبہ تراشنے کے بعد اس میں اگلی سی تاب و تابش نہ رہی۔ اس نئے سر ڈیوڈ بریوسٹر اور پروفیسر میتھانٹ نامی ماہرین علوم کیمیا نے اس کی چمک دمک میں اضافہ کرنے کے متعلق بہت ہی دلچسپ تجربے کئے۔ حضور قیصرۂ مرحومہ نے اس ہیرے کو اپنی بہو یعنی ہمارے ملک معظم کی مرحومہ والدہ ماجدہ عُلیا حضرت کوئن الگزینڈرا کو بطور تحفہ مرحمت فرما دیا تھا۔

بڑی جنتری کے مرتب کے بیان کے موافق یہ ہیرا ملکہ شہنشاہ انگلستان کے تاج میں نصب ہے۔ اور شاہجہان کے زمانہ میں اس کی قیمت ۸۷ لاکھ پندرہ ہزار پانسو پچیس روپیہ آنکی گئی تھی +

اس ہیرے کا ایک نمونہ (Model) ٹاور آف لنڈن اور ایک نمونہ عجائب خانۂ لاہور کی آرٹ گیلری میں رکھا ہوا ہے۔ یہ مختلف فرمانرواؤں کے پاس گردش کرنے اور تاریخی ہیرا ہونے کے باعث دنیا بھر کے ہیروں پر سبقت لے گیا ہے۔ اکثر لوگ اس کی نحوست کے قائل ہیں۔ چنانچہ لیڈی برٹن کا مقولہ ہے " یہ نہایت بدشگون ہیرا ہے جس کے پاس رہا تباہی لایا"۔ مگر یہ خیال ہی خیال ہے۔ (ماخوذ از مضمون خود "الماس" ایجوکیشنل گزٹ فروری ۱۹۲۵ء۔ "ہمدم" اخبار لکھنؤ ۴ ستمبر ۱۹۲۶ء۔ بڑی جنتری ۱۸۹۴ء)

نوٹ نمبر ۵ ۔ ماخوذ از مضمون خود "الماس" جو جنوری فروری نمبر بابتہ سال ۱۹۲۵ء میں "ایجوکیشنل گزٹ" لکھنؤ میں شائع ہوا = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۶ ۔ سر سید ۔ سید احمد خان نام، جواد الدولہ عارف جنگ کا خطاب بہادر شاہ دہلی کے حضور سے اور سر کے ۔ سی ۔ ایس ۔ آئی کا خطاب برٹش گورنمنٹ سے اور ایل ۔ ایل ۔ ڈی کی ڈگری ایڈنبرا یونیورسٹی سے ملی تھی۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہادر شاہ آخری بادشاہ دہلی کی ملازمت میں آ گئے۔ کیونکہ ان کے آباؤ اجداد وابستہ دامن دولت مغلیہ تھے۔ مگر از راہ دور اندیشی کچھ ہی دن کے بعد انگریزی سرکاری نوکری کر لی اور سب ججی کے عہدے تک پہنچے۔ ارکان خمسہ اردو میں شمار ہوتے ہیں۔ علیگڈھ کالج کے بانی اور بہت بڑے مصنف تھے۔ فن تاریخ سے علی الخصوص ان کو مذاق خاص تھا۔ آئین اکبری کی تصحیح کی۔ تزک جہانگیری طبع کرائی۔ تاریخ بجنور، رسالہ اسباب بغاوت ہند۔ تاریخ سرکشی بجنور، خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن اور آثار الصنادید ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ آثار الصنادید کو انھوں نے ۱۸۴۷ء میں تصنیف کیا۔ جو عمارات و

ہندوستانِ قدیم میں آلاتِ پرواز

اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں ہندوستان میں "آلات پرواز" ایجاد ہو چکے تھے۔ اور اگر ایسا نہ تھا تو یہ ضرور تھا۔ کہ قدیم اہل ہند کے خیالات اس قسم کی صنعت گری کی طرف ترکتاز اور پرواز ضرور کر رہے تھے۔ ورنہ یہاں کی دیو مالا (مائی تھالوجی) میں یہ خیال ظاہر نہ کیا جاتا +

ایک نقل

نقل کہتے ہیں کہ "جس وقت بادشاہ تختِ طاؤس پر جلوس کرتا تھا تو یہ مور دم پھیلا کر ناچنے لگتے۔ تسبیح ان کی منقاروں میں گردش کرنے لگتی۔ اور "اللہ اللہ" کی صدائیں چونچوں سے برآمد ہوتیں۔ اور ہر صدا پر ایک دانہ ہٹتا جاتا تھا"۔ لیکن یہ نقل ہی نقل ہے اصل کو اس میں ذرہ بھر دخل نہیں۔ کہ ع

بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے[۱]

نوٹ نمبر ۱۔ بڑی جنتری بابتہ ۱۹۴۰ء و تاریخ ہند قسط سوم ۱۲ +

سیڑھیاں

تخت پر چڑھنے کے لئے تین طلائی مرصع و مغرق بجواہر زواہر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں[۱]

نوٹ نمبر ۱ "ٹیورنیر" نے درمیانی محراب کے متعلق یہ اور لکھا ہے۔ کہ اس میں ایک بیش قیمت، صاف اور شفاف جواہر آویزاں کیا گیا ہے۔ کہ جب بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے تو وہ اس کے سامنے رہتا ہے۔ اس کا وزن ۶۰ گرین کا ہے۔ اور اس کے گرداگرد لعل و نیلم وغیرہ جڑے ہوئے ہیں +

نوٹ نمبر ۹ - سرکار - سر، جادو ناتھ سرکار ایم - اے (ڈاکٹر) ہندوستان کے مشہور محقق مورخ - ان کی تاریخیں چونکہ انہوں نے اہل دربار کی تحریروں سے بہت کچھ اخذ کرکے لکھا - زیادہ مقبول ہوئیں "گریٹ مغل" (تاریخ اکبراعظم) اور "اورنگ زیب" یہ دونوں تاریخیں انگریزی زبان میں ہیں - اور اچھی تاریخوں میں شمار ہوتی ہیں - ولیم اروِن کی "لیٹر مغل" کو اس کی وفات کے بعد انہیں نے شائع کیا - پہلے ہندو یونیورسٹی کالج کے ہسٹری پروفیسر تھے - اب ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے رکن ہیں -

نوٹ نمبر ۱۰ - ۱۱ - اورنگ زیب مصنفہ ڈاکٹر جادو ناتھ سرکار +

نوٹ نمبر ۱۲ - وقائع سیاحت برنیر = ۱۲ +

وجہ تسمیہ تختِ طاؤس

نام اور وضع کا خیال ہندو قصص الاصنام سے لیا گیا

ان طواویس ہی کی وجہ سے یہ تخت تختِ طاؤس کے نام سے موسوم ہوا تھا[۱] - میرے خیال میں اِس تخت اور اِس نام کا خیال اہل ہنود کی اُن قدیم روایات سے اخذ کیا گیا ہے - جو بتلاتی ہیں کہ اسی نام کا ایک تخت ہندوستان کے عہد ماضی بعید میں بھی تھا - چنانچہ جین مت کی کتابوں میں یہ روایت موجود ہے - کہ ایک راجہ معہ اپنی رانی کے اس سبب سے کہ اس کے دیوان نے اس سے غدر و بیوفائی کی تھی - کیکئی ینتر (केकयी यन्त्र) نامی تخت پر بیٹھ کر بھاگا، فضا میں پہنچکر کسی خرابی کے باعث وہ تخت بگڑ گیا - اور وہ دونوں ایک مرگھٹ پر گر کر مر گئے - لفظ کیکئی ینتر (केकयी यन्त्र) "سریر طاؤس" یا "تختِ طاؤس" کے ہم معنی ہے +

نوٹ نمبر ۱ - ٹوانیٹی اینتھ سینچری وبسٹر ڈکشنری اور انسائکلو پیڈیا برٹانکا = ۱۲ +

مسٹر ای مارسڈن بی۔اے نے اپنی تاریخ ہند میں لکھا ہے "ساڑھے چھ کروڑ (۶۵٬۰۰۰٬۰۰۰) روپیہ اس پر خرچ ہوا تھا" چونکہ صاحب موصوف کی درسی کتابوں میں اکثر امور کی بنا ضعیف روایات پر ہے۔اس لئے میں اُن کی تحریر پر توجہ نہیں کرنا چاہتا۔

مشہور فرانسیسی سیاح و جوہری ٹیورنیر نے جو اس تخت کی غائبانہ تعریف و توصیف سن کر اسکی دید کا مشتاق ہو کر ہندوستان تک پہنچا تھا۔اس کی قیمت کا اندازہ ساٹھ لاکھ (۶۰۰۰۰۰۰) پونڈ (عہد حاضرہ کے نرخ کے مطابق نو کروڑ روپیہ) کیا تھا۔

ہم ٹیورنیر کے تخمینے سے اس بنا پر متفق ہیں کہ جمہور مورخینِ متاخرین جزوی اختلاف کے ساتھ اس کی رائے سے بالکلیہ اتفاق کرتے چلے آئے ہیں اور بغیر کسی قوی دلیل کے جمہور سے اختلاف کرنا ممدوح نظر نہیں آتا۔علاوہ ازیں ایک اور وجہ بھی قول مذکورہ کی تائید کرتی ہے۔اور وہ یہ کہ عہد حاضرہ میں تاریخ نویسی کا جو طرز اختیار کیا گیا ہے یہ ہے کہ پہلے ہر امر کی کافی تحقیق و تفتیش کر لی جائے۔بعد ازاں اس کا اندراج تاریخ میں کیا جائے۔جس کی دلیل تواریخ متقدمین کے بہت سے مندرجہ واقعات کا زمانۂ موجودہ کی تاریخوں میں نہ پایا جانا ہے۔پس یقین واثق ہے کہ مورخین دورِ موجودہ نے اس امر خاص میں بھی اپنے زمانہ کے طرز کو نظر انداز نہ کیا ہوگا۔

عہد حاضرہ کے بعض مورخین نے جو اس تخت کے مصارف کا اندازہ سات کروڑ ساٹھ لاکھ (۷۶۰۰۰۰۰۰) یا آٹھ کروڑ (۸۰۰۰۰۰۰۰) روپیہ کیا ہے۔اس کا ماخذ بھی ٹیورنیر کا تخمینہ معلوم ہوتا ہے۔اور بظاہر وجہ اختلاف پونڈ کی قیمت کا وقتی تغیر۔ایک اور تازہ شہادت ہماری رائے کی تائید مزید کرتی ہے۔اور وہ اخبار "فیلڈ" میں ایک سیاح کا شائع شدہ بیان ہے۔جس نے حال ہی میں دورانِ سیاحتِ طہران سفیر دولت برطانیہ کے توسط سے شاہ پہلوی شہنشاہ ایران کے محلات کے سیر کی عزت حاصل کی ہے۔وہ اس تخت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

مصارف

تخت طاؤس کے مصارف کے متعلق بھی مورخین میں بات کچھ اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک علاوہ مشہور و معروف جواہرات کے ایک کروڑ روپیہ اس پر صرف ہوا تھا۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ کسی معتبر تاریخ میں ایسا دیکھنے میں نہیں آیا +

جمہور مورخین قدیم اور ان سے مستنبط کرنے والے مورخین ماضی و حال مجموعی طور پر متفق ہیں کہ حسب حساب مندرجہ صفحہ ۷۹) وہ تمام جواہرات سمیت ایک کروڑ روپیہ میں تیار ہوا تھا +

رسالہ پیمانہ "آگرہ" بابتہ ستمبر ۱۹۲۹ء میں ہشام صاحب میرٹھی کا ایک مضمون بہ عنوان "تخت طاؤس" نکلا تھا جس میں ایک کروڑ گیارہ لاکھ روپیہ تخمینہ مصارف تھا۔ مگر وہ مضمون ساقط الاعتبار ہے۔ اس لئے میرے نزدیک یہ تخمینہ بھی قابل اعتبار نہیں +

مسٹر لین پول اس کا تخمینہ مصارف دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں "برنیر اور ٹیورنیر اس کی قیمت اور زائد بتلاتے ہیں"

برنیر نے اپنے وقائع سیاحت کی دوسری جلد میں لکھا ہے "چنانچہ اس (شاہجہان) کا ایک تخت ہی (اگر میری یاد میں کچھ غلطی نہ ہو تو) تین کروڑ روپے کی لاگت کا ہے"۔

مسٹر بال نے زمانہ قدیم کے سکوں کی قیمتوں کو مروجۂ حال سکہ جات کی قیمتوں سے مقابلہ کر کے جو اس کی لاگت کا اندازہ کیا ہے، وہ ایک کروڑ پچاس لاکھ سینتیس ہزار پانسو (۵۰۰، ۳۷، ۵۰، ۱) پونڈ ہے جو پونڈ کے بین الملی نرخ حاضرہ کے موافق بائیس کروڑ، پچیس لاکھ، باسٹھ ہزار، پانسو روپیہ) ہے +

تختِ طاؤس

صلد طلائی تھا یا اس پر سونے کا پتر منڈھا ہوا تھا؟

بعض مغربی مورخین اور سیاحوں نے کہیں شک اور کہیں یقین کے ساتھ تختِ طاؤس کے کل یا جزو کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ صلد طلائی نہ تھا۔ بلکہ اس پر سونے کا پتّر منڈھا ہوا تھا۔ چنانچہ مسٹر لین پول نے سوانح اورنگ زیب کے حواشی میں ٹیورنیر کا یہ قول نقل کیا ہے:۔

"تخت پر سونے کا پتّر جڑا تھا"

اور لارڈ کرزن آنجہانی نے اپنی کتاب پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن میں اسی سیّاح کا یہ بیان لکھا ہے:۔

"اوپر بنا ہوا مور جو تمام پکھراج کا بنا ہوا ہے دُم پھیلائے ہوئے ہے۔ اس کا جسم سونے کے پتّر کا ہے" +

برنیر اپنے وقائع سیاحت میں رقمطراز ہے:۔

"یہ تخت چھ طلائی پایوں کا ہے۔ جن کو کہتے ہیں کہ بالکل ٹھوس ہیں" +

مسٹر ولیم ارون نے لیٹر مغل میں تحریر کیا ہے:۔

"تختِ طاؤس سونے کے پتروں سے بنا ہوا تھا" +

لیکن مورخین قدیم اور درباری تاریخ نگاروں کی تحریریں اس امر پر تبصرہ کرنے سے قطعی مجبور ہیں۔ مگر جب ہم اس کے طول عرض، بلندی اور سونے کی مقدار پر نظر ڈالتے ہیں تو چونکہ سونے کی تھوڑی ہی سی مقدار وزنی و سنگین ہوتی ہے اور اس تخت میں صرف ۳۱ ۱/۴ من سونا استعمال ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ تو ہمیں اہلِ مغرب کی تحقیق صحیح معلوم ہوتی

"اس کی قیمت کا اندازہ ستر لاکھ پونڈ کیا گیا تھا" +

۷۰۰۰۰۰۰ ستر لاکھ پونڈ۔ دس کروڑ پچاس ہزار روپیہ کے مساوی ہوتے ہیں اور یہ رقم کپتان ٹیورنیر اور مورخین مابعد کے تخمینوں کے لگ بھگ ہے +

نوٹ نمبرا - سوانح اورنگ زیب - مصنفہ مسٹر لین پول - مترجمہ مسٹر لطیف احمد صاحب بی - اے +

نوٹ نمبر۲ - سفرنامہ برنیر - مترجمہ اے کانسٹیبل صاحب صفحہ ۲۷۴ - فٹ نوٹ نمبرا = ۱۲ +

نوٹ نمبر۳ - تاریخ ہند مصنفہ ای مارسڈن بی - اے - مترجمہ لالہ جیا رام و خلیفہ عمادالدین صاحبان - داستان ترکتازانِ ہند = ۱۲ +

نوٹ نمبر۴ - مڈیول انڈیا مصنفہ لین پول = ۱۲ +

نوٹ نمبر۵ - تاریخ ہند "قسط سوم" شائع شدہ بڑی جنتری ۱۸۹۴ء اور رسالہ "پیمانہ" آگرہ سمبر ۱۹۲۵ء = ۱۲ +

نوٹ نمبر۶ - **شاہ پہلوی** - رضا خان نام ایک ایرانی معمر و مدبر جنرل ہیں۔ جن کو اواخر ۱۹۲۵ء میں ایرانی پارلیمنٹ نے خاندان قاچاریہ کے آخری حکمرانِ ایران احمد شاہ کجکلاہ کے اعلان معزولی کے بعد عنانِ حکومتِ ایران تفویض کی اور موصوف ۱۴ - دسمبر ۱۹۲۵ء کو اندرونی کشمکش کے دفعیہ کے بعد مستقل شہنشاہ ایران تسلیم کر لئے گئے - ممدوح چونکہ خاندان پہلوی کے رکن اور ایرانی قدیم حکمرانوں کی نسل سے ہیں - اس لئے آپ نے جلوس کے وقت اس نام کا اعلان کیا۔ اب تخت ایران نسلاً بعد نسلٍ پہلوی خاندان کا ورثہ صحیح تسلیم کیا جاتا ہے - یہ ایک ہر دلعزیز، بیدار مغز، روشن خیال اور موجودہ طرز حکمرانی کے ماہر بادشاہ ہیں - سلطنت ایران آپ کے زیر سایہ تیزی کے ساتھ شاہراہ ترقی پہ گامزن ہے

نوٹ نمبر۷ - "آگرہ اخبار" آگرہ مورخہ ، نومبر ۱۹۲۸ء = ۱۲ +

۱۷۰۷ء سے ۱۸۰۳ء تک ایک تاریخ لکھنا چاہتا ہوں ۱۷۳۸ء تک مسودہ کر چکا ہوں ۱۷۵۹ء
تک میں نے ذخیرہ جمع کر لیا ہے'' اس کتاب کا نام اس نے لیٹر مغل (مغلان آخر)
رکھا تھا۔ چونکہ وہ ہر ہر بات کو بے انتہا تحقیقات کرنے کے بعد لکھتا تھا۔ اس لئے
اس کتاب کی تصنیف کا کام بہت آہستگی کے ساتھ ہوا۔ لیٹر مغل کا تھوڑا تھوڑا حصہ
ایشیاٹک کوارٹرلی ریویو اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں شائع ہوتا رہا۔ یہ نامور محقق
بجائے سو سال کے صرف ۳۲ ہی سال کی تاریخ لکھ پایا تھا۔ کہ اس کا جام زندگی لبریز
ہوگیا۔ اور اس نے جمعہ کے دن ۳۔ نومبر ۱۹۱۱ء کو ودیعت حیات مالک حقیقی کے
سپرد کر دی۔ انتقال کے وقت اس کی عمر ۷۱ سال ۴ ماہ کے قریب تھی۔ جس طرح گارڈنر
کو اپنی تاریخ کے ختم نہ ہونے کا مرتے دم بہت صدمہ تھا۔ ویسا ہی اسے اتنا فرق
ہے کہ اس کو ایک لائق اور معتمد علیہ شاگرد میسر تھا اور یہ اس نعمت سے بھی محروم تھا
لیٹر مغل کو مسٹر سرکار نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ جس سے یقیناً اس کی روح بابو صاحب
موصوف کی ممنون ہوئی ہوگی۔ اس نے جو یہ چاہا تھا کہ اس کی تاریخ قاموس التاریخ (ہسٹوریکل
انسائیکلوپیڈیا) ہو۔ وہ نہ ہوسکا۔ اور اس کے لئے کافی زمانہ کی ضرورت تھی +

ولیم ارون انگریزی، فرانسیسی اور جرمنی زبان کا ماہر تھا۔ اسے فارسی میں بھی کافی
ملکہ تھا۔ فارسی زبان کو بخوبی سمجھ لیتا اور فارسی کی قلمی کتابوں کو بخوبی پڑھ سکتا تھا۔ ہندی اور
اردو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ہندوستان کی موجودگی ہی میں فارسی کی مطبوعہ و قلمی
کتابوں کے علاوہ اردو ہندی کی کتابیں بھی جمع کر کے کافی ذخیرہ بہم پہنچا لیا تھا۔ وہ نہ صرف
محقق بلکہ شیدائے تحقیقات تھا۔ اس کو جب کسی امر کی تحقیق مطلوب ہوتی یا وہ کوئی حوالہ
دینا چاہتا۔ تو یورپ، ایشیا اور امریکہ غرض ہر جگہ چھان بین کرتا تھا۔ اس کا طرز بیان سلیس،
دلاویز منطقی اور قطعی نقطہ مقصود پر ہوتا تھا۔ اس کی تاریخ نویسی کے نمایاں اور مستحسن
طریقوں میں یہ امور خصوصیت کے ساتھ قابل تذکرہ ہیں کہ اس نے ہمعصر اسناد سے صحیح
تحقیق و استنباط کیا ہے۔ ہر چیز حوالہ جات کے ساتھ لکھی ہے۔ اس نے اس زمانہ
کی فارسی تاریخوں، انگریزی، ڈچ اور پرتگالی سیاحوں کے سفرناموں خطوط اور یادداشتوں
اور عام تصنیفات، تالیفات اور فرامین سے اخذ کر کے اپنی کتاب ترتیب دی
ہے۔ وہ قدرتی طور پر اور تعلیم کی وجہ سے اور شواہد پر تبصرہ کناں فیصلہ کرنے کا ایک
خاص مادہ رکھتا تھا۔ اس کی تحقیق و تحریر میں وہ صحت و جامعیت ہے۔ کہ المانیین
(باشندگان جرمن) کو بھی میسر نہ آئی۔ اس کی تاریخ نویسی۔ اعلیٰ تاریخ نویسی کی مثال اور
قابل تقلید ہے۔ مسٹر سرکار اس کے متعلق دیباچہ لیٹر مغل میں لکھتے ہیں'' ہندوستان
کے مورخین اور طلاب تاریخ کو لیٹر مغل کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ ان کو تاریخ
نویسی کا طریقہ سکھلائے اور نظام دماغی کی تعلیم دے۔ مورخین کو چاہیئے کہ وہ لیٹر مغل

ہے۔ اور اوپر بیان کئے ہوئے مختلف اقوال کو مسلسل کرنے سے مندرجہ ذیل ترتیب ہمارے ذہن نشین ہو جاتی ہے:-

مورمجوف اور پائے ٹھوس تھے۔ بقیہ اور سارے تخت پر دبیز پنّر چڑھا ہوا تھا

نوٹ نمبرا - ولیم اروِن - اسکاٹ لینڈ کے ایک وکیل کا بیٹا تھا۔ ۵ جولائی ۱۸۴۰ء کو ایبرڈین میں پیدا ہوا۔ بچپن میں لندن پہنچا۔ وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ ۱۵ سال کی عمر میں مدرسہ کو خیرباد کہہ کر دنیاوی عملی زندگی میں قدم رکھا۔ ۱۹ سال کی عمر میں محکمۂ بحری میں ملازم ہوگیا۔ سال دو سال بعد چونکہ اس نے فرانسیسی و جرمنی زبان بخوبی سیکھ لی تھی۔ اس لئے مستعفی ہو کر کنگس کالج لندن میں تکمیل تعلیم کے لئے بھرتی ہوا۔ اور ۱۸۶۸ء کے انڈین سول سروس کے امتحان میں اعلےٰ درجہ پر کامیاب ہوگیا +

۱۱ دسمبر ۱۸۶۲ء میں ہندوستان پہنچ کر سہارنپور میں اسسٹنٹ مجسٹریٹ مقرر ہوا۔ اس کے بعد مظفر نگر تبدیل ہوگیا۔ ۷۳-۱۸۷۲ء میں اس نے دو سال کی رخصت لی اور یورپ کو واپس گیا۔ واپسی پر فرخ آباد کا جنٹ (جوائنٹ) مجسٹریٹ معین ہوا۔ چونکہ تحقیقات تاریخ کا مذاق شروع عمر سے اس کی طبیعت میں موجود تھا۔ اور تعیناتی ہوئی ایک تاریخی مقام پر اس لئے اس نے نوابان بنگش کی نہایت مستند و محققانہ تاریخ لکھ کر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے رسالہ میں ۷۹-۱۸۷۸ء میں شائع کی۔ یہ تاریخ فرخ آباد ڈسٹرکٹ گزیٹیر مرتبہ مسٹر ایٹ کن سن شائع شدہ ۱۸۸۱ء میں شامل کر لی گئی +

اروِن دوران ملازمت غازیپور میں زیادہ رہا۔ غازی پور میں وہ کلکٹر اور حاکم بندوبست تھا۔ یہاں کی تعیناتی کی یادگار اس نے ضلع غازی پور کے بندوبست کی رپورٹ چھوڑی ہے۔ جو ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی +

اسے اپنی علمی قابلیت اور اہلیت کی بنا پر ایک خاص مرتبے تک پہنچنا چاہئے تھا چونکہ خلاف اُمید ایسا نہ ہوا۔ اس لئے جوں ہی مدت ملازمت پنشن کے استحقاق تک پہنچی اس نے پنشن لے لی۔ ۲۷ مارچ ۱۸۸۹ء کو وہ سہارنپور واپس ہو کر پنشن پاگیا۔ گویا آغاز و انجام ملازمت سہارنپور میں ہوا۔ اس نے ۲۵ سال ملازمت کی۔ جس میں سے پانچ سال رخصت پر رہا۔ پنشن کے وقت اس کی عمر ۴۸ سال اور تندرستی بہت اچھی تھی۔ پنشن لینے کے بعد وہ انگلینڈ پہنچا۔ جہاں مدۃ العمر ادبی خدمات انجام دیتا رہا۔ وہ ۱۷۰۷ء سے ۱۸۰۳ء تک کی تاریخ ہندوستان زمانہ اورنگ زیب سے لکھنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے فروری ۱۹۰۱ء میں جادو ناتھ صاحب سرکار کو ایک خط میں لکھا تھا۔ میں

تخت طاؤس کی شکست پذیری

تخت طاؤس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "وہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ اس کے اجزاء الگ الگ تہہ کرکے رکھ لئے جاتے تھے۔ اور ضرورت کے وقت سب کو مرتب کرکے تخت بنا لیا جاتا تھا۔" گو اس کا کافی ثبوت تواریخ قدیم سے قطعی نہیں ملتا۔ تاہم بعید از قیاس بھی نہیں۔ بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ ایک بیش قیمت، بے بہا، نادر العصر اور اعجوبۂ روزگار چیز تھا۔ جہاں اس میں پائیداری و مضبوطی موجود تھی۔ وہاں نزاکت کا وجود بھی پایا جاتا ہو گا۔ نکالنے رکھنے کی سہولت اور گرد و غبار سے حفاظت میں آسانی وغیرہ وغیرہ پر نظر ڈال کر عجب نہیں کہ ایسا ہی بنایا گیا ہو +

ہمیں اس سے بحث نہیں، اس کی قیمت کچھ ہی ہو، وہ اس طرح بنایا گیا ہو، کہ اس کے پرزے پرزے الگ کئے جا سکتے ہوں۔ یا اس طرح کہ اس کے اجزاء کو ایک دوسرے سے جدا کرنا دشوار ہو، اسے ٹھوس سونے سے بنایا گیا ہو۔ یا اس پر سونے کے پتّر چڑھائے گئے ہوں۔ وہ ایک ایسا عجیب و غریب تخت ضرور تھا کہ جس کی نظیر آج تک دنیا کو میسّر نہیں آئی۔ اس سے پہلے بھی کوئی تخت اس کے مثل یا اس سے بہتر صفحۂ تاریخ پر نظر نہیں آیا اور فی زمانہ بھی کہ روپے کی بہتات، جواہرات کی کثرت اور صنعت و حرفت کو انتہائی ترقی حاصل ہے۔ بڑے بڑے اولوالعزم سلاطین سریرِ حکومت پر جلوہ افروز ہیں۔ لیکن دنیا اس کی تمثیل پیش نہ کر سکی۔ وہ اپنی بے مثالی کی وجہ سے دیکھنے والوں کو محوِ حیرت بنا دیتا تھا۔ ایشیا و یورپ کے سیّاح و سفراء بڑے بڑے راجے مہاراجے اور فرمانروا، بڑے بڑے ماہرین صنعت و حرفت اسے دیکھ کر بیخود ہو جاتے اور تصویرِ حیرت بنجاتے

کو اپنا نمونہ بنائیں - اور اسی طرح پر لکھیں"۔ اردون کے متعلق اس نامور مورخ نے یہ بھی لکھا ہے - کہ " اس کو لوگ ہندوستان کا گبن ماننے کے لئے تیار نہیں - کیونکہ اس نے واقعات لکھے ہیں - اور تاریخ نامکمل ہے - لیکن ان کو ماننا چاہیئے" +

اردون کو مالی معاملات میں عبور کامل تھا - اس کی دلیل ایک تو وہ مضمون ہے - جو اس نے کلکتہ ریویو میں ۱۸۶۹ء میں شائع کرایا اور دوسری اس کی تصنیف کردہ شہرہ کتاب موسومہ رینڈ ڈائی جس یا لاآف پرز یجبر +

وہ ایک بذلہ گو، لطیفہ سنج، ظریف الطبع، نرم گفتار، عالی حوصلہ اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی سے پیش آنے والا آدمی تھا اور ہمیشہ ہشاش بشاش رہا کرتا تھا +

میرے نانا مولوی عبدالرحمن صاحب مرحوم سر دفتر محکمۂ اسٹامپ ریاست بھوپال ریاست بھوپال کی ملازمت سے پہلے محکمہ بندوبست دولت برطانیہ میں اکثر جگہ ملازم رہے تھے - اسی سلسلہ میں مرحوم کو صاحب موصوف کے ماتحت غازی پور میں مہتمم عکس یا منصرم جانچ کے عہدے پر کچھ عرصے تک رہنے کا اتفاق ہوا تھا - وہ فرمایا کرتے تھے - "کہ صاحب موصوف ایک بہت ہی سنجیدہ، متین اور فارسی میں بصیرت کامل رکھنے والے انگریز تھے - ان کی متانت نے انہیں خشک مزاج نہیں بنایا تھا - وہ اپنے ماتحتوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے - جو لوگ ہندوستان کے قدیم اور شریف گھرانوں کے رکن ہوتے تھے - نسبتاً ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرتے تھے اور بدل ان کی ترقی مناصب و علوے مدارج کے خواہشمند رہتے تھے - اپنے مفوضہ سرکاری کاروبار کو تندہی سے انجام دیتے اور جو وقت بچتا اس کو مطالعہ تاریخ میں صرف کیا کرتے تھے - وہ خود جامع علوم و فنون تھے - اور ایسے ہی لوگوں کو بہت پسند کرتے تھے - فرمایا کرتے تھے "انسان اور خصوصاً مورخ کو ہر چیز جاننا چاہیئے - جس چیز کو انسان حاصل کر سکے اس سے اسے گریز نہ کرنا چاہیئے"۔ ان کی زندگی ایک طالب علمانہ زندگی تھی" +

لیٹر مغل جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں ایک بے نظیر تاریخ ہے - لیکن ساتھ ہی اس کے یہ امر بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ حسب بیان بالا اس کا ماخذ باشندگان یورپ کے خطوط، سفرنامے اور کتابیں ہی ہیں اور گو بہت کچھ مصنف نے تحقیق و تدقیق کے بعد لکھا ہے - مگر پھر بھی اپنی ہم قوموں، ہم جنسوں اور ہم ملکوں کے ساتھ اس خوش عقیدگی سے کہ ان کا لکھا آیت و حدیث ہے - بعض بعض جگہ اسکو مغالطہ دے ہی دیا ہے - اور یہ تقاضائے بشریت ہے + = ۱۲ +

میں نہیں کہہ سکتا کہ شاہجہان کو اس کے کارناموں کے معاملہ میں خوش قسمت کہا جائے یا بدقسمت، چیزیں اس نے وہ بنوائیں کہ جن کی حقیقت کا اظہار رہتی دنیا تک ایک افسانہ رہے گا۔ مگر زمانہ نے کچھ اس طرح سے پلٹا کھایا کہ اسکی اکثر یادگاریں اور انکی عظمتیں حادثات زمانہ کے ہاتھوں قائم نہ رہ سکیں، رہے نام اللہ کا ایک جامع مسجد ہے اور ایک تاج محل جن سے اس کی بلند حوصلگی کا اندازہ ہوسکتا ہے اور بس اگر اس کی تمام یادگاریں باقی رہ جاتیں تو نہیں دیکھ دیکھ کر دنیا ہمشنہ محو حیرت رہا کرتی۔ یہ بھی بسا غنیمت ہے کہ ان چیزوں کی یادگار کسی نہ کسی طرح قائم رکھنے والے اس وقت موجود تھے۔ جنھوں نے ان کو قطعی محو نہ ہونے دیا "تخت طاؤس" ہی کو لے لیجئے گو اس کے ظاہری وجود کی طرح آج اس کی شبیہ بھی معدوم ہے۔ مگر لفظی تصویر مولانا قدسیؒ کی سحر نگاریوں کی مرہون منت ایک مثنوی کی شکل میں ہمارے پیش نظر ہے۔ جس کی حقیقی قدر کچھ اسی نے کی جو جان قدر دانی تھا یعنی جوہر شناس اور نکتہ نواز بادشاہ کے حکم سے موصوف کی اس مثنوی کا کتبہ مینائے سبز سے تخت کے اندرونی حصے میں منقش کیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے زیادہ اس مثنوی کی قدر و منزلت ہو بھی نہیں سکتی تھی وہ مثنوی ذیل میں درج ہے۔ اس کے آخری مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے :۔

زہے فرخندہ تخت بادشاہی — کہ شد ساماں بتائید الٰہی

فلک روزے کہ میکردش مکمل — زرِ خورشید راگداخت اوّل

بحکم کارفرما صرف شد پاک — بہ میناکاریش مینائے افلاک

خبر ایں تخت از زر و جوہر چہ مقصود — وجود بجر و کاں راحکمت ایں بود

زیا قوتش کہ درفید بہانیست — لب لعل بتاں رادل بجانیست

برائے پایہ اش عمرے کشیدہ — گہر افسر بسر خانم بدیدہ

تھے۔ اس پر جلوس کرنے والے کا رُعب و دبدبہ، اس کی عظمت و شان دیکھنے والے کی نظر میں اس طرح جمتی اور اس کے قلب میں اس طرح سماتی تھی۔ کہ دل بے اختیار مائل بہ عبودیت ہو جاتا تھا۔ اور یہ بھی برکاتِ اسلام کا ایک معجزہ سمجھنا چاہئے کہ ایسی سطوت و ہیبت پیدا ہونے کے بعد بھی شاہجہان نے اپنی عبودیت کے اظہار میں سرنیاز اس بے نیاز معبود حقیقی کے سامنے خم کیا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ✢

گو اب بایں حیثیت مجموعی اس تخت کا صرف لفظی افسانہ باقی رہ گیا ہے۔ تاہم اس کی خوبی و صناعی کی تعریف و توصیف میں سارا عالم اب تک رطب اللسان ہے ✢

لوٹ نمبرا۔ لیٹر مغل۔ ۱۲ ✢

سال و مدّتِ اتمام

اور

کاریگروں کی تعداد مولانا قدسی کی ایک بےمثل مثنوی وتاریخ اور اس مثنوی کے متعلق شاہی قدردانی

تخت طاؤس پانچ لاکھ (۵۰۰۰۰۰) کاریگروں کے زیر نظام و صنعت سات سال کی مدت میں ۱۰۴۴ھ میں تمام و کمال بن کر تیار ہوا۔ تاریخ ہوئی۔ ع

سریر ہمایونِ صاحبقرانی

۱۰   ھ   ۴۴

قدسی نے عالم قدس کی جانب پرواز کی۔ ابوطالب کلیم نے تاریخ وفات کہی ؏
دو رزاں بلبل قدسی چمنم زنداں شد

"اورنٹیل بیاگرفیکل ڈکشنری" میں لکھا ہے۔ کہ شاہ جہان نے اس کو خطاب ملک الشعراء بھی دیا تھا۔ اور اس کے بعد یہ خطاب ابوطالب کلیم ہمدانی کو عطا ہوا۔ لیکن بادشاہنامہ خزانۂ عامرہ اور ماثر الامراء وغیرہ سے ایسا ثابت نہیں کہ قدسی کو بھی یہ خطاب ملا ہو۔ اور ان کے مقابلہ میں لغات مذکور کا اعتبار ظاہر۔

قدسی کی مثنوی وقصیدہ گوئی معراج بلاغت کو پہنچ گئی تھی۔ غزل اس رتبہ کی نہیں۔ اکثر قصائد اقتضاب کے عیب سے پُر ہیں جو گراں گذرتا ہے بقول اورنٹیل بیل اس نے ایک کتاب فن انشا میں بنام ظفرنامہ اور بقول صاحب خزانۂ عامرہ ایک مثنوی موسومہ بادشاہنامہ **صاحب قران ثانی** اپنی یادگار چھوڑی۔ اسی کا شعر ہے ؎

شادم کہ بمرگم نشود شاد دل غیر   داند کہ بمرگ از تو مرانیست جدائی

ماخوذ از مضمون بعنوان مولانا قدسی مشہدی از رسالہ صبح صادق جھانسی بابتہ ماہ نومبر دسمبر ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا +

نوٹ نمبر ۵ - بادشاہنامہ = ۱۲ + +

تخت طاؤس پر جلوس اوّل

تخت طاؤس پر جلوس اوّل کے متعلق بھی تھوڑا سا اختلاف ہے۔ **منوچی** کہتا ہے **شاہجہاں** اس تخت پر بیٹھا ہی نہیں۔ بلکہ سب سے پہلے اس پر اورنگ زیب نے جلوس کیا تھا[۲]۔ لیکن تخت مذکور ۷ سنہ جلوس شاہجہانی میں بن کر تیار ہو گیا تھا۔ اور **شاہجہان** تخت بننے کے ۲۳-۲۴ سال بعد تک حکمرانی کر کے ۱۰۶۸ھ میں معزول ہوا تھا۔ تکمیل واتمام تخت اور عزل شاہجہانی کے وسطی زمانہ میں کئی بڑے بڑے جشن ہوئے۔ جن میں سے ۸ سنہ ج کا وہ روزہ جشن[۳] **نوروزی** منعقدہ **قلعۂ آگرہ** ۱۸/۱۰۵۴ھ ج کا جشن بتقریب حصولِ صحتِ نواب، عصمت مآب، تقدس احتجاب علیۃ العالیہ جہاں آرا بیگم المعروف بہ **بیگم صاحب کلاں** (بڑی بیگم صاحب)، اسی سنہ کا جشن **شمسی**[۴] جس کے اخراجات کی متکفل خود **بیگم صاحبہ** موصوفہ تھیں۔ ۲۱/۱۰۵۷ھ ج کا دربار افتتاحی **قلعہ معلیٰ** (دہلی) اور اسی سنہ کا ایک مشہور نہ روزہ

بجز جشن عالم از زرشد چناں پاک — کہ شد از گنج خالی کیسۂ خاک

رساند گر فلک خود را بپالش — دہد خورشید و مہ را رونمایش

سرافرازے کہ سر بر پایہ اش سود — ز گردوں پایۂ بر بخت افزود

خراج بحر و کاں پیرایۂ او — پناہ عرش و کرسی سایۂ او

ز انواعِ جواہر گشتہ الواں — چراغ عالمے ہر دانۂ آں

در اطرافش بود گلہائے مینا — فروزاں چوں چراغِ طورِ سینا

چو می کرد از فرازش کوتہی دست — نگیں خویش جم بر پایہ اش بست

شبِ تار از فروغِ لعل و گوہر — تواند صد فلک را داد اختر

دہد شاہجہاں را بوسہ بر پائے — ازاں شد پایۂ قدرش فلک سائے

کند شاہِ جہاں بخش و جواں بخت — خراجِ عالمے را خرجِ یک تخت

خداوندے کہ عرش و کرسی افراخت — تو از قدرتش تختے چنیں ساخت

اثر باقیست تا کان و مکاں را — بود بر تخت جا شاہِ جہاں را

بود تختے چنیں ہر روز جالیش — خراج ہفت کشور زیر پالیش

چو تاریخش زباں پرسید از دل

بگفت "اورنگِ شاہنشاہِ عادل"

۱۰ ۵ ۴ ۴

نوٹ نمبر ۱۔ "آگرہ اخبار" آگرہ مورخہ ۷۔ نومبر ۱۹۲۹ء بحوالہ اخبار "فیلڈ" = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲۔ سیر، ظفرنامہ، بادشاہنامہ اور مآثر الامراء = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۳۔ بادشاہنامہ و سیر = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۴۔ قدسی۔ محمد جان نام، قدسی تخلص، مشرف بہ حج ہونے کے باعث "حاجی" لقب مشہد کا رہنے والا تھا۔ کتاب "جہاں آرا" میں اس کا نام محمد خان لکھا ہے۔ علی ہذا بعض تذکرہ نویسوں نے اس کا تخلص "قدسی" ظاہر کیا ہے جو بظاہر کتابت کی غلطی ہے۔ ۱۰۴۲ھ میں ہندوستان پہنچکر ملازمان دربار شاہجہانی کے زمرے میں شامل ہوا۔ ۱۰۵۲ھ ۱۶۴۲ء کو وح

میں زر بفت و مخمل کے شامیانے چاندی سونے کے ستونوں پر تانے، پھر زمین پر زریں و رنگین فرش بچھائے گئے اور اسپک[۱] کے نیچے ایک مرصع چبوترہ بنایا گیا۔ اور اس کے چاروں ضلعوں پر ایک کٹہر زریں نصب ہوا اور اس کے عین وسط میں تخت طاؤس رکھا گیا اور تخت کے چھتر ہائے مرصع جنمیں موتیوں کی لڑیاں لگی ہوئی تھیں (۸ - ۸ فٹ طولانی سرتاپا غرق جواہرات چوبوں پر) لگائے گئے۔ اور در و دیوار، سقف و جدار و طاق اور خاص و عام کے احاطوں کے اطراف اور نقارخانہ[۲] کی عمارت اور ہر دروازے کے پیش طاق جن کی تزئین کے متکفل شاہزادے (اور امراء)[۲] تھے ان سب کو ہر دیار کے اقمشۂ نفیسہ، مخمل طلاباف و نقرہ باف اور زربفت ایرانی و دیبائے رومی سے منڈھا اور سب جگہ اس مجلس میں سونے کے مرصع کار ظروف ترتیب سے چنے گئے[۳] +

نوٹ نمبر ۱ ۔ منوچی ۔ ایک پرتگالی سیاح اس کی کتاب "اسٹوریا ڈوگومور" بہت مشہور ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر سرکار نے اپنی معرکتہ الاراء تصنیف "اورنگزیب" میں لکھا ہے :۔
"ایک معمولی کم علم آدمی تھا۔ اس نے بہت سے بے سروپا اور سنی سنائی باتیں لکھی ہیں"

نوٹ نمبر ۲ ۔ منوچی اسٹوریا ڈوموگور جلد دوم صفحہ ۳۴۸ = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۳ ۔ جشن نوروزی ۔ نوروز کے دن کو عام طور پر اہل ایشیا خواہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں عید مانتے ہیں۔ تترکان چنگیز کا کوئی مذہب نہ تھا۔ مگر اس دن مکان سجا کر خوان یغما لگاتے اور سب مل کر لوٹتے تھے اور سال بھر کے لئے مبارک شگون سمجھتے تھے۔ آتش پرستوں اور ہنود کے یہاں یہ دن زیادہ متبرک سمجھا جاتا تھا۔ اکبر نے تالیف قلوب کے لئے اس میں ہندوانہ مراسم اور شامل کر دئے تھے۔ اس دن دیوان عام خوب سجتا زبردست دربار ہوتا تھا۔ اکثر امراء بادشاہ کی دعوت کرتے اور نذریں دیتے تھے بادشاہ سونے کی ترازو میں سونا، چاندی، ابریشم، خوشبویات، لوہا، تانبا، جست، توتیا، گھی، دودھ، چاول اور ست نجے کے ساتھ تلتا اور یہ سب غربا کو تقسیم ہوتا تھا۔ (ماخوذ از دربار اکبری)

جشن جو "بارِ عام" مذکور الصدر کے سلسلہ میں جشن وزن قمری تک ہوتا رہا۔ یہ سب تقریبات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی ہے کہ ایسے ایسے شاندار موقر درباروں اور جشنوں میں شاہجہان جیسے صاحب شکوہ نوادر پسند بادشاہ نے اس اعجوبۂ روزگار مجسمۂ صنعت نوازی کو باوجود تیاری شرفِ جلوس و خلعت قبول نہ بخشا ہو +

منوچی کا بیان ویسا ہے پا ور ہؤا ہے۔ جیسا کہ ٹیورنیر کا یہ خیال کہ "یہ وہ مشہور و معروف تخت ہے۔ جسے تیمور لنگ نے بنوانا شروع کیا تھا اور شاہجہاں نے تکمیل کو پہنچایا" +

جمہور مورخین کی تصدیق کے مطابق جس زمانہ میں یہ تخت بن کر تیار ہؤا ہے شاہجہان کشمیر سے واپس ہو کر لاہور کی طرف مراجعت کر رہا تھا۔ وہ اس سفر سے ۳۰۔ رمضان ۱۰۴۴ھ (۲۔فروری ۱۶۳۴ء) ۸ سنہ جلوس کو آگرہ واپس آیا۔ اور چونکہ نجومیوں نے (اندرون شہر) آگرہ کے داخلہ کی تاریخ یکم شوال ۱۰۴۴ھ مطابق ۲۔فروری ۱۶۳۴ء معین کی تھی۔ اس لئے جشن نوروزی کے رسمی دربار کا جمنا پار منعقد ہونا قرار پایا۔ اور کارپردازانِ سلطنت ایوانِ دولتخانۂ خاص و عام دارالخلافہ (آگرہ) کے زیب و زینت پر مامور ہوئے +

ہم اس آرائش و زیبائش کی کیفیت شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم و مغفور کی قلمِ معجز رقم سے زیب قرطاس کرتے ہیں +

> اوّل انہوں (کارپردازانِ سلطنت) نے اسکی مخمل و زربفت کی کہ گجرات کے صنعت گروں اور ہنروروں نے بنائی تھی اور اس میں طرح طرح کی صنعتیں کی تھیں اور ایک لاکھ روپیہ میں تیار ہوئی تھی ایوانِ چہل ستون کی پیشگاہ میں زرین و سیمین ستونوں پر استادہ کی اور اس کے اطراف

کہ وہ ملک فصاحت کی حکمران تھی۔ حمد، نعت، منقبت اور مدح بزرگان میں جو جابجا اشعار لکھے ہیں وہ بتلاتے ہیں کہ نظم میں بھی وہ پایۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ ذیل کے اشعار اس مرثیہ کے اشعار ہیں جو اس نے شاہجہان کی وفات پر فی البدیہ کہا۔ اور اب اس کے اسی قدر شعر پائے جاتے ہیں ؎

اے آفتاب من کہ شدی غائب از نظر — آیا شب فراق ترا ہم بود سحر

اے بادشاہ عالم واے قبلۂ جہاں — بکشائے چشم رحمت و بر حال ما نگر

تا مرم چنیں زغصہ و یادم بود بدست — سوزم چو شمع در غم و دودم رود زسر

کلام فہمی اور اہل کمال کی قدردانی اس کا خاندانی ورثہ تھا۔ رحم دلی اور شرم و حیا کا مجسمہ تھی۔ اس کے اخلاق و عادات اور اس کا چال چلن ہر طرح قابل ستائش دکھائی دیتا ہے۔ تمام مورخ اس کو "فرشتہ سیرت" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ الا ڈاکٹر برنیر اور اس کا ہمنوا ٹیورنیر کہ انہوں نے بیچاری کو بہت بدنام کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کا کہیں کچھ اور کہیں کچھ کہنا۔ دروغ گورا حافظہ نباشد کے تحت میں آکر انہیں غلط گو ثابت کر دیتا ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اس نے اپنی تمام زندگی تجرد، ریاضت، نفس کشی میں بسر کی جیساکہ عام طور پر مغل شاہزادیاں کرتی تھیں جس کی وجہ بقول برنیر یہ ہے "کہ مغل سلاطین ایک تو اپنا ہمسر نہ پاکر اپنی لڑکیوں کے منسوب کرنے سے باز رہتے تھے۔ دوسرے انہیں اپنے اقربا سے اکثر بغاوت کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔" اس بیگم نے بہت سی خوبصورت اور پاکیزہ عمارتیں بنوائی تھیں۔ جو اب تک اس کی یادگار ہیں۔ اور صدقۂ جاریہ کا کام دیتی ہیں۔ مندرجہ ذیل عمارات زیادہ مشہور ہیں:-

(۱) جامع مسجد آگرہ۔ بصرف ۵ لاکھ روپیہ۔

(۲) بیگمی دالان۔ اجمیر شریف۔ بہ درگاہ خواجہ غریب نوازؒ۔ یہ سنگ مرمر کی بہترین عمارت ہے۔ اس میں سنگ افشاں ابری کا فرش ہے۔ درمیانی محراب پر جواہرات کی بے نظیر پچیکاری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ نورجہاں کے گلے کی دھگدھگی ہے +

(۳) کاروان سرا۔ دہلی۔ برنیر نے اس کو رائل پلیس (فرانس) سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کے پیرس میں واقع ہونے کی تمنا کی ہے +

(ماخوذ از جہاں آرا۔ مولوی محبوب الرحمن کلیم بی۔اے ایل۔ایل۔بی۔ اور تاریخ آگرہ منشی سیل چند)

نوٹ نمبر ۵-۶- جشن شمسی۔ جشن قمری۔ سلاطین مغلیہ نے ہندوؤں کی تالیف قلوب کے لئے ان کی بعض رسمیں اختیار کرلی تھیں۔ جن کو اکبر کے عہد سے

نوٹ نمبر ۴ - جہاں آرا بیگم - جہاں آرا بیگم نام، نواب علیۃ العالیہ خطاب، بیگم صاحبہ کلاں مشہور، پہلے بیگم صاحبہ کہلاتی تھی - مگر اپنی چھوٹی بہن روشن آرا بیگم کے اسی عرف سے معروف ہونے کے بعد "بڑی بیگم صاحب" کہلانے لگی +

ممتاز محل کے بطن سے جن دنوں شاہجہان میواڑ کی مہم میں مصروف تھا چہارشنبہ کے دن ۲۱ - صفر ۱۰۲۳ھ کو پیدا ہوئی - ممتاز محل کی پہلی اولاد تھی - جو زندہ رہی، شاہجہان کو اس سے بیحد محبت تھی - ملک الشعراء ابو طالب کلیم ہمدانی کی بہن اور رکنائے کاشی کی بی بی ستی النساء خانم الملقب بہ صدر النساء (المتوفی ۱۰۵۶ھ) کے زیر تربیت و تعلیم رہی، ممتاز محل، دیوانجی، خانم اور نور جہاں کے فیضان صحبت کے علاوہ پایہ تخت کے اکثر ارباب کمال سے استفادہ کیا - ماں کے مرنے کے بعد باپ کے مزاج میں بہت دخیل ہو گئی تھی - اپنے بھائیوں میں دارا شکوہ سے اس کو بیحد محبت تھی - اورنگزیب اور اس کے بھائیوں میں جو خانہ جنگی ہوئی اس میں باپ اور بھائیوں میں اکثر ذریعہ صفائی بنی - لیکن اس کی بات کو کسی نے نہ مانا - شاہجہان کے زمانہ نظربندی میں وہ اس کی خدمت کرتی رہی - ۷۰ سال کی عمر میں ۷ - رمضان ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۹ء میں بمقام دہلی وفات پائی اور حسب وصیت صحن روضۂ حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ میں مدفون ہوئی مقبرہ بصورت محجر کھلی چھت کا بنا ہوا ہے - لوح مزار خام اور ہمیشہ سبز گھاس سے سبز پوش رہتی ہے - مزار پہ یہ عبارت کندہ ہے :-

ہو الحی القیوم

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا   کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

الفقیرۃ الفانیہ جہاں آرا بیگم مرید خواجگان چشت بنت شاہجہان بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ ۱۰۹۲ھ

وہ قرآن مجید خوش الحانی اور صحت لفظی کے ساتھ قواعد تجوید کے موافق پڑھنے میں طاق تھی +

سیاحت نے اس کی نظر میں وسعت پیدا کر دی تھی، اور ایک حسین، باسلیقہ خوش پوش اور خوش گزران بیگم تھی +

فن تاریخ سے خاص طور پہ دلچسپی رکھتی تھی - اور خواجگان چشت کی بے حد معتقد تھی - اس نے "مونس الارواح" کے نام سے "تذکرہ خواجہ غریب نواز لکھا ہے جس میں آپ کے بعض خلفاء کے حالات بھی ہیں - یہ کتاب بتلاتی ہے - کہ وہ پایہ کی انشا پردازتھی - جا بجا عربی جملوں کا استعمال اس کی عربی دستگاہ کی دلیل ہے - مضامین کی ترتیب، عبارت کی نشست، الفاظ کی تلاش و موزونیت بتلاتی ہے

مذکورہ بالا چالیس ستونوں کی وجہ سے یہ عمارتیں "چہل ستون" بھی کہلاتی تھیں۔ سفر کی حالت میں یہ کام پٹاپٹی کے کام کے ایک بہت بڑے خیمے سے جس میں اندر کی طرف مچھلی پٹن کی چھینٹ لگی ہوتی تھی لیا جاتا تھا۔ اور اس خیمہ کو اونچے مقام پر نصب کیا جاتا تھا۔ تاکہ دور سے پہچانا جا سکے۔ اور داد خواہ بے روک ٹوک آسانی کے ساتھ حضور شاہی میں باریاب ہو سکے۔ خانصاحب مولوی محمد اسمٰعیل خان مرحوم پنشنر ہیڈ مولوی سنٹرل نارمل اسکول آگرہ نے جو اردو کے ایک بہت بڑے خدمتگزار تھے۔ اور جن کا مدۃ العمر اردو پر احسان رہے گا۔ قلعہ آگرہ کی عبرتناک حالت پر ایک مثمن لکھا تھا۔ یہاں اس کا وہ حصہ جس سے عام وخاص کی موجودہ رقت خیز و عبرت انگیز تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ نقل کیا جاتا ہے ؎

وہ قصر معلےٰ کہ جہاں عام تھا دربار — آئینہ نمط صاف ہیں جسکے در و دیوار
وہ سقف زر اندود ہے مانند چمن زار — وہ فرش ہے مرمر کا مگر چشمہ انوار
اب بانگ نقیب اس میں نہ چاؤش کی للکار — سرہنگ کمربستہ، نہ وہ مجمع حضّار

کہتا ہے کبھی مرکز اقبال تھا میں بھی
ہاں قبلہ گہ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیّت کو مرا قہر تھا منظور — نافذ تھا زمانہ میں مری جاہ کا منشور
شاہان معاصر کا معین تھا یہ دستور — کرتے تھے سفیران ذوی القدر کو مامور
آمیری زیارت سے کریں چشم کو پُرنور — آوازہ مری شان کا پہنچا تھا بہت دور

اکناف جہاں میں تھا مرا دبدبہ طاری
تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری

وہ چتر، وہ دیہیم وہ سامان کہاں ہیں؟ — وہ شان وہ نوئیں وہ خاقان کہاں ہیں؟
وہ بخشی و دستور، وہ دیوان کہاں ہیں؟ — خدام ادب اور وہ دربان کہاں ہیں؟
وہ دولت مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں؟ — فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں؟

سنسان ہے وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان بخواقیں زمیں بوس"

(تاریخ خافی خان، سفر نامہ برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین، تزک اردو مولفہ مولوی محمد اسمٰعیل خان صاحب ج ۲)

نوٹ نمبر ۱۵۔ نقارخانہ ۔ یہ دربار تو آگرہ میں ہوا تھا۔ اور وہاں کا نقارخانہ عام وخاص کے جانب ہے۔ لیکن دہلی کے نقارخانے کے متعلق برنیر لکھتا ہے "عام و خاص میں جس دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔ اس پر ایک بڑا بالا خانہ بنا ہوا ہے۔ جس کے دروازے عام و خاص کی طرف ہیں۔ اس میں نفیریاں، شہنائیں اور نقارے رکھے رہتے ہیں، جو دن اور رات کو اوقات معینہ پر اکٹھے بجائے جاتے ہیں۔ نو وارد اہل فرنگ کو اس کی آواز نہایت کریہہ معلوم

اس سلسلہ کے اختتام تک سب بادشاہ بجا لاتے رہے۔ مثلاً تلادان یعنی سال شمسی و قمری کے حساب سے جب بادشاہ کی عمر کا کوئی سال شروع ہوتا تھا۔ تو بادشاہ سونے چاندی کے ساتھ تلتا تھا۔ اور وہ سب سونا چاندی مستحقین کو بطور خیرات دے دیا جاتا تھا۔ سال شمسی کا جشن "جشن شمسی" اور سال قمری والا جشن "جشن قمری" کہلاتا تھا۔ (دربار اکبری اور حواشی وقائع سیاحت برنیر۔ مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب)

نوٹ نمبر ۷۔ پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۸۔ ظفر نامہ = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۹۔ جشن نوروزی۔ دیکھو حاشیہ ۳ صفحہ ۱۲۵ +

نوٹ نمبر ۱۰۔

نوٹ نمبر ۱۱۔ ظفر نامہ = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۱۲ و ۱۴۔ اسپکی یا اسپک "اسپک" فارسی میں بڑے خیمے کو کہتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کا شامیانہ تھا جو "دل بادل" بھی کہلاتا تھا۔ اس کا طول ستر گز اور عرض پینتالیس گز تھا۔ باہر کی طرف اس میں سرخ کپڑا اور اندر کی جانب مچھلی پٹن (گجرات) کی بنی ہوئی مخملی چھینٹ لگی ہوئی تھی۔ جس کے رنگ بہت ہی تیز اور شاداب تھے بیل بوٹے ایسے موزوں بنائے گئے تھے کہ تختۂ گلزار کی سیر کا لطف آتا تھا۔ سات سال کے عرصے میں یہ صرف ایک لاکھ روپیہ گجرات میں بنکر تیار ہوا تھا۔ ۲۲۔ ۲۲ گز اونچی چاندی کی چوبوں پر جن میں سے تین مثل مستول جہاز اور بھی بلند تھیں تانا جاتا تھا تین ہزار فراش اسے استادہ کیا کرتے تھے۔ بارہ سو گز زمین گھیر لیتا تھا اور دس ہزار آدمی اس کے سائے میں بیٹھ سکتے تھے +

(ظفر نامہ شاہجہان، سفر نامہ ڈاکٹر برنیر، غیاث اللغات و برہان قاطع)

نوٹ نمبر ۱۳۔ ایوان چہل ستون۔ شاہجہان سے پہلے بادشاہوں کے عہد میں دربار عام کے لئے کوئی ایسا بڑا مکان موجود نہ تھا جہاں دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو اس لئے شاہجہان نے اپنے جلوس کے پہلے سال میں حکم دیا کہ قلعہ آگرہ، لاہور اور برہانپور میں دربار عام کے لئے چالیس چالیس ستونوں کی تین عالیشان عمارتیں بنائی جائیں۔ اور چونکہ یہی ایک ایسا مقام تھا جہاں رعایا کا ہر ایک متنفس اپنے عرض حال کے لئے باریاب ہو سکتا تھا۔ اس لئے تیار ہونے پر ان کا نام عام و خاص رکھا۔ آگرے کے عام و خاص کی تیاری پر ابو طالب کلیم نے اس کی تعریف میں یہ رباعی کہی ؎

ایں تازہ بنا کہ عرش ہمسایۂ اوست	رفعت حرفے ز زینہ پایۂ اوست
باغیست کہ ہر ستون سبزش بر دست	کآسائش خاص و عام در سایۂ اوست

تحائف و نفائس پیش کئے +

نوٹ نمبر ۱ - ظفرنامہ = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲ - سلاطین - جمع سلطان یعنی فرمانروا و صاحب حکومت لیکن حسب بیان مولانا آزاد دہلوی مرحوم خاندان چغتائیہ کی اصطلاح میں بادشاہ اور ولی عہد کے سوا جو خاندان کے بھائی بند ہوتے تھے "سلاطین" کہلاتے تھے بلکہ مجازاً ایک کو بھی "سلاطین کہ دیتے تھے - (دربار اکبری) اردو میں اس قسم کے بہت سے الفاظ مستعمل ہیں - جو ہیں تو درحقیقت جمع مگر واحد کے معنی میں آتے ہیں - مثلاً نواب کہ جمع نائب ہے - میں نے بھوپال میں وہاں کے حکمران خاندان کے ایک رکن کے لئے بھی "اخوان الریاست" (جو درحقیقت جمع ہے) بولتے ہوئے سنا ہے +

نوٹ نمبر ۳ - دربار مغلیہ کا آئین تھا کہ ہر شاہزادے اور رکن سلطنت کا ایک ایک وکیل دربار شاہی میں موجود رہتا اور علاوہ اپنے آقا کو دربار کی ضروری خبریں پہنچانے کے جملہ احکام شاہی کی تعمیل اور مراسم دربار کی بجا آوری اپنے آقا کی طرف سے بطور مختار کل انجام دیتا تھا +

ابوطالب کلیم ہمدانی وغیرہ کے قصیدے اور شاہی حوصلہ افزائی

ملک الشعراء ابوطالب، کلیم، ہمدانی نے قصیدہ تہنیت جشن پیش کیا جس کا مطلع تھا ؎

خجستہ مقدم نوروز و غرۂ شوال　　　فشاندہ اند چہ گلہائے عیش بر سر سال

شاہجہان نے اس قصیدے کے صلے میں کلیم کو روپیہ کے برابر تلوایا چنانچہ ۵۵۰۰ روپے وزن میں آئے اور اسے عطا ہوئے - بعض مورخین کا بیان ہے کہ شاعر مذکور سونے میں تولا گیا اور ہم وزن طلا اس کو روپیہ انعام ہوا +

شادمان سلطان نے جو گھکر کی شاہی نسل سے تھا اور جس نے لقب سلطانی اختیار کر لیا تھا - اس موقع پر بادشاہ اور تخت کی مدح میں ایک بہترین مثنوی لکھی اور معقول انعام پایا - کسی پنڈت نے کبت لکھ کر پیش کی اور اس کا منھ موتیوں سے بھرا گیا +

ہوتی ہے۔ جب میں آیا ہی آیا تھا مجھے بھی گراں گزرتی تھی۔ لیکن اب سنتے سنتے کان عادی ہوگئے ہیں۔ اس کی آواز بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ رات کے وقت دور سے۔ (میر حسن نے اپنی بے مثل مثنوی میں کیا خوب کہا ہے ؎

سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا کہیں دور سے کان پڑتی تھی آ)

نفیری جو "قرنا" کہلاتی ہے نو فٹ لمبی ہوتی ہے۔ اس کا قطر ایک فرانسیسی فٹ سے کم نہیں اور توبے یا پیتل کا چھوٹے سے چھوٹا نقارہ چھ فٹ قطر کا ہے"۔

نوٹ نمبر ۱۶ - یہاں "امراء" کا لفظ میں نے بڑھایا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے در و دیوار اور عمارات گرداگرد خاص وعام کی تزئین کا متکفل صرف شاہزادوں کو لکھا ہے۔ لیکن برنیر اور ٹیورنیر جو بذاتِ خود دربار مغلیہ میں عرصے تک رہے ہیں۔ صرف امراء کو لکھتے ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ عام و خاص کے گرداگرد جو غلام گردش تھی۔ اس کی ایک ایک محراب بڑے بڑے امراء کے سپرد تھی۔ اور ہر ایک کو اس کی مفوضہ محراب کے متعلق بادشاہی حکم تھا۔ کہ اسے اس کے متعلقات سمیت اپنے صرف سے آراستہ پیراستہ کرے۔ یہ امراء بادشاہ کو خوش کرنے، درباروں کی رونق بڑھانے کے لئے آرائش و زیبائش میں اپنی امکانی طاقت خرچ کر دیتے تھے۔ اور ایک دوسرے پر فوق لیجانے میں ساعی ہوتے تھے۔ انجام یہ ہوتا تھا کہ مذکورہ بالا غلام گردش عجائباتِ عالم کا نمونہ بن جایا کرتی تھی۔ عجب نہیں کہ مثل امراء کے ایک ایک حصہ شاہزادوں کے سپرد بھی ہوتا ہو بلکہ یہ امرا اس حیثیت سے کہ وہ بھی مناصب و مراتب کی حیثیت سے ذی اقتدار امراء میں شامل تھے یعنی ہ

نوٹ نمبر ۱۷ - ظفرنامہ شاہجہان = ۱۲ +

سنہ اور محلِ جلوسِ اولیں

بادشاہ جمجاہ نے بعد فراغِ نمازِ عید الفطر دولت خانہ گھاٹ سے بسواری کشتی مینو سواد اکبر آباد میں نزولِ اجلال فرما کر غرۂ شوال المعظم ۱۰۳۷ھ = ۳۔ فروری ۱۶۲۸ء کو بروز جمعتہ المبارک ٹھیک بارہ بجے دن کے تختِ طاؤس پر جلوس فرمایا[1] +

شاہزادوں، سلاطین[2]، راجگان مہاراجگانِ ہند، اراکین دولت، عمائدین سلطنت اور سفرائے ممالکِ خارجہ نے بذاتِ خود یا کسی عذر کے باعث بتوسطِ وکلاء[3] عقیدت مندی اطاعت شعاری اور اخلاص مندی کا اظہار کر کے حضور شاہی میں نذریں گزرانیں اور

اور مہاراجہ جسونت سنگھ ہفت ہزاری اور راجہ مرزا جے سنگھ ششہزاری کردئے گئے تھے۔ امراء کی تعداد مقرر تھی اور وہ صاحب مراتب ہوتے تھے۔ ان سے کم اور سواروں سے زیادہ رتبہ کے لوگ منصبدار کہلاتے تھے۔ یہ مخصوص معزز درجہ ہوتا تھا۔ اور امراء انہیں میں سے منتخب ہوتے تھے۔ ان کے پاس شاہجہان کے عہد سے سوار وغیرہ نہ ہوتے تھے۔ صرف ۵-۶ گھوڑے رکھتے تھے۔ اور بجز بادشاہ کے کسی کے ماتحت نہ ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ ڈیڑھ سو سے سات سو تک ہوتی تھی۔ اور بخلاف امراء کے غیر معین تعداد میں رہتے تھے +

منصبداروں کے بعد سواروں کا رتبہ تھا۔ جو امراء کے ماتحت ہوتے اور دو قسم پر منقسم تھے۔ (۱) دو اسپی (۲) یک اسپی۔ دو اسپہ کی تنخواہ نسبتاً یک اسپہ سے زیادہ ہوتی تھی۔ اور گو ان کی تنخواہ خزانہ شاہی سے ملتی تھی۔ مگر تنخواہ کی کمی وبیشی وہ جس امیر کے ماتحت ہوتے اس کی سیر چشمی پر منحصر ہوتی تھی۔ ان کی تنخواہ روزانہ ملتی تھی +

سواروں کے بعد روزینہ داروں کا نمبر تھا۔ یومیہ تنخواہ پاتے تھے۔ اور گو سواروں سے ذرا کم رتبہ شمار ہوتے تھے۔ مگر تنخواہیں بیش قرار پاتے تھے۔ حتیٰ کہ بعض بعض تو منصبداروں سے زیادہ تنخواہ پانے لگتے تھے۔ یہ بیشمار ہوتے اور عموماً متصدی و نائب متصدی وغیرہ کے عہدوں پر کام کرتے تھے +

ان کے بعد پیدل کا نمبر تھا۔ یہ سب سے کم تنخواہ ۱۰-۲۰ یا ۳۰ پاتے تھے۔ گولہ اندازوں کی تنخواہ بہت ہوتی تھی۔ خصوصاً ڈچ، پرتگالی، جرمنی اور فرانسیسوں یعنی اہل مغرب کی۔ پہلے یہ کئی کئی سو ماہانہ پاتے تھے مگر بعد میں ۳۲ سے زیادہ کسی کو نہ ملتا تھا +

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دربار مغلیہ کا دستور تھا کہ جب تک امراء کی طرح شہزادے کسی مہم وغیرہ پر مامور نہ ہوتے تھے ان کو کوئی مرتبہ یا منصب نہ ملتا تھا۔ بلکہ ان کے ذاتی اخراجات کے لئے انہیں روزانہ ایک معقول و معینہ رقم دی جاتی تھی جیسے کہ شاہزادہ مراد بخش کو پانسو روپیہ روز ملتا تھا۔ (ماخوذ از حواشی "وقائع سیاحت برنیر" مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب) = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲- سیر المتاخرین = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۱ - ظفرنامہ شاہجہان = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲ - قاموس المشاہیر = ۱۲ + نوٹ نمبر ۳ - قصص ہند آزاد +

شاہجہان کی ایک غیر معمولی عنایت

یمین الدولہ، آصف خان کو خانخانانی و سپہ سالاری کے خطاب و مراتب عطا[1] ہوئے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ خود بدولت خانِ موصوف کے مکان پر تشریف لے گئے۔ جو حد درجہ کی عزت افزائی تھی[2] +

یہ شاہانہ، سالانہ جشن نوروزی جو بادشاہ کی آٹھویں سالگرہ تاجپوشی کی یادگار میں تھا، دس دن تک منایا گیا۔ اور اس مدت دہ روزہ میں ایک ہزار خلعت اور لاکھوں روپیہ نقد شاہزادوں، بیگمات، امراء، عمائدین، سفراء اور سیاحین کو مرحمت ہوا +

نوٹ نمبر ۱ - مراتب و مناصب مغلوں کے عہد میں ملازمین و امراء کے مدارج اور ان کی تنخواہوں میں وقتاً فوقتاً تغیر تبدل ہوتا رہا۔ عموماً امرا کا منصب ہزاری سے ہفت ہزاری، نہ ہزاری، دہ ہزاری اور دوازدہ ہزاری تک ہوا کرتا تھا۔ تنخواہ کا اندازہ سواروں کے شمار اور گھوڑوں کی تعداد پر تھا۔ عموماً ہر سوار کو دو گھوڑے رکھنا پڑتے تھے۔ آئین اکبری سے واضح ہوتا ہے کہ امراء اور منصبداروں کو اپنے منصب کے اندازے سے گھوڑے، یابو، ہاتھی، اونٹ، خچر، چھکڑے اور گاڑیوں کی مقررہ تعداد رکھنی پڑتی تھی، چنانچہ پنجہزاری امیر کو ۳۴۷ گھوڑے اور یابو، ۱۰۰ ہاتھی، ۸۰ اونٹ، ۲۰ خچر، ۱۶۰ چھکڑے اور گاڑیاں ان کے خرچ خوراک وغیرہ کے لئے پنجہزاری امیر کو (علاوہ تنخواہ فوج کے جو اس کو رکھنا پڑتی تھی) تیس ہزار (۳۰۰۰۰) روپیہ سرکار شاہی سے ملتا تھا +

شاہجہان نے اپنے عہد میں بست ہزاری تک کا منصب قائم کر دیا تھا۔ جس پر دارا شکوہ ممتاز تھا +

ہفت ہزاری کے منصب سے زیادہ عموماً کسی کو نہ ملتا تھا۔ اور اس پر بھی ایک وقت میں بقول خافی خان ۴ امراء سے زیادہ فائز نہ ہوتے تھے۔ آصف خان کو بھی بطور غیر معمولی عنایت کے نہ ہزاری منصب عنایت کیا گیا تھا +

ہندو امراء کی حد ترقی (جن کو آجکل کی اصطلاح میں "نیٹو" کہتے ہیں) شاہجہان کے دوسرے دہ سالہ تک پنجہزاری سے زیادہ نہ تھی۔ مگر آخر میں یہ حد توڑ دی گئی تھی۔

حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کے لئے شاہی نذرانہ

"گل محمدی"

اس پُر مسرت موقع پر نذر نواز بادشاہ کا ایک مخصوص نذرانہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ ایک گلکار، طلائی، مرصع اور بے عدیل قندیل تھی۔ موسومہ "گل محمدی"، جو روضۂ مطہرۂ سرور کائنات صلے اللہ علیہ و علی آلہ وسلم پر آویزاں کرنے کے لئے مدینہ طیبہ کو بھیجی گئی تھی۔ خصوصیّت ذکر کی وجہ یہ کہ اس سے بھی شاہجہان کے حسنِ مذاق، اس کی سلیم الطبعی اور ندرت پسندی اور نہ محض ندرت پسندی بلکہ نکتہ نوازی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اور اہلِ نظر معلوم کرسکتے ہیں کہ کس طرح بات بات میں شاہجہاں کی طبیعت اعجوبۂ روزگار لطائف پیدا کردیتی تھی۔ اور اس کے بعد ہمیں کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں دکھائی نہیں دیتی کہ تخت طاؤس یا تاج محل کے متعلق بیان کریں کہ ان کی ترتیب وضع کا خاکہ شاہجہاں کی فکر کا نتیجہ تھا +

گل محمدی۔ ۱۰۵۷ھ = ۲۱ سنہ جلوس میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ قطب الملک (والی گولکنڈہ) کے تعلقہ "سورت" میں کسی کان سے ۱۸۰ (ایک صد اسی) رتی وزنی ایک ناتراشیدہ الماس برآمد ہوا ہے۔ حکم ہوا کہ قطب الملک کو لکھا جائے "الماس مذکور کی قیمت، وجہ مقرری (خراج) میں مجرا دے کر حضور میں بھیجدے" فرمان شاہی کے پہنچنے سے پہلے قطب الملک اس الماس کو الماس تراش کے حوالہ کرچکا تھا۔ اور وہ دس رتی تراش بھی چکا تھا۔ فرمان شاہی کے پہنچتے ہی اس نے اسے بجنسہ روانہ کردیا۔

تختِ طاؤس کا دہلی پہنچنا

۱۰۵۷ھ ۱۶۴۸ء = سنہ ۲۱ جلوس میں دارالسلطنت آگرہ سے دہلی (شاہجہاں آباد) منتقل ہوا[1]۔ اور تختِ طاؤس بھی وہیں گیا[2]۔ گو دلی پہنچکر ایک اور بھی مرصع تخت بنوا لیا گیا تھا۔ اور عام طور پر بادشاہ اسی پر رونق افروز ہوا کرتا تھا۔ لیکن خاص خاص مواقع بالخصوص سالانہ جشنِ سالگرہ تاجپوشی کے موقع پر تختِ طاؤس ہی زینتِ دربار ہوا کرتا تھا[2] +

مولانا آزاد دہلوی مرحوم نے آبادی جہاں آباد، قلعہ معلیٰ کے افتتاحی دربار اور سالانہ جشن کا قصہ جس دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے اسے ہم نقل کر آئے ہیں تکرار بیان کی ضرورت نہیں (ملاحظہ ہو صفحہ نمبر ۶۰-۶۲)

یہ جشن و دربار ۲۴- ربیع الاول ۱۰۵۷ھ ۱۶۴۷ء کو = سنہ ۲۱ جلوس میں بروز سہ شنبہ منعقد ہوا۔ حسب دستور حضور شاہی میں بیش بہا نذریں گزریں، منجملہ ان کے بارہ لاکھ روپیہ کی تو صرف جنس ہی تھی۔ جس نے شرفِ قبولیت پایا[3]۔ دریائے کرم شاہی جوش میں آیا، اور ہر ایک علیٰ قدرِ مراتب مالا مال ہوگیا۔ میر یحییٰ کاشی کو اس صلہ میں کہ اس نے عمارات و آبادیٔ شاہجہاں آباد کی تاریخ کہی تھی ع

شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد

معقول انعام دیا گیا[4] +

نوٹ نمبر ۱ - ہسٹری آف جہانگیر مصنفہ بینی پرشاد ایم۔ اے اور تاریخ ہند اسمتھ - ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲ - استخراج از جہاں آرا۔ مصنفہ کلیم +

نوٹ نمبر ۳ - لیٹر مغل ولیم اردن = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۴ - ظفر نامہ - سیر = ۱۲ + نوٹ نمبر ۵ - سیر - ۱۲ +

مستحقین مکہ معظمہ کو اور پچاس ہزار روپیہ کے سامان کی نقدی منافع سمیت
ارباب استحقاق مدینہ طیبہ کو تقسیم کرے" ٭

ہم صاحب سیر کی رائے سے اس لیے متفق ہیں کہ اُس کے بیان کے مطابق ہر دو
مقامات مقدسہ کے اہل استحقاق کی امداد ثابت ہے۔ علاوہ ازیں یہ ممکن نہیں کہ
بادشاہ خانہ خدا کے ہمسایوں کی خدمتگزاری کرتا۔ اور جوار رسول کے باشندگان
کو نظر انداز کر جاتا ٭

شاہان مغلیہ عملاً حامل خیالِ تجارت تھے

شاہجہاں کا سامان بھیجکر اس کی فروختگی حصول منفعت، زر اصل و نفع کے
تقسیم کی ہدایت کرتا یہ ایسے امور ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کے بادشاہ
بھی تجارتی خیالات سے پُر تھے ٭

شاہجہاں کی معزولی و نظربندی

دنیا دار المکافات ہے، بیک گردش چرخ نیلوفری خود صاحبقران ثانی تیس
برس حکومت کرنے کے بعد تقریباً سرسٹھ برس کی عمر میں ۲۱۔ رمضان المبارک ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۸ء
کو اپنے منجھلے بیٹے اورنگزیب عالمگیر کے ہاتھوں "مصالح ملکی" کا شکار ہو کر قلعہ آگرہ
میں نظر بند اور منصب حکومت سے معزول و محروم ہوگیا[۲]۔ اِس پُر عبرت واقع کی تاریخ
عاقل خان نے جو ایک مشہور و معروف مورخ و تاریخ گو ہوا ہے واعتبروا یااولی الابصار
۱۰۶۸ھ
میں پائی۔ سچ ہے ؎

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ   تخت زمیں پہ سینکڑوں آئے چلے گئے (آتش)

نوٹ نمبر ۱۔ سیر اورنگزیب سرکار۔ وقائع برنیر ۱۳۰ ٭
نوٹ نمبر ۲۔ حواشی و تاریخ سیاحت برنیر ترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب جوتاریخ عاقل خان و صاحب عمل صالح ۱۳۰ ٭

حضور میں پہنچکر ستر (۷۰) رتی اور تراشا گیا۔ اور اب سنوارنی بے جرم، شفاف وخالی ازعیب باقی رہا۔ جس کی قیمت ۱½ لاکھ روپیہ آنکی گئی اور بیس ہزار روپیہ اس کے ریزہ ہائے تراشیدہ کی۔ اسی زمانہ میں اتفاقاً ایک دن ایک شمامہ عنبر نذر گزرا جو قندیل نما ستّر (۷۰) تولہ وزنی اور دس ہزار روپیہ قیمت کا تھا۔ بادشاہ نے اس شمامہ کو طلا میں مشبک کرا کے انواع اقسام کے جواہرات مع اس سنوارنی الماس اور اس کے ریزوں کے اُس پہ جڑوا دئے۔ اس طرح یہ قندیل ۲½ لاکھ روپیہ میں تیار ہوئی اور چونکہ اس کی گلکاری خوب اور بہت ہی دیدۂ زیب تھی۔ لہٰذا اس نام سے موسوم ہوئی[۲] +

قندیل مذکورہ بالا کے ساتھ بقول صاحب ظفرنامہ پچھتر ہزار روپیہ نقد اور پچھتر ہزار روپیہ کی جنس احمد آباد سے خرید کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو سید احمد سعید کے ہاتھ روانہ کی۔ اجناس مذکور وہاں وہ چند قیمت کو بکتی تھیں لہٰذا حکم ہؤا کہ شریف مکہ کو نقد وجنس پچاس ہزار روپیہ کی دے اور بقیہ روپیہ مساکین و مستحقین پر تقسیم کر دے۔ قندیل کو روضہ منورۂ سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ و علیٰ آلہ وسلم میں آویزاں کر دے[۳] +

نوٹ نمبر ۱ و ۲ و ۳۔ سیر و ظفرنامہ = ۱۲ +

صاحب ظفرنامہ کے ایک قول کی تنقید

ترسیلِ نقد وجنس میں صاحبِ ظفرنامہ شاہجہاں اور صاحب سیرالمتاخرین کے مابین قدرے اختلاف ہے۔ صاحبِ سیر کا بیان یہ ہے :۔

حکم ہؤا کہ منصدیان گجرات ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ کا سامان خرید کر اس (سیدِ موصوف) کے حوالہ کریں۔ تاکہ وہ اس میں سے پچاس ہزار کا سامان مع منافع شریف مکہ کو دے اور ساٹھ ہزار کی جنس فروخت کر کے مع منافع

نوٹ نمبر ۳ - عالمگیر نامہ و سیر = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۴ و ۵ - حواشی وقائع سیاحت برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۶ و ۸ - عالمگیر جس وقت اورنگ زیب نے دارا شکوہ کی فوج کو عماد پور عرف سمو گڈھ کے مقام پر سب سے پہلی شکست دینے کے بعد آگرہ کے قریب باغ نور منزل عرف باغ دہرہ پر قیام کیا۔ اور باپ بیٹوں میں خط و کتابت شروع ہوئی ہے۔ تو شاہجہان نے اس کو ترغیب و تہدید کیساتھ اپنی خدمت میں حاضری پر آمادہ کرنا شروع کیا اور بقول عاقل خاں و صاحب عمل صالح وہ تیار بھی ہوگیا تو دوسرے دن بادشاہ نے بطور اظہار خوشنودی مزاج اس کو عمدہ اور نفیس اشیاء بھیجیں منجملہ ان کے ایک تلوار موسومہ "عالمگیر" بھی تھی۔ امراء نے اورنگزیب کو بادشاہ کی طرف سے خوفزدہ اور غیر مطمئن کرکے جانے سے روکا اور اس تلوار کو فال نیک بتلایا تاآنکہ اس نے تخت نشینی کے وقت اس لفظ کو اپنے القاب شاہی کا ایک جزو بنالیا۔ (از حواشی سفرنامہ برنیر مترجمہ خلیفہ سید محمد حسین صاحب صفحہ ۱۲۴-۱۲۶)

نوٹ نمبر ۷ - ۹ - حواشی "وقائع سیاحت برنیر" مترجمہ خلیفہ محمد حسین و سیر - ۱۲ +

ایک روایت

روایت: کہتے ہیں کہ جب خطیب دستور کے موافق دوران خطبہ خوانی اورنگزیب کے بزرگوں میں سے کسی کو جنت آشیانی اور کسی کو خلد مکانی وغیرہ وغیرہ کہکر گننے لگا اور جہانگیر کے نام پر پہنچا تو اورنگ زیب نے اپنی خلقی دانائی اور فطری فراست سے معلوم کیا کہ یہ اس امر میں حیران ہے کہ جیتے جاگتے **شاہجہاں** کا نام کیا کہ کرے، فوراً قیدی باپ کے حسب حال لقب لطیف تجویز کرکے خطیب سے کہا، بگو "تارک تاج و دیہیم ثانی سلطان ابراہیم، شہاب الدین محمد، شاہجہاں، بادشاہ غازی، صاحبقران ثانی" اس روایت کے متعلق خلیفہ محمد حسین صاحب نے صفحہ ۱۶۹ حواشی وقائع سیاحت برنیر مترجمہ خود میں تحریر فرمایا ہے۔

"اگرچہ کسی کتاب تاریخ میں دیکھا نہیں گیا مگر مشہور ہے"

کچھ تعجب بھی نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مخالفین اورنگزیب نے اپنی بہتان طرازی

جلوس عالمگیری

گو اورنگ زیب کی سرسری و رسمی تاجپوشی کی تقریب باغ اعز آباد عرف شالامار میں جو شاہجہاں آباد (دہلی) کے قریب لاہور کے راستہ پر تھا، یکم ذیقعد ۱۰۶۸ھ مطابق ۲۱- جولائی ۱۶۵۸ء کو جمعہ کے دن عمل میں آچکی تھی[۱]. لیکن چونکہ بھائیوں کی طرف سے اطمینان کلی نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ایک شاندار دربار، جشن، تعین لقب، اجرائے خطبہ و سکّہ وغیرہ کہ لوازمات شاہی ہیں صورت پزیر نہ ہوئے تھے[۲]۔ بھائیوں کے استیصال کے بعد ہر طرف سے مطمئن ہوکر بروز دوشنبہ ۲۴- رمضان ۱۰۶۹ھ مطابق ۵- جون ۱۶۵۹ء کو قلعہ دہلی (جس میں یہ اب تک داخل نہیں ہوا تھا)[۱] میں نجومیوں کے قرار دادہ صورت کے موافق بعمر ۴۰ سال ، ۷ ماہ ۱۳ دن بحساب شمسی (۴۱ سال ۲ ماہ ۱۰ دن بحساب قمری) بڑے کروفر کے ساتھ تخت طاؤس پر دوبارہ باقاعدہ جلوس کیا[۱۲]۔ "ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب بہادرؒ، عالمگیر غازیؒ" لقب قرار پایا۔ ملّا عزیز اللہ خلف ملّا محمد تقی مجلسیؒ اصفہانی نے آیۃ کلام اللہ" ان الملک للہ یؤتیہ من یشاء "کے حروف ملفوظی سے تاریخ جلوس نکالی[۲]، جسے حقیقتاً القاے ربانی والہام غیبی سمجھنا چاہیئے۔ سکہ سخن نواز اور سخن سنج بادشاہ نے خود کہا ؎

سکہ زد در جہاں چو مہرِ منیر شاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ

اور بے ادبی کے خیال سے سکے میں کلمہ طیبہ اور خلفاے اربعہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم و رضوا عنہ) کے اسماے مبارک کی بجاے سونے اور چاندی کی مناسبت سے باختلاف لفظ "بدر" و "مہر" کا ٹھپہ ہونا تجویز ہوا[۱] +

نوٹ نمبر ۱ و ۲ - اورنگ زیب سرکار - حواشی سفرنامہ برنیر مترجمہ خلیفہ محمد حسین صاحب مستخرجہ از تاریخ عاقل خاں و عمل صالح و حاشیہ مترجم انگریزی سفرنامہ برنیر و مسٹر ارونگ برک بحوالہ تاریخ ہندوستان مصنفہ کرنل وڈ = ۱۲ +

صحن کے نصف تک پھیلا ہؤا اور چاروں طرف چاندی کی پتیوں سے منڈھے ہوئے کٹھرے سے گھرا ہؤا تھا۔ اور چوبیں بھی چاندی سے منڈھی ہوئی تھیں جن میں سے تین ایسی بلند تھیں جیسے جہاز کا مستول، اور باقی چھوٹی چھوٹی تھیں۔ اس عالیشان خیمے کے باہر کی طرف سرخ رنگ کا کپڑا تھا اور اندر کی جانب مچھلی پٹن کی نہایت عمدہ چھینٹ تھی۔ جو اسی غرض سے بنائی گئی تھی۔ اور جس کے بیل بوٹے ایسے موزوں اور رنگ ایسے تیز و شاداب تھے کہ ایک تختۂ گلزار معلوم ہوتا تھا۔ اور چونکہ سب امراء کو حکم دیا گیا تھا کہ عام وخاص کی غلام گردش کی ایک ایک محراب کی زیبائش و آرائش وہ اپنے اپنے خرچ سے کریں۔ اس لئے بادشاہ کی زیادہ تر رضامندی حاصل کرنے کے خیال سے ہر ایک نے دوسرے سے بڑھکر ان کی زیب و زینت میں کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ تمام در و دیوار سر سے پاؤں تک کمخواب اور زربفت میں غرق اور فرش نہایت بیش قیمت قالینوں سے آراستہ و پیراستہ ہوگیا +

جشن کے تیسرے دن اول بادشاہ اور اس کے بعد اکثر امراء بڑے تکلف کے ساتھ بڑی بڑی ترازوں میں جن کے پلڑے اور بٹے سونے کے تھے۔ تولے گئے اور مجھے یاد ہے کہ یہ دیکھ کر کہ اورنگ زیب کا وزن سال گذشتہ کی بہ نسبت ایک سیر زیادہ ہے، تمام دربار نے نہایت ہی مسرت ظاہر کی۔ اس قسم کے جشن ہر سال ہوتے ہیں۔ لیکن اس شان و شوکت کا جشن کبھی نہیں ہؤا اور نہ اس قدر کبھی خرچ ہؤا +[۱]"

نوٹ نمبر ا ۔ وقائع سیاحت برنیر = ۱۲ +

کا ثبوت دیا ہو۔

یہ دربار بڑا ہی شاندار دربار تھا۔ برنیر نے اس دربار کو دیکھا تھا۔ اس نے جو چشم دید کیفیت اپنے **وقائع سیاحت** میں قلمبند کی ہے۔ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مبہوت و مرعوب ہوگیا ہے۔ وہ اس کیفیت کو لکھنا چاہتا ہے مگر ڈھونڈے لفظ نہیں ملتے۔ اور ہے بھی یہ کہ **شاہان مغلیہ** کے جشنوں اور درباروں میں یہ جشن و دربار اپنی نظیر آپ ہی تھا۔ جس میں اکبری جاہ و جلال، جہانگیری عیش و عشرت شاہجہانی نفاست اور عطایا و نوال کی مجموعی جھلک پائی جاتی تھی۔ ڈاکٹر مذکور کا بیان ہے:۔

"وہ بڑا جشن جو لڑائی کے اختتام کے بعد ہوا تھا۔ اور جس سے بڑھ کر کوئی تماشا میں نے اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھا۔ اس روز بادشاہ نہایت ہی عمدہ لباس پہنے **دیوان عام و خاص** کے صدر میں مرصع تخت (**تخت طاؤس**) پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ اس کی پوشاک نہایت نازک اور پھولدار ریشمی کپڑے کی تھی جس پر بہت ہی عمدہ زری کا کام کڑھا ہوا تھا۔ اور زری کا رمندیل سر پر تھی اور بڑے بڑے اور نہایت قیمتی ہیروں کا طرہ لگا ہوا تھا جس میں ایک پکھراج ایسا تھا جو لاثانی کہا جا سکتا ہے۔ اور آفتاب کی طرح چمکتا تھا۔ اور بڑے بڑے موتیوں کا کنٹھا گلے میں تھا جو ہندوؤں کی طرح پیٹ تک لٹکتا تھا۔

تخت کے نیچے کے چبوترے پر جس کے گرد چاندی کا کٹہرا لگا ہوا اور اوپر زری کی جھالر کا ایک پُر زر وسیع شامیانہ تنا ہوا تھا۔ امراء نہایت تکلف پوشاکیں پہنے کھڑے تھے۔ مکان کے ستون زربفت سے منڈھے ہوئے، ریشمی مشجر کے شامیانے جن میں ریشم اور زری کے پھندنے لگے ہوئے تھے تنے ہوئے اور نہایت عمدہ ریشمین قالین بچھے ہوئے تھے اور باہر ایک خیمہ جسے "اسپاک" کہتے ہیں اور جو اس مکان سے بھی بڑا ہے اس کی چھت کے ساتھ ملا کر لگایا تھا جو

اس ارادہ سے باز رکھا۔ اور وہ جواہرات اس (شاہجہاں) سے لے کر اپنی تحویل میں رکھ لئے[2]+

آخر کار شاہجہاں نے اورنگ زیب (عالمگیر) کی خدمت گزاری سے خوشنود ہو کر اس کا قصور نہ صرف زبانی ہی معاف کیا۔ بلکہ توقیع معافی لکھدی تھی[3]۔ بیٹے کو امور سلطنت میں مشورہ بھی دے دیا کرتا تھا[4]۔ جہاں زیب[5] بانو بنت داراشکوہ کا عقد بھی محمد اعظم المخاطب بہ عالیجاہ کے ساتھ کر دیا تھا[6]۔ جس کے متعلق پہلے بڑے شد و مد کے ساتھ انکار کر چکا تھا۔ اور اورنگ زیب کے مطلوبہ جواہرات میں سے کچھ جواہر بھی اسے دے دئے تھے[7]۔ بقول برنیر علاوہ ان تمام امور کے "اپنے باغی فرزند کی سب گستاخانہ حرکتیں معاف کر کے اس کے حق میں دعائے خیر بھی کر دی تھی"

نوٹ نمبر ۱۔ سفرنامہ برنیر اور جہاں آرا" = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲۔ جہاں آرا = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۳۔ مآثر الامراء = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۴۔ سفرنامہ برنیر = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۵۔ جہاں زیب بانو بیگم۔ دارا شکوہ کی بیٹی تھی۔ جب وہ داراشکوہ کے کے قتل کے بعد محل سرا میں لائی گئی تو شاہجہاں اور جہاں آراء بیگم نے اس کی بڑی دلدہی و غمخواری کی۔ اور بہت محبت و شفقت سے پرورش کرنا شروع کیا۔ آخر کار بیگم صاحب نے اس کو اپنی بیٹی بنا کر متبنیٰ کر لیا +

جب یہ شہزادی عالم شباب کو پہنچی تو عالمگیر نے خواہش کی کہ وہ محمد اعظم المخاطب بہ عالیجاہ کو بیاہ دی جائے۔ لیکن شاہجہاں اور بیگم صاحب نے جو اس کے اصلی سرپرست تھے شد و مد کے ساتھ اس امر کی مخالفت کی۔ خود ستم رسیدہ جہاں زیب نے جب سنا تو کہا "میں اس ظالم کے لڑکے سے جس نے میرے باپ کو قتل کیا ہے ہرگز شادی کرنے پر رضامند نہیں" مگر بادشاہ وقت کی مخالفت کہاں تک چل سکتی تھی۔ آخر کار جہاں آراء بیگم اور شاہجہاں دونوں رضامند ہو گئے۔ اور ۱۰۷۰ھ میں شادی ہو گئی۔ بزم شادی بیگم صاحب کے دولت خانہ پر منعقد ہوئی۔ بیگم صاحب نے اس تقریب میں اعلیٰ درجے کا انتظام کیا تھا۔ اور سولہ لاکھ (۱۶۰۰۰۰۰) روپیہ اپنی جیب خاص سے صرف کر ڈالا تھا +

اورنگ زیب کا قصد ترصیع مکرر "تخت طاؤس"

قاعدہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ تو وہ اپنے پیشرو کے نظام میں تھوڑا بہت تغیر و تبدل ضرور کیا کرتا ہے۔ چنانچہ عالمگیر نے بھی زمام حکومت ہاتھ میں لے کر کاروبار سلطنت میں ترمیم و تنسیخ کرنی شروع کی۔ اسی سلسلے میں اس نے تخت طاؤس کے کام میں بھی کچھ رد و بدل کرنا چاہا ÷

ارادۂ ترصیع مکرر پر شاہجہاں کی ناراضی

اور

عطائے جواہرات سے انکار

بہت ممکن اور قرین قیاس ہے کہ اس معاملہ میں اورنگ زیب کی یہ مصلحت بھی ہو کہ اس بہانے سے مقید بادشاہ کے قبضے میں جو بہت سے بیش قیمت اور یکتائے روزگار جواہرات موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ جواہر ہاتھ آ جائیں۔ لہذا طلب جواہرات کے متعلق باپ کے پاس پیام بھی بھیجا۔ قیدی بادشاہ اس زمانہ میں فرمانروا بیٹے سے بیحد برہم تھا۔ اس نے نہایت غضبناک ہو کر کہلا بھیجا "اورنگ زیب! دیکھ! دانائی و انصاف سے سلطنت کا کام کرتا رہ، تخت کے معاملہ میں ہرگز ہرگز دخل مت دیجیو!! اگر جواہرات کے متعلق تو نے دوبارہ ستایا تو یاد رکھیو ان سب کو کوٹ کر چورا کرا دونگا!!"

ٹیورنیر نے تو یہ بھی لکھا ہے "غصے میں آ کر شاہجہان نے یہ چاہا تھا۔ کہ تمام جواہرات کو پسوا ڈالے۔ لیکن بیگم صاحب (جہاں آراء بیگم) نے سمجھا بجھا کر اسے

اوائلِ عہدِ حکومت میں اَٹیپنا کے زیر اہتمام اس تخت پر کچھ اور جواہرات وغیرہ جڑوا کر بقول صاحب مآثر الامراء "پرلے تخمینہ کے موافق) تخت مذکور کی قیمت ایک کروڑ روپیہ سے بڑھا دی" +

نوٹ نمبرا۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ باوجود تلاش بسیار اس شخص کے مزید حالات کی اطلاع نہ ہوئی

تخمینہ ٹیورنیر کی صحت کی دلیل مزید

چونکہ ٹیورنیر نے تخت طاؤس کو بعد ترصیع مزید دیکھا تھا، اس لئے بھی بمقابلہ دوسرے مورخین و سیاحان ماسبق کے ہماری رائے میں اس کا اندازۂ مصارف زیادہ وقیع، قابل ترجیح اور قرین صحت ہے +

"کوہِ نور تخت طاؤس کے مور کی آنکھ میں تعبیہ تھا یا نہیں؟"

چیمبرس انسائکلوپیڈیا (مطبوعہ و منشورۂ لندن) کی اشاعت جدید میں "ڈائمنڈ (الماس)" کے بیان میں "کوہِ نور" کی مختصر تاریخ دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

اورنگ زیب نے اس کو تخت طاؤس کے مور کی آنکھ میں جڑوا دیا تھا" +

رسالہ "حسن" حیدر آباد (دکن) کی جلد چہارم نمبرا میں مولانا تمنائی نے حقیقت الالماس کے عنوان سے ایک قابل قدر علمی و تاریخی مقالہ سپرد قلم کرتے ہوئے تذکرۂ کوہ نور کے ضمن میں تحریر کیا ہے:۔

"اورنگ زیب کے پر رعب زمانہ میں مسٹر ٹیورنیر ایک فرانسیسی مشہور سیاح نے ۲۔ نومبر ۱۶۶۵ء کو دوسرے شاہی جواہرات اور قیمتی اشیاء کے ساتھ کوہ نور کے دیکھنے کی بھی عزت حاصل کی تھی۔ اس سے پہلے کسی یورپین آنکھ کو کوہ نور کا دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ یہ گویا اورنگ زیب کی ایک غیر معمولی عنایت تھی جو اس نے ٹیورنیر کو ہاتھ میں لے کر کوہ نور کو دیکھنے اور

۷۔ ربیع الاوّل ۱۰۸۰ھ میں جہاں زیب بانو کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جو بیدار بخت کے نام سے مشہور ہوا۔ ۵۔ جمادی الاول ۱۰۸۵ھ میں دوسرا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سکندر شاں رکھا گیا۔ لیکن اس نے ۱۰۸۶ھ میں ماں باپ کو داغ جدائی دیا +

دکن میں تھی کہ ۱۰۹۶ھ میں اس کی پستان کی جڑ میں ایک دانہ پیدا ہوا۔ بہت کچھ علاج معالجہ کیا گیا۔ لیکن فائدہ نہ ہوا۔ ضخامت اور سوزش دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی۔ ایک ڈاکٹر طلب کیا گیا اس نے ایک لیڈی ڈاکٹر کے لئے جو دارالخلافہ میں موجود تھی بلانے کا مشورہ دیا۔ تاکہ اس کی مدد سے علاج کرے۔ حسب الطلب لیڈی ڈاکٹر پہنچی۔ مگر یہ معلوم کر کے کہ وہ شراب پیتی ہے بیگم موصوفتہ الصدر نے باوجودیکہ اسے بہت سمجھایا بجھایا گیا۔ گوارا نہ کیا کہ وہ اس کے جسم کو ہاتھ لگائے اور اسی وجہ سے اس ڈاکٹر کا علاج نہ ہو سکا +

وہ دو سال تک علیل رہ کر ۹۔ ذیقعدہ ۱۱۱۶ھ کو حیدر آباد میں رہگرائے عالم باقی ہوئی۔ لاش حیدر آباد سے منتقل ہو کر دہلی لائی گئی۔ جہاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے جوار میں دفن کی گئی۔ دو لاکھ روپیہ انتقال نعش، خیرات اور تجہیز و تکفین پر صرف ہوا

جہاں زیب بانو بیگم نہایت درجہ حسین ماہ پیکر اور نازک مزاج شاہزادی تھی۔ ساتھ ہی اس کے نہایت دلیر اور بہادر عورت۔ صفت بہادری میں اس خاندان کی کوئی عورت اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ وہ محمد اعظم کے ساتھ اکثر لڑائیوں کے موقعوں پر ہمراہ رہا کرتی تھی۔ اور نازک ترین مواقع پر اپنی فوج کو مدد دیا کرتی تھی ۱۰۹۵ھ میں جب سرداران بیجا پور نے محمد اعظم کا کئی ہزار سواروں سے محاصرہ کیا ہے تو شاہی فوج کی یہ حالت دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکی۔ اور فوراً تیر اندازی شروع کر دی۔ اس طرح اس بہادر عورت نے غنیم کے لشکر کے بہت سے آدمیوں کو مار ڈالا۔ اسی کے ساتھ جو امراء بد دل ہو رہے تھے ان کی ڈھارس بھی بندھائی جا رہی تھی۔ اس کی یہ پامردی بروقت بہت مفید ثابت ہوئی۔ (ماخوذ از جہاں آراء) ۱۲ +

نوٹ نمبر ۶ و ۷ ۔ جہاں آرا۔ سفرنامہ برنیر = ۱۲ +

ترصیع مزید

صریحی طور پہ تحقیق نہ ہو سکا کہ اورنگ زیب نے ان جواہرات کے حاصل ہونے سے قبل تخت طاؤس پہ ترصیع مزید کرائی یا بعد میں لیکن یہ امر محقق ہے کہ اس نے اپنے

والا دیو نہ تھا +

چیمبرس انسائکلوپیڈیا کے سوا کسی اور کتاب میں یہ امر نظر سے نہیں گزرا، اگر اس کی کچھ اصلیت ہوتی تو عالمگیر نامہ اور سیر المتاخرین میں سے کسی ایک میں اس کا تھوڑا بہت تذکرہ ضرور ہوتا اور اگر ان کے مصنفین بھی غضِّ بصر کر جاتے تو کم از کم صاحبِ "ماثر الامراء" کو جس نے ترصیعِ مکرر پر روشنی ڈالنے میں اہتمام کیا ہے۔ اس اہم واقعہ کے قلمبند کرنے میں اعتراض نہ ہوتا، علی الخصوص ڈاکٹر برنیر جو اورنگزیب کے ابتدائی دورِ حکومت میں عرصے تک اس کا طبیب خاص اور درباری رہا ہے کچھ نہ کچھ اس کے متعلق ضرور لکھتا۔ کیونکہ اس نے اپنے سفرنامہ میں اپنے زمانۂ موجودگی کی اورنگ زیبی ترمیم و تنسیخ پر برابر تبصرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں بعض بعض مورخین و محققین کے بیانات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ کوہ نور وغیرہ جیسے نادر جواہرات شاہجہاں کے حینِ حیات خود اسی کے قبضہ میں رہے اور اورنگ زیب کو اس کی وفات کے بعد ہاتھ آئے۔ چنانچہ کتاب جہاں آرا کے مصنف نے لکھا ہے:۔

جب شاہجہاں کا انتقال ہوا اور عالمگیر برسم تعزیت بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو موصوفہ نے ایک طشت زرین پیش کیا جو گرانبہا جواہرات سے مملو تھا۔ اس میں اکثر وہ جواہرات تھے جن پر شاہجہان کو ناز تھا +

ایسی صورت میں اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ اورنگ زیب نے شاہجہاں کی وفات کے بعد کوہ نور کو تخت طاؤس کے مور کی آنکھ میں جڑوا دیا تھا اور وہ اس طرح تعبیہ کیا گیا تھا کہ بآسانی نکالا بھی جا سکتا تھا اور مسطورہ بالا اعتراضات سے بھی قطع نظر کر لیں تب بھی چیمبرس انسائکلوپیڈیا کی تحریر صحیح ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ شاہجہاں نے ۱۶۶۶ء میں رحلت کی ہے اور ٹیورنیر کو ۱۶۶۵ء میں چغتائی نوادر و عجائبات کی سیر کا موقع ملا ہے +

توڑنے کا موقع دیا" ٭

مولانا نمنائی کے بیان سے فی الجملہ چیمبرس انسائکلوپیدیا کے بیان کی تردید ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اگر کوہ نور تختِ مذکور کے طاؤس کی آنکھ میں تعبیہ ہوتا تو ٹیورنیرکو اُسے تولنے کا موقع نہ ملتا۔ ادھر ہماری تحقیقات کے مطابق (جو ایجوکیشنل گزٹ، لکھنؤ بابت جنوری، فروری ۱۹۲۵ء میں بہ عنوان الماس شائع ہوئی اور جسکی تائید مذکورہ بالا انسائکلوپیڈیا سے بھی ہوتی ہے کوہ نور اور مغلِ اعظم نامی ہیروں کے حالات کو اکثر مورخین نے اس بری طرح خلط ملط کیا ہے۔ کہ ایک دوسرے میں فرق و تمیز کرنا دشوار ہوگیا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ ٹیورنیر نے کوہ نور کو تولا تھا بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس نے مغل اعظم کو تولا تھا جس سے مولانا نمنائی کے بیان کی بھی تردید ہو جاتی ہے ٭

چیمبرس انسائکلوپیڈیا کا یہ بیان بھی کہ کوہ نور کو اورنگ زیب نے تختِ طاؤس کے مور کی آنکھ میں جڑوا دیا تھا۔ واقعات کے خلاف اور صحت سے کوسوں دور ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ مور دو نہ تھے بلکہ ایک تھا۔ اور یہ امر جمہور مورخین کے خلاف ہے۔ اگر مور بھی ایک ہی فرض کر لیا جائے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک مغل بادشاہ جس کو اپنی خاندانی رسم اور اپنے عہد کے مروجہ طرز عمارت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پابند نظیر ہونا چاہیے تھا۔ کیونکر پسند کرتا کہ مور کی ایک آنکھ تو کوہ نور سے منور ہو جائے اور دوسری بے نور رہے اور اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ دوسری آنکھ میں بھی الماس مذکور کے قد و قامت، وضع قطع اور رنگ روپ کے ہم مثل ایک دوسرا ہیرا لگا کر دونوں آنکھیں روشن کر دی گئی تھیں تب بھی مور کے جثے اور اس کے تناسب و موزونیت کا خیال کرتے ہوئے اس کی آنکھوں کا ۱۸۶ ½ (یا ۱۸۶ ۱/۱۶) قیراط وزنی ہیروں کا متحمل ہونا اور ان سے اس کے حسن و خوبصورتی میں فرق نہ آنا قرینِ عقل نہیں کیونکہ وہ طاؤس یونانی خرافیات کا کوئی بڑے بڑے دیدوں

کر سکے۔ سسکتے کر وقت کی آخری گھڑیاں ختم ہوتی ہیں۔ اور یہ مجبوریوں کا شکار و نیرنگی عالم کا مجسمہ تارک اورنگ و دیہیم ثانی ابراہیم اس گوشۂ گمنامی میں ۲۶۔ رجب المرجب ۱۰۷۶ھ = ۱۶۶۶ء کو اپنی رفیقۂ حیات ممتاز محل کے مقبرے پر آنکھیں جمائے ہوئے ایک آخری سانس لیتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ؕ

مرزا محمد کاظم (صاحبِ "عالمگیر نامہ") نے اس پر عبرت واقعہ کی ایک معنیٰ خیز تاریخ کہی جو یہ ہے :-

چوں شاہجہاں خدیو قدسی ملکات ـــ برخاست بعزم عقبیٰ از تختِ حیات
جستم از عقل سال تاریخش ـــ گفتا خردم "شاہجہاں کرد وفات"

اورنگ زیب" کا آگرہ" آنا اور بہن کے ساتھ ہمدردی

اورنگ زیب نے جس وقت دہلی میں باپ کے مرنے کی خبر سنی تو اس زور سے ڈھاڑیں مار مار کر رویا کہ تمام سامعین واہل دربار کے دل بھر آئے اور فوراً آگرہ کی طرف روانہ ہو گیا[۱]۔ جہاں آرا بیگم نے اس کی آمد آمد کی خبر پا کر بڑی سرگرمی کے ساتھ استقبال کا اہتمام کیا، تمام قلعہ آراستہ کیا گیا اور موتی مسجد[۲] کمخواب کے تھانوں سے مزین کی گئی[۳]۔ اورنگ زیب" آگرہ" پہنچکر قلعہ کے باہر داراشکوہ کی حویلی میں فروکش ہوا۔ اور دوسرے دن بیگم صاحبہ کے پاس تعزیت کی غرض سے گیا اور اس کے بعد بھی اس نے کئی مرتبہ دل شکستہ بہن کے یہاں جا کر اس کی تسلّی و تشفی کی[۴]۔ اس زمانہ میں وہ بیگم صاحبہ سے اس قدر خوش ہوا کہ ایک دن تمام درباریوں، امراءٔ اعیانِ سلطنت کو حکم دیا کہ وہ سب ممدوحہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہو کر نذریں پیش کریں[۵]۔

نوٹ نمبر ۱ و ۳ تا ۵ ۔ جہاں آرا اور سفرنامہ برنیر = ۱۲ +
نوٹ نمبر ۲ ۔ موتی مسجد ۔ (دیکھو حاشیہ نمبر ۵ صفحہ نمبر ۳۶) +

نوٹ نمبر ۱۔ کوہ نور۔ (دیکھو حاشیہ نمبر ۴ از حواشی صفحہ ۱۰۷) +

نوٹ نمبر ۲۔ مغل اعظم۔ یہ ہیرا ۱۶۵۰ء میں کلور کی معدن سے جو علاقہ گولکنڈہ میں پرنیال سے ۲۴ میل کے فاصلہ پر واقع ہے برآمد ہوا تھا۔ بظاہر میر جملہ کے ہاتھوں سلاطین مغلیہ تک پہنچا۔ یہ مدور گلاب نما تراشا گیا تھا۔ اس کا وزن ۲۸۰ قیراط تھا۔ اس پر بعض مورخین نے کوہ نور کا دھوکا کھایا ہے۔ ۱۷۳۹ء میں دلی کی لوٹ مار کے موقع پر اسے نادر نے توڑ ڈالا اور یہ ورطہ گمنامی میں پڑ گیا۔ اس کا یہ نام انگریزی تاریخوں میں گریٹ مغل دیکھنے میں آیا ہے۔ جس کا یہ ترجمہ کیا گیا۔ میرے خیال میں یہ وہ ہیرا ہے جو اس زمانہ میں کوہ طور کہلاتا تھا۔ (ایجوکیشنل گزٹ فروری ۱۹۲۵ء میں شائع شدہ ذاتی مضمون "الماس" سے اخذ کیا گیا) +

نوٹ نمبر ۳۔ قیراط۔ معرب ہے "کریٹو" سے جو یونانی لفظ ہے "کیرب (carab) سے بنا ہے یہ مٹر کے برابر اور اس سے مشابہ ایک پھل تھا۔ جو گھونگچی کی طرح سونا اور جواہرات جیسی بیش قیمت اشیاء تولنے کے کام آتا تھا۔ شدہ شدہ یہ ایک وزنِ خاص کا نام ہو گیا جو چار گرین کے برابر ہوتا ہے۔ اس کا وزن مختلف ممالک میں مختلف ہوتا ہے۔ بین الملی (انٹرنیشنل) وزن ۳ ۱/۲ گرین کے برابر ہے۔ ہمیں قیراط کو رتی کے برابر تصور کرنا چاہیئے (المنجد مطبوعہ بیروت اور ٹوائینٹی انٹیتھ سنچری ویبسٹری ڈکشنری) = ۱۲ +

رحلتِ شاہجہاں

وہ شاہجہاں جس نے جامع مسجد (دہلی) بنوائی، وہ شاہجہاں جس نے تاج محل (آگرہ) کی تعمیر کی، وہ شاہجہاں جس نے دلی کو نئے سرے سے ترتیب دیا، وہ شاہجہاں جس نے تختِ طاؤس پر جلوس کیا۔ اور جلوس بھی وہ جلوس کہ جس کے باعث رعب و سطوتِ شاہی کا دریا حاضرینِ دربار کے قلوب میں لہریں لینے لگا۔ وہ شاہجہاں جو اس عالم میں بھی اپنے خدا کو نہ بھولا۔ مگر وہ شاہجہاں جس نے حصولِ سلطنت میں اپنے خاندان کے کتنے ہی چشم و چراغ بجھائے دنیا سے جاتا ہے تو کس طرح؟ دارالمکافات کی ایک تصویر مجسم بن کر۔ عمر کا آخری حصہ ہے، ایک مسجد کا حجرہ ہے، چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے اور ہُو کا عالم ہے، آٹھ سال تک قید اور تنگ زیستی میں جھینک جھینک

خزائن و دفائن پر قابض و متصرف تھے۔ جس کے باعث ان کی ظاہری شان و شوکت میں کمی نہ آنے پائی تھی۔ مگر درحقیقت مغلیہ رعب، سطوت، ہیبت و ہیبت عرصہ ہوا کہ ختم ہو چکا تھا اور نظام سلطنت مختل۔ ہر طرف اضمحلال و انحطاط نمودار تھا۔ صوبہ دار خودسر ہو گئے تھے۔ اور مرکزی حکومت کا قبضہ ان پر برائے نام بھی نہیں رہا تھا۔ بادشاہ تھا مگر بدشاہ شطرنج "کہ کٹ پتلی کی طرح ذی اختیار منصبداروں کے ہاتھ میں کھیلتا تھا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ بغاوتیں رونما ہوئیں، شورشیں پھیلیں اور بالائے غضب یہ ہوا کہ "مغلانِ سلف" نے جن اغیار کو جانکاہ کوششیں اور حوصلہ شکن محنتیں کرکے اتنا مرعوب و خوفزدہ کر دیا تھا کہ وہ آنکھ بھر کر "سلطنتِ مغلیہ" کی طرف دیکھ نہ سکتے تھے ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئیں کہ انہوں نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور گھر والوں نے مدد دے کر انہیں اور شیر بنا دیا +

خروج نادری

ٹھیک اسی زمانہ میں جبکہ فرمانروایان مغلیۂ ہند خانہ جنگیوں، عیش پرستیوں اور غفلتوں کا شکار ہو رہے تھے۔ اور ان کے بخت خوابیدہ پر بدنصیبی و بداقبالی مستولی تھی۔ سرزمین ایران میں نادر قلی معروف بہ نادر شاہ درانی کا نصیبہ جاگا اور اس کے نجم اقبال نے دنیا میں چکا چوند ڈال دی +

نوٹ نمبر ا۔ نادر قلی۔ نادر قلی نام، امام قلی گڈرئے کا بیٹا تھا۔ جو سنہ ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوا۔ انتہائی افلاس کے باعث ابتدائی حالات پردہ خفا میں ہیں۔ سترہ برس کی عمر میں اپنی ماں کے ساتھ ازبکوں کی قید میں پڑا اور اسی وقت سے صفحات تاریخ میں نمایاں ہوا +

نادر ۴ برس کے بعد ازبکوں کی قید سے نکل کر بھاگا۔ اور اپنے ملک کے ایک امیر بابل بیگ کا ملازم ہوا۔ چند سال بعد اس کو قتل کرکے اس کی بیٹی کو بھگا لے گیا۔ اور مدتوں رہزنی کرتا رہا۔ یہی قزاقی اس کی شہرت کا باعث ہوئی۔ اور شاہ طہماسپ صفوی فرمانروائے ایران نے اس کو سپہ سالار افواج خراسان مقرر کر دیا۔ کچھ دنوں بعد اس کے بڑھتے ہوئے زور سے خوفزدہ ہو کر

تختِ طاؤس کا ضرورتاً آگرہ پہنچنا

اسی قیام کے دوران میں "عید الفطر" آئی اور اورنگ زیب ایک بلند و خوبصورت ہاتھی پر سوار ہو کر جامع آگرہ میں نماز کے لئے گیا۔ بعد ادائے دوگانۂ عید اس نے نہایت دھوم دھام کے ساتھ دربار کیا۔ اور بڑی شان و شوکت کے ساتھ تخت طاؤس پر جو کچھ عرصہ پیشتر اسی غرض سے آگرہ منگایا گیا تھا جلوس کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس تخت پر دار الخلافہ آگرہ میں رونق افروزِ دربار ہوا[۱]۔

مذکورہ بالا جشنِ عیدِ سعید تین دن تک منایا گیا۔ اس موقع پر اورنگ زیب نے ایک لاکھ اشرفیاں بیگم صاحبہ کو نذر کیں اور ان کی جاگیر میں اضافہ کر کے انہیں "بادشاہ بیگم" کے خطاب سے معزز فرمایا[۲]۔

نوٹ نمبر ۱ و ۲ - جہاں آرا اور سفرنامہ برنیر = ۱۲

دولت مغلیہ کی حالتِ زار

اورنگ زیب کے بعد اورنگ گورگانیہ کو کوئی ایسا بادشاہ میسر نہیں آیا جس کو اسلاف تیموریہ کی طرح تاج شاہی زیب دیتا۔ مغل بادشاہ بجائے "شہنشاہ مغل" کے "بندۂ عیش" رہ گئے۔ نہ کسی میں ہمایوں کی سی جفاکشی رہی نہ اکبری اولعزمی نہ کسی میں جہانگیر کا اقبال باقی رہا نہ شاہجہانی جوہر مردم شناسی و للّٰہیت اور نہ اورنگ زیب کا تدبر۔ قصہ مختصر اسلاف کی بنائی ہوئی شاہراہِ حکومت پر رخشِ حکمرانی کو جولاں کرنے کا سلیقہ ہی نہ رہا۔ خیالات کی پستی، علوئے ہمتی کے فقدان اور عقل کی تیرگی کا جلوہ ہر ہر شے میں نظر آنے لگا۔ تاہم محمد شاہ المعروف بہ "رنگیلا" کے عہدِ سلطنت تک خانہ زادانِ قدیم کاروبارِ سلطنت سنبھالے ہوئے تھے اور بادشاہ اپنے آبائی تحائف و نفائس اور خاندانی

"تختِ طاؤس" کا "نادر" کے قبضہ میں پہنچنا

فتحمند نادر نے قرۂ باصرۂ سلطنت یعنی" بنت محمد شاہ" کا عقد اپنے بیٹے مرزا نصر اللہ مرحوم سے کیا۔ اور ستاون۔ اٹھاون دن قیام کرنے کے بعد دہلی و اودھ کے امراؤ شرفا کا تمام اندوختہ مال و متاع اور وہ کل دولت جسے عہدِ بابری یا دو صد سالہ مدت سے سلاطین مغلیہ جمع کرتے چلے آئے تھے، شاہی تاج، سلطانی تخت، بیگمات کے مرصع زیورات، خزانۂ ہندوستان کے چشم و چراغ کوہ نور و تخت طاؤس عمدہ سے عمدہ ہاتھی، نفیس ترین گھوڑے، بہترین توپیں اور بیش قیمت اطلس و کمخواب غرض ستر کروڑ (۷۰۰۰۰۰۰۰) روپیہ کے قریب کا نقد و جنس لے کر ایران کو مراجعت کی +

نوٹ نمبر ۱۔ "نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی" از سید آغا حیدر (شائع شدہ رسالہ "حسن" دکن نمبر ۱۱ جلد ۳، ۱۲ = +

نوٹ نمبر ۲۔ تاریخ ہند اسمتھ حصہ سوم اور "نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی"

فہرست مال مغرونۂ نادر بقول منشی سعید احمد مارہروی مصنّف امرائے ہنود"

(بحوالہ کاغذات دفتر انشا بھوپال)

نقد از خزانۂ سلطنت ۸ کروڑ ۵۰ لاکھ۔ جواہرات از جواہر خانۂ شاہی ۱۵ کروڑ۔ آلات طلائی ایک کروڑ ۵۰ لاکھ۔ "تخت طاؤس" و اسباب متفرق واز خوشبوخانہ، باورچی خانہ، قورخانہ فراش خانہ، و آبدار خانہ ۱۵ کروڑ۔ متفرق جواہر و نقد ۴۰ لاکھ۔ از آصف جاہ نظام الملک ۴ کروڑ۔ پیشکش نواب ابوالمنصور خاں ۲ کروڑ۔ از ضبطی خانۂ خان دوران خاں و مظفر خاں میر آتش ۲ کروڑ ۷۰ لاکھ۔ از نواب محمد خاں بنگش ۲ لاکھ ۷۵ ہزار۔ از لطف اللہ خاں داروغہ جواہر خانہ ۹ لاکھ۔ از وزیر الممالک نواب قمر الدین خاں ایک کروڑ۔ از شیخ سعد اللہ دیوانِ تن ۳ لاکھ پچاس ہزار۔ از رائے خوشحال چند پیشکار بخشی گری ۲ لاکھ پچاس ہزار۔ از نوند رائے ۲ لاکھ ۵۰ ہزار۔ از سبحان رائے ۲ لاکھ ۷۵ ہزار۔ از متصدیان دفتر عمائد شہر ۲ کروڑ۔ معرفت راجہ مہا نرائن برائے خلعت صوبۂ اودھ ۲ کروڑ۔ از راجہ ناگرمل دیوانِ خالصہ ۳ لاکھ۔ از سیتا رام خزانچی ۲ لاکھ ۵۰ ہزار۔ میزان کل ۵۲۲۸۶۰۰۰۰

بقول مسٹر ولیم اردن۔ ظروف نقرئی و طلائی ۲۰ کروڑ۔ جواہرات ۲۵ کروڑ۔ "تخت طاؤس"

بادشاہ نے اس کو تاج و تخت پیش کیا۔ مگر نادر نے مصلحتاً انکار کر دیا آخرکار صفوی خاندان کے خاتمہ پر وہ بادشاہ بن بیٹھا۔ اور نادر شاہ کے نام سے سکہ چلایا۔ اس کے سکہ پہ یہ شعر مسکوک تھا ؎

نادرم در ملک ایران قادرم بر سر دیار   لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

بادشاہ بننے پر سب سے پہلے قوم افغان کو اپنا رفیق بنایا۔ جس کے آخر تک اس کے مخالف رہے۔ اسی قوم کو بھگاتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ ہندوستان کو لوٹ کر اور محمد شاہ کو تاج و تخت بخش کر ایران کو مراجعت کی۔ آخر میں وہ بہت بد مغز، مغرور، جابر اور شکی مزاج ہو گیا تھا۔ اپنی ایرانی فوج سے مشتبہ ہو کر اس نے سب کے قتل کرا دینے کا منصوبہ باندھا۔ مگر قبل از وقت راز طشت از بام ہو گیا۔ اور وہ امرائے ایران کی سازش سے ۱۷۴۷ء میں قتل کر دیا گیا + (ماخوذ از بڑی جنتری)

نہبِ نادری

۱۷۳۹ء میں اس مشہور و معروف فاتح نے سلاطین مغلیۂ ہند کی کمزوری و عیش پرستی اور نظام سلطنت کے اختلال و اضمحلال سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کی طرف عنانِ توجہ مبذول کی محمد شاہ رنگیلے کو ہزار بار چونکایا، بہت کچھ جھنجوڑا لیکن مست الست بادشاہ نے کروٹ تک نہ لی۔ چونکا بھی تو اس وقت جب کار از دست رفتہ و تیر از کمان جستہ کا مضمون صادق آچکا تھا۔ اور سرزمین ہند زبانِ حال سے نوحہ کناں تھی۔ ع

"یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد"

فتح نصیب نادر کی فوجیں دلی تک دراتی چلی آئیں اور وہ گلزار دہلی جس نے نخلبندانِ بستان دولتِ تیموریہ ہند کے زیر سایہ سینکڑوں بہاریں دیکھی تھیں۔ خزاں نادری کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہ لا سکا، مادر ہند کے ہزاروں سپوت نادر شاہی قزلباشوں کی تیغ بیدریغ کی بھینٹ چڑھ گئے۔ لاکھوں بے خان و مان ہوئے اور بہتوں کو انقلابِ روزگار نے خاک میں ملا دیا۔ عروس البلاد دلی لٹ کھسٹ کر ایک اجڑا دیار بن گئی +

قول کی تردید کرتا ہے کہ

چونکہ تخت طاؤس کے پرزے علیحدہ علیحدہ تھے۔ اس لئے نادری لوٹ مار کے موقع پر اس کے مختلف پرزے مختلف مقامات پر چلے گئے[۲]+

اگر یہ صحیح ہوتا تو یہ تخت نمائش ہرات میں کیونکر رکھا جاتا؟ حقیقت یہ ہے کہ ایران میں نادر کے قتل کے بعد جو اس کے جانشینوں کے عہد میں شورشیں بپا ہوئیں ان میں (جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے) یہ تخت ضرور پاش پاش ہو گیا تھا۔ اسی واقعہ کو لائق مورخ نے اس انداز سے بیان کیا ہے۔ مورخ مذکور کے بیان کے موافق تو دنیا میں اس تخت کا وجود ہی نہیں۔ حالانکہ اگلے واقعات بتلائیں گے کہ بوجہ وہ موجود ہے اور بوجہ عدیم الوجود +

نوٹ نمبر ا۔ نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی از سید آغا حیدر صاحب حسن دکن ۱۲ = ۱۲ +

نوٹ نمبر ۲۔ پیٹر مغل = ۱۲ +

"نادر" کا جشنِ فتح وفیروزی ہند منانا

مسطورہ[۱] بالا نمائش کے دوران میں "جشن فتح وفیروزی ہند" بھی منایا گیا تھا۔ یہ جلسہ ۴۔ جون ۱۷۴۰ء سے شروع ہو کر کئی دن تک رہا۔ درباری عیش کرتے تھے۔ سپاہی ناچ رنگ میں مشغول تھے۔ ہر طرف سے صدائے رقص وسرود بلند تھی۔ ہر شخص نے اپنے مقدور بھر عیش وعشرت کے سامان مہیا کئے تھے۔ غرض اتنا بڑا جشن شاہی اور ایسے اعلےٰ پیمانہ پر شاندار نمائش ہوئی۔ کہ اس کی شہرت دور دور تک پہنچی[۲] +

نوٹ نمبر ا۔ ایرانی کیا عالم کیا جاہل سب کے سب عجیب الخلقت جانور "ہاتھی" کے دیکھنے کے بیحد مشتاق تھے۔ کیونکہ انہوں نے اب تک اس جانور کی صرف تصویر ہی دیکھی تھی۔ اس نمائش میں پہلا موقع تھا کہ انہوں نے اس کا برائے العین مشاہدہ کیا ارشاد حسن

نوٹ نمبر ۲۔ نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی = ۱۲ +

دوسرے ۹ تخت اور ظروفِ مرصع ۹ کروڑ۔ بیش قیمت سامان ۲ کروڑ۔ توپیں اور سامان ارائش ۴ کروڑ +

ماخوذ از مینوے۔ ہاتھی ۳۰۰ زنجیر۔ گھوڑے ۱۰ ہزار۔ اونٹ ۱۰ ہزار مہار۔ (کل میزان ستر (۷۰) کروڑ نقد وجنس ۲۰۳۰۰ جانور)

بحوالہ انندرام مصاحب دیوان اودھ۔ جواہرات جن میں تخت طاؤس بھی شامل تھا پچاس کروڑ۔ زربفت وغیرہ ایک کروڑ۔ اشرفیاں اور روپیہ نقد ایک لاکھ اور چند ہزار۔ کل ۶۰ کروڑ ایک لاکھ کچھ ہزار (یہ اقوال لیٹر مغل سے ماخوذ ہیں)+

نمائشِ ہرات اور اس میں "تخت طاؤس" کا رکھا جانا

واعبرتاہ!! دنیا نام ہے نمونہ ہائے رنگا رنگی کا، آہ!! اس قیامت خیز منظر کو فلک کج مدار کی کس ادا سے تعبیر کیا جائے کہ بھیڑوں کا چرانے والا، جنگل جنگل گھومنے والا چھپ چھپکر یا دن دہاڑے سینہ زوری کرنے اور ڈاکے ڈالنے والا نادر جس کی سو پشتوں نے بھی کبھی سلطنت کے خواب نہ دیکھے ہونگے زمانہ کی گردشوں کی بدولت عروس البلاد دہلی کو لوٹ مار کرتا ہے۔ اور تمام مال ومتاع اور خزائن وجواہر منہوبہ کی نمائش ہرات میں کرتا ہے۔ یعنی نادر کی واپسی ہندوستان کے بعد ۱۱۔ مئی ۱۷۴۰ء کو ہرات میں تمام جواہرات اسباب، نادرات ونفائس ہند آراستہ پیراستہ ہوتے ہیں اور وہ تخت طاؤس بھی رکھا جاتا ہے۔ جو ایک دنیا کے لئے اعجوبۂ روزگار صنعت ثابت ہؤا۔ اور جس پر جلوس کرکے شاہجہاں نے حضار پر اس قدر ہیبت بٹھائی کہ ان پر عالم عبودیت طاری ہوگیا اور جس نے عقلائے دہر کو محو حیرت کردیا۔ اور اب نادر کے ہاتھ پڑکر نہیب وغارت کی فہرست میں شامل ہوچکا ہے۔ یہ نمائش کیا تھی؟ ہندوستان کی لوٹ مار کے خزانوں کی نمود تھی۔ ورنہ حسنِ ترتیب کی آرائش وزیبائش معلوم +

تخت مذکور کا اس نمائش میں رکھا جانا اس عہد کے مشہور مورخ ولیم ارون کے ہاں

نفاست پسندی وجدت طرازی کا مجسمہ شاہان مغلیہ ہند کا سرمایۂ ناز اور اقوام عالم کو اپنا شائق دیدار بنا کر ہندوستان کی طرف کھینچ کر لانے اور اپنے جلوے سے مبہوت و متحیر بنا دینے والا تخت طاؤس بھی پارہ پارہ ہو گیا۔ چنانچہ لارڈ کرزن آنجہانی نے اپنی کتاب پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن میں اس تخت پر تبصرہ کرتے ہوئے خراسان نامی کتاب سے اس کے مصنف مسٹر فریزر کا مندرجہ ذیل قول نقل کیا ہے۔

"۱۸۲۲ء میں مجھ سے ایک معمر و سن رسیدہ کُرد نے بیان کیا تھا" جب نادر شاہ قتل ہوا اور اس کا کیمپ لوٹا گیا تو تخت طاؤس اور اس کا طلائی چھتر ہمارے ہاتھ آیا تھا۔ جس کو فوراً ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم نے آپس میں تقسیم کر لیا تھا"۔

یہی واقعہ ہے۔ جس کو ولیم ارون نے شورش دہلی (بزمانِ نادر) کے ضمن میں لکھا ہے۔

پارہ ہائے "تخت طاؤس" کا بانی دولتِ قاچاریہ کے ہاتھ آنا
اور
ان ٹکڑوں کا نئی شکل میں متشکل ہونا

۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۵ء میں آقا محمد خان قاچار (بانی دولتِ قاچاریہ) نے لطف علی خاں زند کو جو نادر کا ایرانی جانشین تھا۔ شکست فاش دیکر اس تخت کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے اس سے جبراً چھین لئے اور بقول بعض ان ٹکڑوں کو موزونیت کے ساتھ باہم وصل کرا کے ایک نئے طرز کا تخت بنوایا تھا۔ لیکن شاہ موصوف کا ترتیب جدید دلانا محقق نہیں البتہ مرزا نصر اللہ خاں "فدائی" دولت یار جنگ بہادر کے مندرجہ ذیل بیان سے یہ

قتل نادری

نادر کے ظلم وستم اور سخت گیری ولا مذہبی سے تنگ آکر اس کے ارکان دولت نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ جس میں چند سرداروں نے اس کے قتل کا بیڑا اٹھایا اور وہ ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء کی ایک رات کو اپنی فوج محافظِ تن (Body guard) کمانڈر صالح بیگ کی ضرب کاری سے معمولی مقابلہ کے بعد اس گہری نیند کا شکار ہوا کہ جس سے "بغیر حشر کے ممکن نہیں جگا لینا" کسی نے تاریخ وفات کہی" فی النار والستقر مع الجد والپدر" جو نادر کے متعلق خیالات کا آئینہ ہے +

نوٹ نمبرا۔ قاموس المشاہیر اور" نادر اور اس کی تعجب انگیز کامیابی" = ۱۲ +

نادر کے بعد ایرانی خانہ جنگی

نادر کے مرتے ہی فارس اور اس کے ممالک محروسہ میں خاصی بدنظمی پھیل گئی چاروں طرف سے دعویداران سلطنت اٹھ کھڑے ہوئے۔ افغانستان میں ابدالی، غلزئی، بلوچی، ہزارہ اور قزلباش جرگوں کے اتفاق سے احمد خاں نے جو ابدالی خاندان کا رکن رکین تھا احمد شاہ ابدالی کے لقب سے طرح حکومت ڈالی اور ایران میں نادر کے مخالفِ اعلےٰ کا بھتیجا عادل شاہ تخت نشین ہوا +

نوٹ نمبرا۔ تاریخ اسلام مصنفہ مولوی احسان اللہ عباسی = ۱۲ +

تخت طاؤس کا پارہ پارہ ہونا

اس خانہ جنگی کے اثر سے سلطنت کی طرح اسباب دارکانِ سلطنت بھی خالی نہ رہے۔ چنانچہ ایشیائی صنعت وہندوستانی دستکاری کا بہترین نمونہ شاہجہان کی

اس نے ۱۹۰۶ء میں اپنے بیٹے محمد علی شاہ کو حکومت اور رعایا کو پارلیمنٹ عطا کی۔ پارلیمنٹ نے محمد علی کو معزول کر کے اس کے نابالغ بیٹے احمد شاہ کو ۱۹۱۲ء میں تخت نشین کیا۔ یہ ۱۹۲۵ء میں سیاحت یورپ کے لئے گیا ہوا تھا۔ اور پیرس میں مقیم تھا کہ اس کے عیاشانہ رویہ سے ناراض ہو کر ایرانی پارلیمنٹ نے ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو اُسے معزول کر دیا اور شہنشاہ رضا خان پہلوی (بانی حکومت پہلویہ) بادشاہ ایران تسلیم کر لئے گئے۔ گویا خاندان قاچار کے سات بادشاہوں نے ۱۲۰ سال تک حکومت کی ؛ (اورینٹیل پیل)=۲

نومرتب تخت کی موجودہ حالت

بہرحال یہ نومرتب تخت لارڈ کرزن آنجہانی کے بیان کے موافق ایرانی شاہی خاندان کے محلات کے نئے عجائب خانہ واقع طہران (پایہ تخت ایران) میں رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ مذکورہ بالا کتاب میں اس تخت کے حالات کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں۔

آج کل اس تخت کے صرف کچھ حصے باقی رہ گئے ہیں۔ جو کہ ٹیورنیر کے تحریر کردہ مفصل حالات کا جزو ہیں۔ چھتری کا نام و نشان نہیں ہے۔ نہ یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ موجودہ تخت میں چھت کسطرح لگی ہوئی تھی مو بھی معدوم ہیں ؛

چونکہ مذکورہ بالا نومرتب تخت، قدیم تخت طاؤس کے اجزاء اور اصلی صنعت و کاری گری کے بیشتر حصص پر مشتمل ہے اور مجازاً جزو کا استعمال کل پر روا ہے۔ اس لئے اس تخت کو بھی "تخت طاؤس" ہی کہنا چاہئے +

چند اور ٹکڑوں کا انکشاف

منشی سعید احمد مارہروی اور دیگر معتبرین سے معلوم ہوا کہ کسی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ اس تخت کے کچھ ٹکڑے سلطنت عثمانیہ (ٹرکی) اور زاران روس کے قبضہ میں بھی تھے اور ٹرکی والے ٹکڑے انقلاب ٹرکی کے بعد فروخت کیلئے فرانس بھیجے گئے تھے

تخت طاؤس کے رقیب شہرت

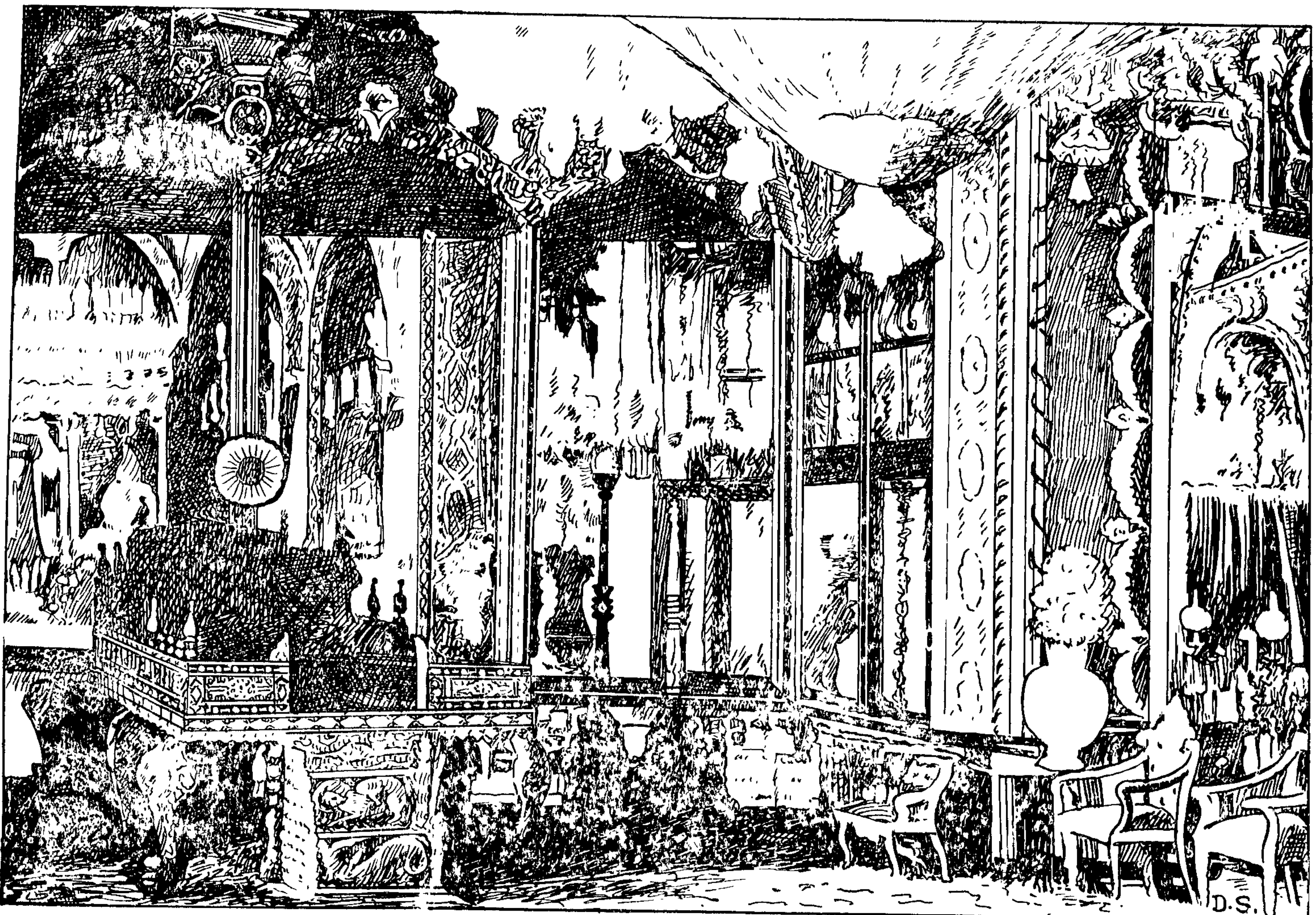
دنیا میں کئی تخت "تخت طاؤس" کے نام سے موسوم ہوئے۔ جن میں سے بعض نے تو اکثر اہل نظر کو دھوکا دیکر اس کی قدر و منزلت بھی حاصل کر لی۔ تاہم نظر بازوں

امر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دولت قاچاریہ کے چوتھے تاجدار ناصر الدین شاہ، قاچار نے ضوران اجزاء کو باہمد گر پیوست کرا کے ایک نئی شکل میں متشکل کیا ہے۔ چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

از چیزہائے تازہ کہ شاہجہاں ساخت تختے بود از کومید و دیگر گہرہائے شاہوار کہ آنرا "تخت طاؤس" گویند شش کرور و نیم پول ہند (بست و شش کروڑ تومان ایران) در ساختن آں بکار رفتہ است آں تخت با چندیں پارچہ ہائے نامور دیگر بدست نادر شاہ افتاد و او آنہا را بہ ایران بردو آں تخت درآں کشور از پرتو افسر شہنشاہ خورشید کلاہ ناصر الدین شاہ قاچار آرائش دیگر گرفتہ +

("داستان ترکتازان ہند"۔ حصہ دوم صفحہ ۵۸۶)

نوٹ نمبر ۱۔ آقا محمد خان قاچار۔ فارس کا بادشاہ جو خاندان قاچار سے تھا یہ محمد حسین خان قاچار حاکم ماژندران کا بیٹا تھا۔ عادل شاہ جانشین نادر نے بزمانۂ طفولیت اسکو اپنے خواجہ سراؤں میں داخل کر لیا تھا۔ اس کے مرنے پر یہ اپنے باپ کے پاس پہنچ گیا۔ اس کے باپ کو کریم خاں ژند بادشاہ وقت نے قتل کرا دیا اور آقا محمد خان نے خود کو اس کے حوالہ کر دیا۔ بادشاہ نے اسے شیراز میں قید کر دیا۔ مدتوں شہر سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ملی، پھر صرف شکار کے لئے اجازت مل گئی۔ ایک دن کریم خان کی علالت کے زمانہ میں شکار کے حیلہ سے فرار ہو گیا۔ اور ماژندراں جا کر دم لیا۔ اور تخت فارس کے مدعی ہونے کا اعلان کر دیا۔ ۱۷۸۰ء میں علی مردان خاں بادشاہ وقت کے فوت ہونے پر خاموشی کے ساتھ اصفہان پر قابض ہو گیا۔ اور لطف علی خان آخری فرمانروائے خاندان ژند سے کئی برس تک معرکہ آرا رہنے اور ۱۷۹۵ء میں اس کو قتل کرنے کے بعد شاہ ایران بن گیا۔ اور ۲۰ سال تک فارس کے بڑے حصہ پر حکومت کر کے ۶۲ سال کی عمر میں ۱۷۹۷ء میں دو ملازموں کے ہاتھ سے جن کو پھانسی کا حکم دیا تھا قتل ہوا۔ گویا وہ خاندان قاچاریۂ فرمانروائے ایران کا مورث اعلیٰ تھا۔ فتح علی شاہ جو اس کا بھتیجہ تھا اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ۱۸۳۴ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد محمد شاہ بن عباس مرزا تخت نشین ہوا۔ جو ۱۸۴۷ء میں راہی ملک بقا ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ناصر الدین شاہ کجکلاہ بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد مظفر الدین شاہ



تخت طاؤسي کا منظر (” گلستان محل “ طہران ص۰۰)

سے اصلیت پوشیدہ نہ رہی اور انھوں نے تاڑ لیا کہ فریبی چیزے دگر و اماس چیزے دگر است +

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "تخت طاؤس" کے رقیبانِ شہرت کے مختصر حالات بھی قلمبند کر دیے جائیں +

تخت طاؤس ساختہ بہادر شاہ اوّل یا اکبر شاہ ثانی

۱۔ تخت طاؤس ساختہ بہادر شاہ ثانی یا اکبر شاہ ثانی شہنشاہ ہند۔ اس تخت کو ان دونوں بادشاہوں میں سے کسی ایک نے بنوایا تھا۔ اور گو ایسا زیادہ بیش قیمت اور بے مثل صنعت و سنگکاری کا نمونہ نہ تھا۔ تاہم بیحد نفیس اور بہت اچھا تخت تھا +

ہم اس سے قبل عنوان "تخت طاؤس کی تصویر" کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں کہ عرصہ ہوا جب اس کی ایک قلمی تصویر قلعہ معلّٰے دہلی میں موجود تھی۔ جس کو لوگ غلطی سے مدتوں شاہجہانی تخت طاؤس کی شبیہ سمجھا کئے۔ اب یہ تصویر بھی معدوم ہے۔ البتہ اس کی عکسی تصویر یون اگزیبیشن آف اینٹی کوئیٹر کارونیشن دربار ۱۹۱۱ء نامی کتاب کے صفحہ ۱۵۲ پر موجود ہے۔ جو یہ بتاتی ہے کہ یہ تخت اصلی تخت سے بہت کچھ مشابہ ہوگا بھوپال کے کاغذاتِ "دفتر انشا" کے حوالہ سے جو منشی سعید احمد صاحب مارہروی صاحب "امرائے ہنود" نے نادر کے مال مغروقہ و منہوبۂ ہند کی ایک فہرست "امرائے ہنود" میں دی ہے۔ اس میں تخت طاؤس کے علاوہ نو (۹) اور دوسرے تخت بھی لکھے ہیں جو نادر ایران لے گیا تھا۔ اس لئے خیال ہوتا ہے کہ شاید ان میں یہ بھی شامل ہو۔ بہرحال اس کے حالات قطعی تاریکی میں ہیں۔ اور اس کو معرض بحث میں لانا بالکل فضول ہے +

نوٹ نمبر ۱۔ دیکھو حواشی ۲ صفحہ ۱۵۲

تخت طاؤسی ساختہ فتح علی شاہ قاچار

۲۔ تخت طاؤسی ساختہ فتح علی شاہ قاچار فرمانروائے ایران:۔ اس تخت کو شاہ موصوف نے اپنی نئی اور چہیتی حرم طاؤس خانم کے نام سے منسوب کرکے بنوایا تھا۔ یہ بہت معمولی اور کم قیمت تخت ہے۔ اس کی تصویر مشہور انگریزی اخبار السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کی اشاعت ۱۵۔ ستمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اور جیسا کہ ہم اس سے قبل "تصویر تخت طاؤس" کے تحت میں ذکر کر آئے ہیں بک آف نالج میں بھی موجود ہے۔ اس تخت کو بقول لارڈ کرزن آنجہانی اصلی تخت طاؤس سے بجز علاقہ ہمنامی کے کوئی نسبت نہیں۔ ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

یہی وہ تخت ہے جس کو تخت طاؤس کا حقیقی رقیب شہرت کہنا چاہئے اور اس تخت نے لوگوں کو بعید مغالطہ میں ڈالا ہے۔ چنانچہ بمبئی کے چند اولوالعزم پارسی سیاح جنہوں نے بسواری سائیکل دنیا کے سفر پر کمر ہمت باندھی، اپنے سفر کے دلچسپ روزنامچہ کا ایک حصہ انڈین نیشنل ہیرلڈ نامی صحیفہ میں شائع کرتے ہوئے اسی تخت کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

"ہم نے بادشاہ کا محل دیکھا جو بالکل عجائب خانہ ہے۔ نادر کا لایا ہوا تخت طاؤس یہاں موجود ہے"

ایک اور انگریز سیاح، اخبار فیلڈ میں لکھتا ہے:۔

"آخر ہم خزانۂ شاہی تک پہنچ گئے۔ مقفل کمرہ پر مہر لگی ہوئی تھی مہر توڑ کر قفل کھولا گیا۔ اور دروازہ کھلا تو سامنے دستکاری اور مینا کاری کا وہ عبرت انگیز نمونہ دھرا تھا۔ جسے "تخت طاؤس" کہتے ہیں۔ تخت طاؤس

"یہ تخت طاؤس" درباری کمرے کے آخر میں رکھا گیا اور اس کے بالمقابل "تخت نادری" آراستہ کیا گیا اور اسی پر "رضا خاں" کی تاجپوشی عمل میں آئی۔

دراصل بقول مسٹر میلکم اس زمانہ کی ایرانی بدامنی و جنگ و جدل کے باعث حالات ہی فراہم نہ ہو سکے۔ جن سے یہ پتہ چلتا کہ بعد کا بنا ہوا تخت اس "تخت طاؤس" کی نقل ہے جس کا ذکر "نوٹ نمبر۵" نے کیا ہے۔

نوٹ نمبر۱۔ یہ تصویر، اتمام کتاب اور تکمیل مقدمہ کے کئی ماہ بعد جبکہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول مین پوری کو تبدیل ہو چکا ہوں۔ ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوئی تھی اور مسٹر سری چند گوس بی اے ایل ٹی اور خواجہ حمید الدین سی ٹی کی عنایتوں کی بدولت میری نظر سے گزری تھی۔ ضروری سمجھ کر میں نے کتاب ہذا میں ذکر کر دیا۔ یہ وجہ ہے کہ تاریخ مقدمہ نگاری و تاریخ اشاعت تصویر میں اختلاف ہو گیا ہے۔

نوٹ نمبر۲۔ "ترجمان" اخبار جھانسی۔ مورخہ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۲۱ء۔

نوٹ نمبر۳۔ آگرہ اخبار مورخہ ۷۔ نومبر ۱۹۲۶ء = ۱۲۔

نوٹ نمبر۴۔ دیکھو حاشیہ نمبر۶ صفحہ نمبر۱۴۷ پر حالات رضا خان = ۱۲۔

نوٹ نمبر۵۔ پرشیا اینڈ دی پرشین کوسچن = ۱۲۔

"تخت طاؤس" ساختہ نادر

۳۔ تخت طاؤس ساختہ نادر شاہ:۔ سر میلکم موصوف کے بیان کے موافق نادر شاہ تخت طاؤس کا اتنا شائق تھا کہ اس نے اس کی ایک اور ہوبہو نقل دوسرے جواہرات میں بنوائی۔ مورخ موصوف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تخت بھی نادر کی قتل والی شورش میں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:۔

"اس طرح اس کی موت اور گزشتہ دو صدی کے عرصہ میں دو تخت خراب و خستہ ہوئے۔"

مگر دراصل ایسا ہے نہیں۔ کیونکہ مسٹر فریزر کے بیان سے اس تخت کا شکست و

کے دو ٹکڑے ہیں۔ ایک تو کاؤچ ہے زمین سے تین فٹ اونچا آٹھ فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا جو چھ پایوں پر قائم ہے۔ اور مور کی چھاتی کی شکل کا بنا ہوا ہے۔ سیڑھیاں بھی لگی ہیں۔ ستارہ جو بڑے بڑے ہیروں سے مرصع کیا گیا ہے ادھر اُدھر گھمایا جا سکتا ہے۔ کرسی کی پشت چھ فٹ اونچی ہے بازو میں پاندان لگا ہوا ہے۔ کرسی اور کاؤچ دونوں خالص سونے سے منڈھے ہوئے ہیں۔ جس پر نہایت اعلٰے پچیکاری کا کام کیا گیا ہے۔ سونے میں ہیرے، لعل، یاقوت اور دیگر جواہر اس نفاست کے ساتھ جڑے گئے ہیں۔ کہ مور کی دم کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہ تخت ہندوستان میں شاہجہاں نے بنوایا تھا۔ ۱۷۲۵ء میں نادرشاہ اسے اٹھا کر ایران لے آیا تھا"

حالانکہ ہر دو سیاحوں نے ایرانی تخت طاؤس کی سیر کی ہے +

اس حقیقت کو مولوی عبداللہ صاحب قریشی بی۔اے نے رسالہ "نیرنگ خیال" لاہور کے عید نمبر بابت سال ۱۹۲۷ء میں ایک تاریخی مقالہ "شاہنشاہ رضا خان شاہ ایران" کے عنوان سے شائع کرتے ہوئے بخوبی بے نقاب کیا ہے۔ آپ نے جہاں بانی دولت پہلویہ کی تاجپوشی کا تذکرہ کیا ہے وہاں تحریر فرمایا ہے :-

تخت طاؤس بھی بجائے خود ایک نفیس چیز ہے مگر وہ سیاحین کے بیان کے بموجب تخت نادری یا اصلی "تخت طاؤس" کا جس کی یہ نقل ہے اور جو عنقا صفت ہے کسی حالت میں بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ موجودہ "تخت طاؤس" میں صرف چند جواہرات اور دو چھوٹے چھوٹے مور ہیں۔ شامیانہ بالکل ہی نہیں۔ اس کی وضع قطع، تراش خراش اور نقش و نگار دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ دراصل اسی مشہور و معروف کنیز کے آرام کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ جس کا نام "طاؤس" تھا اور جس پر بادشاہ بے طرح شیدا تھا

تصحیحات

تاریخ تختِ طاؤس

پروفوں کی درستی کے وقت سہوِ نظر یا ماحول کے تبدیل ہو جانے کے باعث تغیرات مفصلۂ ذیل لازمی ہیں۔ تکلیف تصحیح فرمائیے۔ واویں ''و۔'' تغیرات پر خصوصیت کے ساتھ تبصرہ کناں ہیں +

ناچیز ''مولف''

عنوان	صفحہ	سطر	چھپا ہُوا ہے	ہونا چاہیئے
(۱) فہرست مضامین	الف	(کالم ۱) ۲	تبصرۂ و تعارف کا نمبر صفحہ نہیں ہے	۱ - ۴۰
(۲) فہرست حواشی	۵	'' ۸	(حالات الیشوری پرشاد'' کا نمبر صفحہ وحاشیہ نہیں ہے)	نمبر حاشیہ ۲ + نمبر صفحہ ۱۰۶
(و) رسوم	ح	'' ۱	(''آئین دربار'' کے نمبر ہائے صفحہ و حاشیہ نہیں ہیں)	نمبر حاشیہ ۵ + نمبر صفحہ ۶۲
''	''	'' ۲	(''جشن شمسی'' کے نمبر ہائے صفحہ وحاشیہ نہیں ہیں)	نمبر حاشیہ ۵-۶ + '' ۱۲۷
''	''	(کالم ۲) ۲	(''جشن وزن قمری'' کے نمبر ہائے صفحہ وحاشیہ نہیں ہیں)	'' ۵-۶ + '' ۱۲۷
(ز) تصاویر	''	۳	تصویر نمبر ۲ (تخت طاؤس ''شاہجہاں بر تخت طاؤس'') کو خارج اور اس کی جگہ تصویر نمبر ۳ (تخت طاؤسی) کو تصور فرمائیے +	

غارت ہونا مشکوک ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"جیسا کہ اس کرد کے بیان سے ظاہر ہے۔ اس نے (اصلی) تختِ طاؤس
یا کم از کم دونوں (ساختہ نادر و ساختہ شاہجہاں) میں سے کسی ایک تختِ
طاؤس کی بربادی کو بڑی خوشی سے دیکھا"[۱]

اور مولانا عبد اللہ صاحب قریشی کے بیان سے تو قطعی طور پر ہماری رائے کی تائید ہوتی ہے اور اس تخت کی (ساختہ نادر کی) موجودگی کا ایقان ہو جاتا ہے +

بہادر شاہ ثانی یا اکبر شاہ ثانی کے بنوائے ہوئے تخت کا تو تذکرہ فضول ہی ہے۔ کہ معدوم ہو چکا اور اسم بغیر مسمیٰ محال اور نادر شاہ کے تخت کا ذکر بھی عبث کہ وہ بھی عام طور پر تخت طاؤس کے نام سے مشہور نہیں بلکہ تخت نادری کہلاتا ہے۔ ہاں ہندوستانی، شاہجہانی "تختِ طاؤس" اور فتح علی شاہی ایرانی "تخت طاؤس" کے اسماء میں بھی ان کی حقیقت کی طرح ایک خاص فرق و امتیاز کر دینا چاہیئے تاکہ تاریخ بین اور محقق حضرات مغالطہ سے محفوظ رہیں +

نوٹ نمبر ۱-۲- پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن - ۱۲ +

امتیازِ اسماء

میں نے اکثر اہل قلم حضرات کے یہاں تخت طاؤس اور تخت طاؤسی لکھا ہوا دیکھا ہے اگر قدیم اور قلمی تاریخوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاہجہان نے تختِ طاؤس نام رکھا تھا۔ اس لئے اس تخت کو تو تخت طاؤس ہی کہنا اور لکھنا چاہیئے کہ موافق وضعیت ہے اور ایرانی فتح علی شاہی تخت کو اس حیثیت سے کہ وہ طاؤس خانم کے نام سے منسوب ہے باضافہ "ی" نسبت تخت طاؤسی تحریر کرنا چاہیئے۔ اس طرح لوگوں کو دھوکا بھی نہ ہوگا اور آسانی سے دونوں میں تمیز بھی کی جا سکے گی +

(الحمد للہ بس باقی ہوس)

باہتمام لالہ موتی رام مفید عام پریس فتح چیمبرجی لاہور میں چھپا۔ اور رائے صاحب لالہ موہن لال مینیجنگ پروپرائٹر رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز نے شائع کیا

ہونا چاہئے	چھپا ہُوا ہے	سطر	صفحہ	عنوان
روایتیں بھی گڑھ لی ہیں	روایتیں بھی گھڑ لی ہیں	۱۶	۳۰	نوٹ ۱
مڈیوَل انڈیا	مڈل انڈیا	۲	۳۲	نوٹ ۱
خدیجتہ الزمانی"	خدیجتہ الزبانی	۲۵	۴۳	نوٹ ۱
خاوند	خاندان	۱۰	۵۰	نوٹ ۲
جب	جس	۲۶	۶۳	نوٹ ۵
زخار	ذخار	۱۵	۶۷	شاہجہان....کی سلیم الطبعی
دریا ہے	دربار ہے	۵	۷۷	نوٹ ۶
ان کے چھوٹے بیٹے"	ان کے چھوٹے بیٹا	۲۳	۷۸	نوٹ ۷
جڑدئے	جڑوائے	۱۷	۷۹	تختِ طاؤس کی وضع
اور اسمیں	اور سمیں	۵	۸۰	مہتمم تختِ طاؤس
بظاہر مرتب لغت مذکور کو مندرجہ ذیل	بظاہر مرتب کو لغت مذکور مندرجہ ذیل	۷/۸	۸۲	نوٹ ۴
ایک تصویر دی ہے۔ جو ہماری نظر میں مشکوک ہے	ایک تصویر دی ہے"۔ اور جس کو ہم بھی شروع میں ختم کر آئے ہیں یہ تصویر بھی ہماری نظر میں مشکوک ہے	۲۰/۲۱	۸۵	ایک معاون تصور تصویر
چار ہیں "خدا جانے .. ڈاکٹر صاحب	چار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب	۲۲	؍؍	؍؍

عنوان	صفحہ	سطر	چھپا ہوا ہے	ہونا چاہیے
مقدمہ	۲	۱	ماہرینِ "فنونِ لطیفہ" نے	ماہرینِ "صنعت، حرفت، تعمیرات وغیرہ" نے
"	۲	۷	فنونِ لطیفہ	صنعت و دستکاری
"	۲	۲۱	رواراگ	برواراگ
"	۳	۱۴	ماہرینِ فنِ تعمیر اس امر	ماہرینِ فنِ "تعمیر و دستکاری" اس امر
"	"	"	صنعتِ تعمیر	صنعتِ "تعمیر و زرگری وغیرہ میں"
"	"	۱۵	طرز "تعمیر" کا	طرز کا
"	"	۱۸	ورشاہجہاں	"اور" شاہجہاں
"	۳	۱۹	اور فنِ تعمیر بھی	اور فنِ "تعمیر" وغیرہ" بھی
"	۳	۲۰	متاثر "ہوتا ہوا" دکھائی دیتا ہے"	متاثر "ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں"
"	"	۲۱	عمارات دے رہے ہیں	عمارات "و مصنوعات" دے رہی ہیں
"	۵	۲۱	فنِ جواہر تراشی و نگینہ سازی میں	فنِ جواہر تراشی، نگینہ سازی "و زرگری" میں
"	۷	۱۷	"مظلم" توڑے	مظالم توڑے
"	۸	۷	"فنونِ لطیفہ"	مصنوعات
"	۹	۱/۲	زیورسازی اور خطاطی	زیورسازی "زرگری" و خطاطی
"	"	۴/۵	(اسلامی ہندوستان کے) فنونِ لطیفہ کی ترقی	(اسلامی ہندوستان کی) صنعتی ترقی
"	"	۵	دستکاری	× [لہ]
"	۱۰	۷	۵......+......دوا	۵......+......دوا "ام"
"	۱۶	۲	اٹھائے بغیر استفادہ کر سکیں	اٹھائے "بغیر تصحیح" استفادہ کر سکیں

لہ یعنی قلمزد ہونا چاہیے۔ ۱۲ +

عنوان	صفحہ	سطر	چھپا ہوا ہے	ہونا چاہیے
ایک معاون تصور تصویر	۸۵	۲۳/۲۴	تصویر کہاں سے لی" نہ اس کا تذکرہ اور نہ ہمارے استفسار کے جواب میں موصوف نے بتلایا کہ اس کی صحت یا غلطی کے متعلق ہم کسی خاص فیصلہ تک پہنچے" تاہم تخت طاؤس کے تخیل میں	تصویر کہاں سے لی ہے تاہم "تخت طاؤس" کے تخیل میں
نوٹ ۲	۹۰	۱۵	(۳) ۱۶۴۳ء سے ۱۶۴۹ء میں اس سفر	(۳) ۱۶۴۳ء سے ۱۶۴۹ء تک اس سفر میں
حاشیہ ۲	۹۹	۱۵	سے بھی (جس کو ہم بھی کہیں دے آئے ہیں) اسی کی تائید	سے بھی اسی کی تائید
مصارف	۱۱۲	۱۶	زمانہ قدیم کے سکول	زمانۂ قدیم کے سکوں
تخت طاؤس برجلوس اول	۱۲۴	۶	یہ بیان ویسا ہے پادر ہوا ہے	یہ بیان ویسا ہی پادر ہوا ہے
کوہ نور تعبیہ تھا یا نہیں	۱۴۶	۱۵	عمارت	تعمیر
پارہ ہائے ...... منتقل ہونا	۱۵۷	۱۲	"تخت طاؤس" کا "بانی" دولت	"تخت طاؤس" کا دولت
تخت کے رقیب شہرت	۱۶۰	۱/۲	فرہی چیزے دگرو آماس چیزے دیگرست	فرہی چیزے دگر آماس چیزے دیگر است
تخت ... ساختہ نادر	۱۶۴	۶	اس تخت کی (ساختہ نادر کی)	اس تخت (ساختہ نادر) کی

HISTORY

OF

The " PEACOCK THRONE "

BY

M. A. LATIF KHAN "KUSHTA" QADRI

History — India

Peacock Throne — History

India — Peacock Throne.